شاخ ہری
اور
پیلے پھول

ڈاکٹر عالیہ امام

شاخ ہری اور پیلے پھول

ڈاکٹر عالیہ امام

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

قیمت	طباعت	کتابت
=/۵۰ روپے	دوسرا ایڈیشن تعداد :	جمشید علی طالب
بیرونِ ملک قیمت :	ایک ہزار	
=/٦۵ روپے		

(کتاب ملنے کا پتہ)

کلفٹن کورٹ I - A - چوہدری خلیق الزماں کراچی

فون نمبر : - ۵۳۱۸۴٦

مشہور آفسٹ پریس

ناشر

مکتبہ اظہر

انتساب

”بی بی کے پیار کے نام“

حالاتِ زندگی

قصبہ بارہ بنکی یوپی (ہندوستان)۔ ابتدائی تعلیم
کیمبرج اسکول بھوپال ۔ اعلیٰ تعلیم پی۔ ایچ ۔ڈی لکھنؤ یونیورسٹی (ہندوستان)
پاکستان میں شعبۂ تعلیم سے وابستگی ۔ بعد میں پیکنگ ، برلن اور اصفہان میں
درس وتدریس کے فرائض انجام دیئے ۔

بین الاقوامی ادبی ، تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ روس
جرمنی ، پولینڈ ، سوئٹزرلینڈ اور پیرس وغیرہ ۔ مضامین کے دو مجموعے
" حضرت امیر خسرو " اور " ردائے وفا شائع ہو چکے ہیں ۔ بعض دوسری
کتابیں زیرِ ترتیب ہیں ۔

فہرست

نمبر شمار		صفحات
	پیش لفظ	۷ - ۱۰
۱ -	ابتدائی یادیں	۱۱ - ۵۱
۲ -	پاکستان میں آمد ۔ شعبہ تعلیم سے وابستگی	۵۲ - ۶۴
۳ -	سیاست سے وابستگی	۶۵ - ۱۳۹
۴ -	پاکستانی تہذیب	۱۴۰ - ۱۶۸
	الف - امن	۱۶۹ - ۲۰۴
	ب - موسیقی	۲۰۵ - ۲۱۹
	ج - ادب	۲۲۰ - ۲۲۴
۵ -	شخصیات	
	۱ - حضرت علامہ نیاز فتح پوری	۲۲۶ - ۲۳۷
	۲ - حضرت جوش ملیح آبادی	۲۳۹ - ۲۶۱
	۳ - حضرت فیض احمد فیض	۲۶۲ - ۳۰۲
	۴ - حضرت علامہ رشید ترابی	۳۰۴ - ۳۱۹
	۵ - حضرت راجہ صاحب محمود آباد	۳۲۱ - ۳۳۶

پیش لفظ

قانونِ ارتقا کے تحت نظریہ حیات، اقدار، نظامِ پیداوار کچھ عرصے نمو پذیر رہتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں کائی لگنا شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے پھول جھڑنے لگتے ہیں، باہم مادی تصادمات کے نتیجے میں نئے پیداواری رشتے جنم لیتے ہیں۔ نظریہ و اقدار کی نئی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ گل ریز تبسم فضا میں بکھر جاتا ہے۔ یہ جدلیاتی عمل ہے۔ اسی نظریئے کی روشنی میں معیشت، سیاست، تہذیب اور امن کی قوتوں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دس ابواب پر مشتمل یہ کتاب بادی النظر میں چھوٹے چھوٹے ذاتی تجربات، خوشی اور غم کی داستان نظر آتی ہے لیکن حقیقتاً اس میں یادوں کے پردے پر ہندوستان اور پاکستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تحریکوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

پہلے باب میں تین پہلو قابلِ غور ہیں (۱) متوسط طبقہ کا فکری انداز، علم و تہذیب سے اس دور کی خواتین کی دلچسپیاں (۲) بالائی طبقے کی ذہنی کشمکش اور کھوکھلاپن (۳) ہندوستان کی عوامی تحریکات کے پس منظر میں محنت کش عوام اور مضطرب نوجوانوں کے ذہنی کرب اور عزم کی کہانی جو سرمائے کی زنجیروں کو توڑ کر عوامی انقلاب کا نقیب بننے اور ذاتی مفادات سے بلند ہو کر سب کچھ قربان کرنے کے لئے بے چین ہے۔

دوسرا باب پاکستان میں آمد اور شعبۂ تعلیم سے وابستگی سے متعلق ہے۔ اس میں چند پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے (۱) سرمایہ دارانہ نظامِ تعلیم علم کے ساتھ زنا بالجبر کرتا ہے اور اپنے طبقاتی مفادات کے پیشِ نظر روشنی، فکر کو پابہ زنجیر کرتا ہے۔ (۲) علم کو خانے میں تقسیم کر کے تمام سماجی روابط سے رشتہ کاٹ کر انجینئر و ڈاکٹر کی کھیپ تیار کرتا ہے۔ یہ alienation کے نظریات کے تحت جان بوجھ کر کیا جاتا ہے۔ (۳) سند یافتہ نوجوان سرمائے کی چوکھٹ پر کھڑا ڈگری ہاتھ میں لئے یہ کہتا نظر آتا ہے۔

چھین لو علم کو سرمائے کے دلالوں سے
آج سے اپنا یہی ایک سبق ہے ساتھی

مال بن کر منڈیوں کی حفاظت کیلئے جنگ کا ایندھن بنا رہے ہے۔ لیکن دوسری طرف جمہوری قوتیں جب امن کا نعرہ بلند کرتی ہیں تو وہ اس سیاست کی نشاندہی کرتی ہیں جہاں ایسا نظام قائم ہو جہاں جنگ کا نعرہ جہالت، اور بھوک کے خلاف ہو، ہر آنگن میں چاندنی پھیلے۔ ایسی تمام قوتوں کا جو اس راستے کو طے کرتی آگے بڑھ رہی ہیں خصوصیت کے ساتھ ہندو پاک کے حوالے سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بات کہی گئی ہے کہ سیاست جدا امن کا لفظ نہیں ہے۔ اس لفظ میں انسانی بقا کا سوال پوشیدہ ہے۔

موسیقی سیاست کا یہ تو ہے۔ اس پر علیحدہ باب ہے تہذیبی اقدار کو آگے بڑھانے اور عوام کے ذوق کی تربیت کرنے میں موسیقی اہم کردار ادا کرتی ہے اس پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ موسیقی کی ابتدا کیسے ہوئی، فیثا غورث نے کونسا اسکیل دیا؟ ہندوستان میں اس کی شکل کیسے تبدیل ہوئی؟ اسوقت یہاں کا اسکیل کیا تھا؟ مسلمانوں نے موسیقی کو پروان چڑھانے میں کیا کردار ادا کیا؟ لیکن تنگ نظر مولوی صاحبان نے حکومتوں کے ساتھ جڑ کر اپنے مفادات اور اپنی دکان چمکانے کی خاطر موسیقی کا گلا کسطرح گھونٹ دیا؟ اور اسے علم کا درجہ نہیں دیا جا سکا۔ اس پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

ادب اور سیاست کا رشتہ چولی دامن کا ہے۔ ادب پر مخصوص باب ہے جس میں ادب برائے ادب، ادب برائے جمالیات، ترقی پسند ادب اور جدیت تک کے مختلف دھاروں سے بحث کی گئی ہے۔ ان موضوعات پر بحث کرتے ہوئے لکھا گیا کہ بعض ادیب محض باطن پر ایمان رکھنے اور اپنی ہی انفرادی کیفیوں اور کرب کو لوبنے میں اس قدر محو ہوتے ہیں کہ وہ سماجی اضطراب سے رشتہ جوڑنا بے معنی سمجھتے ہیں اور اسطرح خالص قسم کی انفرادیت کی نذر ہو جاتے ہیں۔

سیاسی نظام فکر کو آگے بڑھانے میں افراد کی حیثیت مسلم ہے اس میں شک نہیں کہ تاریخ چند افراد نہیں بلکہ عوام بناتے ہیں لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ عظیم شخصیات فکر کو سنوارنے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں وہ شخصیات جنہوں نے اپنا رشتہ سورج بنتی قوتوں سے جوڑا اور تاریکی کو کاٹ کر اجالا پھیلا یا وہ مل جائیں تو عظیم تخلیق پیدا ہوتی ہے۔ یہ کتاب پیلے پتوں کے لئے پروپیگنڈا اور ہری شاخوں کیلئے نشان بہار ہے ایک کیلئے زہر ہلاہل اور دوسرے کیلئے امرت ہے جسکا جی چاہے اسے اگل دے اور جس کا جی چاہے اسے پی لے یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

ابتدائی یادیں

یادیں ہرے بھرے درخت کی مانند ہیں۔ کچھ پھول اور پتے جھکڑ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ کچھ میں تازگی و رعنائی باقی رہ جاتی ہے۔ بعض یادیں ایسی ہوتی ہیں، جن میں عزیز و اقارب، دوست و احباب، کو شریک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن بعض چنبیلی کی خوشبو کی طرح وجود میں بس جاتی ہیں، محبوب کے خیال کی مانند، جس سے آپ لاکھ پیچھا چھڑانا چاہئیں، لیکن اس کا خیال ضرور تعاقب کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یادیں سرِ ملے کا الاؤ بھی ہیں اور لو دیتا چراغ بھی۔ تمام یادوں کو رباب کی لے میں سمو دینا مشکل امر ہے ۔ ۔ ۔ انسان جتنا ہی شائستہ ہوتا ہے اتنا ہی وہ یادوں کے برتاؤ میں احتیاط کو ملحوظ رکھتا ہے ۔ ۔ کیونکہ یادیں خزینہ بھی ہیں اور امانت بھی۔

اپنے خاندان کے متعلق جس وقت سوچتی ہوں تو یادوں کی گاگریں چھلک جاتی ہیں۔ امی بارہ بنکی کے تعلقدار میر فراست حسین کی بیٹی تھیں۔ خوش رنگ و خوش اندام و خوش کلام ۔ ۔ ۔ اچھوتی کونپل کی نرمی پورے گھرانے میں اوس کے قطروں کی طرح دمکتی ہوئی۔ زندگی توشہ بند دستر خوان تھی ۔ انواع و اقسام کی چیزیں چنی ہوئیں، لہریئے دوپٹے، دھانی چوڑیاں ہاتھوں میں گجرے، خوشبو میں بسی سولہ سنگھار کئے ہوئے بیبیاں تخت نشین، چاروں طرف خادمائیں ہر قسم کے تہواروں سے لگاؤ۔ مجلس و محفل کی شیدائی، نفاست، متانت، سنجیدگی، بردباری، حلم، مہمان نوازی کے سب رسیا، مزاح، مذاق، دل لگی، شوخی سے سب کو بیر۔

نانا میاں فارسی کے عالم تھے۔ ان کی تعلیم کے نتیجے میں نانی، ماں، خالائیں سب عجمی تہذیب میں بسی ہوئی تھیں۔ فارسی زبان و ادب کے سب شناسا ۔ ۔ ۔

افراط و تفریط سے سختی سے پرہیز۔ ۔ ۔ بس ہر آن میانہ روی ۔ ذرا کسی نے قدم آگے بڑھایا، نانی اور خالہ کی طرف سے فارسی زبان میں پند و نصائح کا باب کھل گیا۔ ۔ ۔ "ہنسی ٹھٹھے" کو قابو میں کرو۔ ۔ ۔ "دل لگی" اور مذاق" سے انسان کا وقار گرتا ہے۔ ۔ ۔ نئے لوگوں کے سامنے دست بستہ بیٹھو۔ ۔ ۔ سنو۔ "در محفلے کہ تازہ در آئی گرفتہ باش" ۔ "اول بسباغ غنچہ گرہ بر زمیں زند"۔ اور اگر کسی بچے یا بڑے نے غلطی سے ذرا سی گستاخی کی تو اسے فوراً غرور، اور تکبر پر محمول کیا گیا۔ پھر فارسی میں بے نقط کی ڈانٹیں شروع ہو گئیں ۔ ۔ ۔ تکبر مکن زینہار اے پسر۔ ۔ ۔ تکبر عزازیل را خوار کرد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

غرضیکہ ہمارا ننہال تو بس شیشے کا گھر تھا۔ مجال تھی کہ کہیں ۔ کسی جگہ گرد جم جائے۔

ددھیال کی زمین البتہ بہت ہی زرخیز تھی ۔ ۔ ۔ عرب، عجم، ہند سب ہی دھارے اسے سیراب کر رہے تھے ۔ ۹ چچا اور تین پھوپھیاں اور ان کی اولاد ۔ ۔ سب وسیع المشرب، من موجی، ہنس مکھ ۔ ۔ ۔ علم کے جویا، دشت لطیف، کے دلدادہ ، دھمال کے شوقین، دوستوں کے دوست ، دل آرام، پیر فدا ۔ جاں سپاری ۔ جاں نثاری میں یکتا، بزرگی و خوردگی کے تناسا ، گرویدگی و نجیب الطرفین ہونے پر نازاں ۔ ۔ ۔ ظالم سے دل تنگ، مظلوم کے ساتھی ۔ بدی سے زیادہ نیکی میں تیز ۔ ۔ ۔ خاندان پرست ۔ ۔ ۔ منشور یہ کہ " کنبے کی عزت کرو کیونکہ وہ تمہارا بازو ہے ۔ ۔ ۔ جس سے اڑتے ہو ۔ ۔ ۔ بنیاد ہے جس پر ٹھہرتے ہو ۔ ۔ ۔ ہاتھ ہے جس سے لڑتے ہو ۔ ۔ ۔ " چنانچہ اس منشور کی اگر ذرا کسی نے خلاف ورزی کی ۔ ۔ ۔ اس پر حقہ پانی بند ۔ ۔ ۔ بڑے چچا سید محمد تقی رئیس مصطفےٰ آباد تھے ۔ اس لیے وطن کی ادبی، ثقافتی، علمی، و تہذیبی زندگی ان کے گرد طواف کرتی ۔

" ہر سال میلہ ٹھیلہ والوں کا " اسی طرز پر ہر سال مصطفےٰ آباد میں محرم منایا جاتا سارا کنبہ اکٹھا ہوتا ۔ ۔ ۔ عورتوں مردوں کی " ملی جلی" مجلسیں ہوتیں ، باپ، چچا، مرثیہ پڑھتے ، تقریریں کرتے ، اس کے علاوہ گھر کے ہر لڑکے اور لڑکی کا منبر پر بیٹھنا فرض تھا ۔

مختلف موضوعات دیئے جاتے ۔ تقریریں ہوتیں ، انعامات تقسیم ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ مرثیے کی مخصوص مجالس باہر " دیوان خانے " میں ہوتیں ۔ ۔ ۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ امی کے ماموں میر مصحف حسین تعلقدار مصطفےٰ آباد کے فرزند بلند اقبال علامہ رضی صاحب زیب منبر ہونے تحت اللفظ مرثیے پڑھتے ، بے بہا جوہر دکھاتے ۔ ان کے علاوہ سید محمد عسکری یعنی میرے والد جنہیں مرثیہ پڑھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا وہ زیب منبر ہوتے اور بلوریں ذوق سماعت سے داد وصول کرتے ۔ چچا صادق اور للن ماموں بھی مرثیے کے مختلف پہلو سامنے لاتے کلاسیکی انداز میں بندھے ہوئے سوز و سلام " بھتری گاؤں " کے تعلقدار متین میاں ، ببو میاں اور مبین میاں پیش کرتے ۔ سخن فہم و سخن سنج مجمع سے داد لیتے ۔ ۔ ۔ ہر طرف عطر بیز ہوائیں چلتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مصطفےٰ آباد یوں کہنے کو تو چھوٹی سی بستی ہے لیکن بہت مردم خیز علاقہ ہے ۔ اس بستی کا نام اگر دانشکدہ رکھا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا ۔

دادا میاں کو ورثے میں یوں تو جائیداد اور محل ملی تھی لیکن جیب ہمیشہ خالی ہی رہتی ، اسی بنا پر روزی روزگار کے سلسلے میں باپ چچا کو در بدر کی خاک چھاننا پڑی سخت زندگی گذارنے کے باوجود ایک بات جو انتہائی عجیب تھی وہ تھا سب کو علم سے بے پناہ لگاؤ ۔ لکھنؤ میں کرامت حسین انتہائی عالم و فاضل تھے ۔ ان کی ہمہ دانی کا چرچا دور دور تھا ۔ میرے والد نے کسی طرح ان تک رسائی حاصل کی ، وقت کی کمی کے سبب طے یہ پایا چونکہ کرامت صاحب ۲ بجے رات کو وقت دیتے ہیں اگر علم کی پیاس ہے تو تشریف لائیے ۔ سواری ہوتی نہ جیب خالی ہو یا بھری عسکری صاحب دانش گاہ میں سب سے پہلے پہنچتے اور بعد تک وہاں نظر آتے ۔ عربی کی تعلیم شہنشاہ حسین سے حاصل کی جو اس وقت کے جید عالم تھے ۔

روزی روٹی ، روزگار نے کشاں کشاں ہمارے ابا کو بھوپال کی سرزمین پہ پہنچا دیا ۔ ذہانت اور حسن دونوں ہی ان کی ذات میں جمع تھیں ۔ اس لیے آن کی آن میں بھوپال کی سیاسی ، سماجی اور تہذیبی فضا پہ چھا گئے ۔ پیشے کے لحاظ سے تو ایڈوکیٹ تھے

جناب سید محمد عسکری صاحب کے گھر پر لی گئی ایک تصویر کا منظر جس میں حضرت جوش ملیح آبادی
ممتاز شاعر جاں نثار اختر اور مجروح سلطان پوری تشریف فرما ہیں ،

لیکن دوستی زیادہ تر ادیبوں اور دانشوروں ہی سے تھی۔

ہمارا گھر تو بس جوہی کا ہرا بھرا باغ تھا۔ ہم پانچ بہن بھائیوں کے علاوہ نذیر میاں (چھوٹے چچا)، چھوٹی پھوپھی اور اکثر عطا میاں (بڑے چچا) ان کے بچے سب چھائے بچھائے رہتے۔ چھوٹی پھوپھی کے بیٹے سید میاں انگریزی لباس، انگریزی کھانے اور انگریزی زبان کے دلدادہ تھے۔ اس لئے ان کے حصے میں انگریزی کی بہار رہتی۔ بھائی صاحب اور آپا رسولن بائی، جانکی بائی اور فیاض خاں کو سننے سے کسی گھڑی نہ تھکتے۔ منجھلی پھوپھی کے بیٹے میاں بھیا اور بھابھی جان علم و ادب پر جان چھڑکتے، شعر و شاعری کی پوجا کرتے۔

ہم ہر جگہ ہر رنگ کا مزہ چکھتے لیکن تہذیبی سرحد کو پار کرنے پر خوب کھلے بھی جاتے، خانہ داری کے فرائض، اور دوسری تمام تر ذمہ داریاں امی کے علاوہ باجی جان اور شمشن باجی کے حوالے تھیں کام نہ کرنے پر ہمیں اور بی بی اکثر ڈانٹ کھاتے۔ بی بی تو گھر کی سجاوٹ میں پیش پیش رہتیں لیکن ہمارا ہر مقام پر استغنے با حسرت و یاس رہتا ... غرض یہ کہ گھر کی زندگی رنگ برنگے دھاگوں میں گندھی ہوئی تھی۔

ابا ادیب تھے اس لئے ہر ہفتہ ہر واڑے عجیب و غریب سماں آنکھوں کے سامنے سجتا۔ بالائی کمرے میں لوبان کی بتی اٹھتی۔ ہاروں اور پھولوں سے کمرہ سجایا جاتا۔ جام پہ جام ٹکراتے۔ قہقہے سارے گھر کو گلزار بنا دیتے۔ سر راس مسعود، سر سید جان خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عابد حسین، علامہ نیاز فتح پوری۔ حضرت جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی ارشد تھانوی اور شوکت تھانوی۔ غرض یہ کہ جو بھی ادیب و شاعر بھوپال سے گذرتا ہمارے گھر پہ اس کی پذیرائی ہوتی۔ علمی مباحث ہوتے۔ شعر و شاعری ہوتی۔ مذہبی گفتگو ہوتی۔ پھر نقرئی قہقہے بلند ہوتے، کھانوں کی مہک پھیلتی ... پوری فضا گنگناتی ... لیکن "خاندانی شریعت" کے مطابق لڑکیوں کا اس کمرے میں قدم رکھنا ممنوع تھا۔ ذرا ہم نے جرأت کا مظاہرہ کیا اور کنٹرول لائن کو پار کیا تو بس چاروں طرف آڑی ترچھی بوچھار ہمارا خیر مقدم کرتی، دل کے سارے ارمان دل ہی

دل ہی میں رہ جاتے۔ ایک دو دن نہیں یہ کہانی ہر ہفتے دہرائی جاتی لیکن ہمیں جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ ان حالات سے نمٹنے کے لئے ہمارے پاس تین حربے تھے۔ پہلے ابا کی لائبریری کو تتر بتر کرنا اگر وہ حربہ کارگر نہ ہوا تو پھر اٹواٹی کھٹواٹی لے کر لیٹ جانا، ورنہ بھوک ہڑتال۔ یہ حربہ خاصا کارگر ثابت ہوتا۔ سارے بہن بھائی کھانا کھلانے کے لئے منانے آتے لیکن کسی کی نہ چلتی۔ اگر بات چلتی تو صرف بی بی کی۔۔ بی بی تو امی کی کاربن کاپی تھی۔ بی بی سے لڑنے کے لئے ہم ہمیشہ پانی پت کا میدان تیار کرتے لیکن ادھر سے صرف عدم تشدد کا ہی ہتھیار ہوتا اور ہم سپر ڈال دیتے۔ امی کی پٹائی کے بعد جب ہماری آنکھوں کے کنارے بھیگ جاتے تو بی بی اپنے ریشم کے پلو سے آنسو پونچھتی کہانی کی رس بھری بوندیں ٹپکاتی اور ہمارا سنجوگ انگور کی بیل کی طرح پھیلتا اور بڑھتا رہتا۔

ہمارے کنبے کی پور پور میں کلاسیکی موسیقی کی انگوٹھیاں جڑی ہوئی تھیں اسی لئے گھر میں ہر سنیچر وار طبلے پر ٹکوریں پڑتیں۔ سارنگی کے تار کانپتے، ستار پہ جھالا بجتا۔ خورشید زیدی کی پائلیں کھنکتیں، غالب و حافظ کی غزلیں چھڑتیں، چچا، ماموں، خالہ پھوپھی سب ہی جھوم جھوم کر گلباری کرتے۔ فرش پہ محبت کے موتی برستے، کرشن کنھیا کی مرلی بجتی امی اور ابا کے درمیان کلاسیکی موسیقی قدر مشترک تھی۔ امی کو ابا سے زیادہ موسیقی پہ عبور تھا۔ موسیقی کے ذریعے کنبے کی لڑکیوں کی تربیت بھی مقصود تھی، ان کا خیال تھا کہ طبیعت میں آبگینے کی چمک دمک اور فکر میں توازن بغیر موسیقی سے لگاوٹ کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ میری بڑی بہن عطیہ فاطمہ نقوی اور دوسری بہن شبیر بانو تعلیم کے ساتھ ساتھ موسیقی کی بھی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ بھائی جان بھی اس عہد کے استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کئے ہوئے تھے۔ محفل میں جب چاء چلتی گپیں ہوتیں تو ہم اور بی بی خانہ پری کرتے لہک لہک کر گاتے لیکن داد کا فقدان ہوتا نہ ہمیں پیسے ملتے نہ روپے بس رو دھو کر بیٹھ جاتے۔

گھر کا تیسرا معمول انگریزی عنوان کا تھا۔ مسز رعینک نہ صرف انگریزی پڑھاتیں بلکہ انگریزی کھانے، انگریزی گانے اور انگریزی رقص کا بھی سبق دیتیں۔ الفاظ کے

ٹکڑے کر کے سمجھاتیں، آواز سے تصویریں بناتیں۔ کبھی کبھی غصے میں آکر جھڑکیاں بھی لگاتیں، باجی جان کہتیں ہائے کیا عورت ہے جتنی انگریزی ہم لوگ ایک مہینے میں بولتے یہ تو ایک گھنٹے میں بول کر چلی گئی۔ ان کے غصے پر مختلف انداز سے comments کئے جاتے۔

وقت دبے پاؤں گذرنے لگا۔ خرد کے انکھوے پھوٹے، علم کی پیاس بڑھی، تعلیم نے فکر کو لو دی، نرم ہوا نے ذہن کو آسودہ کیا۔ روح کے بن میں پھوار پڑنے لگی... کالج سے آتے ہی میں اور بی بی ابا کی لائبریری پر قبضہ کر لیتے، امی ہم لوگوں کے لئے کھانا بھیج دیتیں۔ کتابوں کی الماریوں کے پٹ کھل جاتے۔ گبن، جسٹس امیر علی، مولانا روم فردوسی، حافظ، غرضیکہ علم کے ہر منارے کے سامنے ہم دونوں سر نیاز خم کرتے۔ .."تنقید" "تحقیق" "تجربے" کے باب کھلتے... اور دونوں ایک دوسرے پر اپنی "افلاطونیت" کا سکہ جمانے میں مصروف رہتے۔

بھائی جان پڑھنے کے لئے باہر بھیج دیئے گئے تھے۔ چھٹیوں میں گھر کیا آتے... سونے آنگن پر گھٹا جھوم کر برستی... ہر شخص کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھتا، دلوں میں شادیانے بجتے... گلپوش باتیں ہوتیں پھول مہکتے..... سال بھر میں جتنے پیسے روپے جمع کرتی وہ سب ان کے سامنے ڈال دیتی... صرف یہی نہیں احتیاط سے رکھی ہوئی کھانے پینے کی چیزیں بھی انہیں دیتی۔ بعض چیزیں تو گل سڑ جاتیں... اس لئے پھینک دی جاتیں۔ گھر قہقہہ زار بن جاتا۔

بھائی جان کے آنے سے اور باتوں کے علاوہ گھر بالکل کتب خانہ بن جاتا۔ اسٹیڈی سرکل قائم ہوتا، ترگنیف، ٹالسٹائی۔ چیخوف، گورکی، غرضیکہ دنیا کے تمام عظیم المرتبت ادیبوں سے ہماری شناسائی بھائی جان ہی کے ذریعے ہوئی۔ ہمارے کالج کے دوست بھی اسٹیڈی سرکل میں بڑے شوق سے شرکت کرتے، شاکر علی خاں، ہوی داجی مسعود علی خاں، بال کرشن شرما غرضیکہ اس سرکل کا پاٹ خاصا چوڑا ہو گیا تھا۔ ممتاز شاعر

جاں نثار اختر اپنی دھیمی دنرم مسکراہٹ اور بے نیازانہ ادائیں لئے 'اسٹڈی سرکل' میں ضرور شریک ہوتے ۔ ہماری مایۂ ناز استاد صفیہ اختر بھی ہمیشہ موجود ہوتیں ۔ صفیہ آپا کی شخصیت بہت منظم اور متحرک تھی ۔ ندرتِ فکر اور رعنائی خیال ان کا حصہ تھی ۔ ان کی تحریر میں تازگی حرارت ، اور اثر ، محض تجربوں کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یہ صلاحیت اعلیٰ مقصد ، الفاظ پر غیر معمولی قدرت اور فنی روایات کے تخلیقی استعمال سے پیدا ہوتی تھی ۔ اس لئے ان کے ہر انداز میں سحر کاری تھی ۔ ان کی شخصیت کا خمیر محبت سے اٹھا تھا ۔ محبت ننھی ننھی جانوں سے ۔ محبت طلباء سے ، محبت ملک وقوم سے ، محبت اعلیٰ نظریہ حیات سے اور اسے تکمیل تک پہنچانے سے . . .

بھوپال کا ریاستی نظام انحطاط پذیر تھا ۔ ۔ ۔ تبدیلی کے عمل سے خوف زدہ گھٹن اس کا مقدر ، جامد فکر اس کا چلن ، بیماری و جہالت ومحرومی اس کی فصل ۔ ۔ ۔ جس کے نتیجے میں سیاسی ، معاشی اور تہذیبی سطح پر عوامی تحریک زور پکڑ چکی تھی ، طلباء بھی اپنے حقوق کے لئے میدان میں اتر آئے تھے ۔ دانش گاہوں سے " انقلاب زندہ باد" کے نعرے بلند ہو رہے تھے ۔ ۔ ۔ شاکر علی خاں عوامی رہنما تھے ۔ ان کی قیادت میں آزادی کی تحریک میں جان پیدا ہوئی تھی . . . . اجلا ذہن اور سونا بدن انسان اپنے آئینی حقوق کے لیے آہنی دھمک کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ادیب و شاعر بھی داخلیت پسندی کے حصار کو توڑ کر سماجی جد وجہد سے رشتہ استوار کر رہے تھے ۔ ۔ ۔ چار سو بصیرت کے چشمے پھوٹ رہے تھے ۔ ۔ ۔ انسانوں کے اجتماعی مفادات ، اعلیٰ اقدارِ حیات کے تحفظ اور ریاست کے کرم خوردہ نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے صرف مزدور ، کسان ۔ طلباء ہی کو نہیں بلکہ ادیبوں اور دانشوروں کو بھی میدان عمل میں اترنا ہے یہ بات ہر سطح پر محسوس کی جارہی تھی ۔

عوامی تحریک آگے بڑھ رہی تھی۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا جیسے پرانے نظام کو فوراً ہی ڈھا کر نیا نظام حیات تخلیق ہو جائے گا۔ ہم اور بی بی بھی جلوس میں جاتے۔ عورتوں کے جلسوں میں تقریریں کرتے۔ چٹکی چٹکی آٹا جمع کرتے مزدوروں کے لئے پیسے جمع کرتے، کالج میں بھی ہم لوگوں نے پرنسپل سے لڑائی مول لے کر طلبا اور مزدوروں کے لئے بڑے بڑے جلسے کئے "تعلیم کو میٹرک تک مفت کرو" "مزدوروں کی چھانٹی بند کرو" ہم لوگ پرچم لے کر نکلتے۔ حکومت جب لاٹھی چارج کرتی تو سب کے ساتھ ہماری اور بی بی کی بھی ٹھکائی ہوتی۔ ہماری ایک دوست تھی، شانتی مزدور رہنما۔ ایسی صورت میں ہم لوگ اس کے گھر چلے جاتے، ہلدی چونا لگوایا جاتا۔ گھر پہنچتے ہی سوالات کی بوچھار ہمارا خیر مقدم کرتی۔ اتنی دیر کیسے ہوئی؟ اور یہ ہاتھ میں کیا بندھا ہے؟ بی بی معاملہ فہم تھیں، اشارہ کرتیں، ہم خیریت اسی میں جانتے کہ بغیر جواب دیئے کمرے میں گھس جائیں اور اسی طرح وہیں دبک کر سو جائیں۔

گھر کی زندگی ندی کی طرح گنگناتی، گاتی، مسکراتی بہہ رہی تھی۔ نہ کہیں ٹکراؤ نہ چھینا جھپٹی۔ اچانک بم کا دھماکہ ہوا۔ چھت میں شگاف پڑے زمین چٹخنے لگی۔ ہوا میں ریزے بکھرنے لگے۔ سارا گھر سہما ہوا تھا۔ غصے کے شعلے آسمان پر لپک رہے تھے۔ ابا اخبار ہاتھ میں لئے امی پر برس رہے تھے۔ دیکھ لیا آپ نے اپنے صاحبزادے کو... ابھی تک طالب علموں کے رہنما تھے۔ اندرا گاندھی کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ خیر یہ بھی غنیمت ہے لیکن اب دیکھئے صاحبزادے جیل میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ سوشلزم انقلاب۔ لاحول ولا قوۃ... جسٹس سلام الدین، بالو میاں، راس مسعود کون ہے، جو اس کی لیاقت کا معترف نہیں۔ کل ہی سلام الدین صاحب کہہ رہے تھے۔ تمہارا بیٹا حسن سیرت و صورت دونوں رکھتا ہے۔ تعلیم ختم ہوتے ہی میرے پاس لاؤ میں اسے فوراً جج بنا دوں گا... بھوک ہڑتال فرما رہے ہیں کیوں مزدوروں اور کسانوں کا درد لاحق ہو گیا ہے۔ صادق (ایڈوکیٹ) بھائی

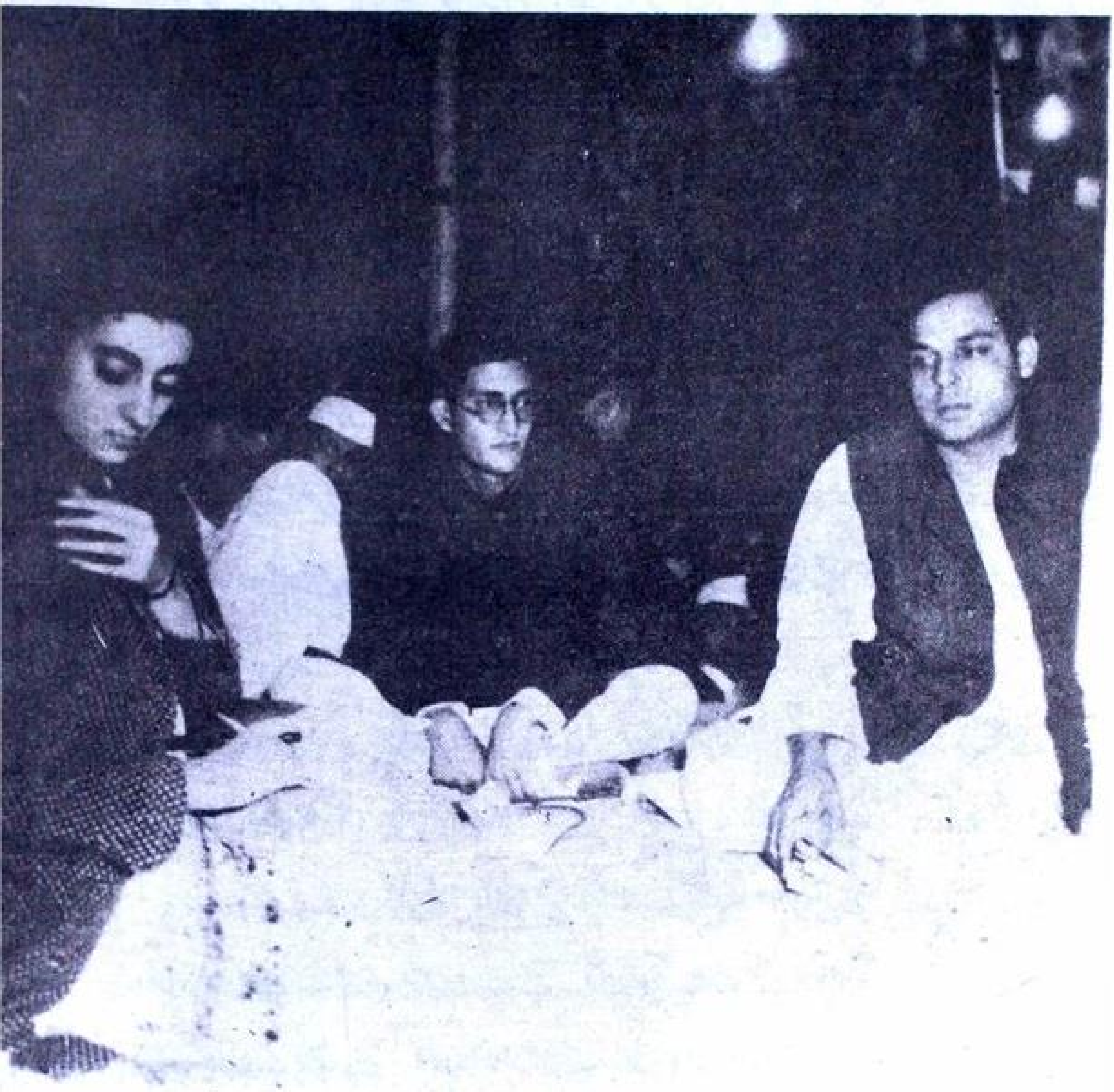

ہندوستان کی وزیر اعظم آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی ۔ سید محمد مہدی اور چترویدی زمانۂ طالب علمی میں ۔

نے بتایا ہے ۔ مورن برت نہیں توڑیں گے اُس وقت تک جب تک تمام ساتھی" چھوڑ نہیں دیئے جاتے ۔ سیاسی قیدیوں کو چھڑانا ان کی ذمہ داری ہے نا ؟ حکومت وحشی ہے خوفناک قسم کی اذیتیں دے رہی ہے .... لاحول ولاقوۃ .. .. لیکن .. . سجاد ظہیر بھی تو ساتھ ہیں اور اندرا گاندھی بھی .... ان کی حمایت ... احمق ... جب کچھ سمجھتی نہیں تو بولتی کیوں ہے ؟ ... بڑی بہن علیہ فاطمہ ڈانٹ کی زد پر تھیں ۔ جو بھی منہ کھولتا منہ کی کھاتا ۔ اب یہی وقت ہے صاحب ۔ اگر تم ذرا سا کہہ دو تو معافی مانگ کر باہر آسکتا ہے ۔ تمہاری بات سب سے زیادہ مانتا ہے ۔ صادق اور تقی بھیا کی بھی یہی رائے ہے "تمہاری خاموشی بھی عجیب ہے" . . . دس نہیں دس ہزار مرتبہ کہہ چکی ہوں اور پھر کہتی ہوں میرا بیٹا معافی نہیں مانگے گا میں اسے معافی مانگنے پر مجبور نہیں کروں گی . . . . . .

حکومت کے سامنے وہ سر نہیں جھکائے گا . . . اچھا تو پھر سڑنے دو ، سڑنے کی کیا بات ہے ... "علم و دانش" کا ایڈیٹر ہے 'پیام' کا ایڈیٹر ہے ۔ لاحول ولاقوۃ یہ چیتھڑے ہیں یا اخبار و رسالے ، مظلوموں کی حمایت میں انقلاب لانا کوئی گناہ و جرم نہیں ہے ... یہ کون کہتا ہے صاحب لیکن جب انقلاب آجائے تو اس میں شامل ہو جائیں .. ابھی سے کیا ضرورت ہے . . نانی اور خالہ الگ بیٹھی ٹسوے بہا رہی تھیں . . . تعلقدار کا نواسا ناز و نعم سے پلا . . کبھی گرمی میں خس کی ٹٹی سے باہر قدم نہیں نکالا . . . اور آج دھوپ میں . . . ہائے مولا کیا زمانہ پلٹا ہے . . . کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا . . .

ابا بالائی سطح پر تار خط ٹیلی فون کی لائن لگائے ہوئے تھے ، چچا ابا اور بڑے چچا اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر بھائی جان کو جیل سے چھڑانے کی ترکیبیں لڑا رہے تھے . . .

دوسری طرف انقلاب زندہ باد کی آوازیں گونج رہی تھیں ۔ طلباء و دانشور اور مزدور تحریک کا پاٹ چوڑے سے چوڑا تر ہو رہا تھا " مزدوروں کی چھانٹی ختم کرو " "طلباء پر ظلم ختم کرو" "ہمارے لیڈروں کو رہا کرو" نعرے بلند ہو رہے تھے ۔ ہر شخص جرأت

کی کہانی اور ہر نوجوان استقامت کی معجزہ سامانی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ لاٹھی چارج فائرنگ، آنسو گیس، روزانہ کا معمول تھا "بڑھتا ہے اور ذوق گناہ یاں سزا کے بعد" کی منزل تھی۔

انقلابی شعلوں سے ہمارا گھر بھی دہک رہا تھا۔ تین محاذ باقاعدگی سے قائم کیے گئے تھے۔ پہلے محاذ کے ساتھیوں کا کام پوسٹر لکھنا، انہیں چسپاں کرانا، جھنڈیاں تیار کر کے پارٹی آفس پہنچانا، جیل میں قیدیوں کے لئے حکومت سے اجازت لے کر ضروریات کی چیزیں پہنچانا تھا۔ اس گروپ کی قیادت محمد نصیر، نرجس خاتون اور شبیر بانو، سعیدہ بیگم، اور فضہ بی بی کر رہی تھیں۔ دوسرے محاذ کے لیڈر سید حیدر اور سید محمد سعید تھے۔ پہلے صاحب انگریزی اور سیاست کے پروفیسر اور دوسرے بہت ممتاز وکیل تھے جن کا اب بہت اعلیٰ مقام ہے۔

سیاست میں ہمیں مختلف انقلابات کی تاریخ، ۱۹۱۷ء کے شوشلسٹ انقلاب کے اثرات، قومی جد وجہد کے مختلف پہلو سمجھائے جاتے . . . . اور یہ بتایا جاتا کہ سیاست سے جھجک اور حجاب ختم ہونا ضروری ہے۔ زندگی کی ہر سطح پر سیاست ہے، اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس کا سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہے تو وہ بھی سیاست کرتا ہے . . .

سیاست دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک بالائی طبقے کی سیاست جو بورژوا طبقے یعنی سول بیوروکریسی اور فوجی بیوروکریسی، زمینداروں، سرمایہ داروں اور سامراج کے ایجنٹوں کے ذریعے کی جاتی ہے ہے ایسی حکومت سامراج کی بہی خواہ اور پروردہ ہوتی ہے۔ اس کے سامنے دو اصول ہوتے ہیں ایک عوام کی قوت احساس کو سلب کرنا، دوسرا عوام سے جرأت اظہار چھین لینا، عوام کی قوت احساس کو اس طرح سلب کیا جاتا ہے کہ انہیں عہدے، امارات، سفارت اور توڑے نذر کئے جاتے ہیں۔ جتنا ہی عہدہ بڑا ہوتا ہے اتنی ہی گردن جھکتی چلی جاتی ہے اور ایسے لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "آپ ہی ظل اللہ ہیں" آپ ہی امیر المومنین ہیں۔ آپ عوام کے لئے برے ہوں تو ہوں ہمارے لئے تو اچھے ہیں۔ اس لئے آپ کی حکومت کو ہر قیمت پر باقی رکھنا ہمارا فرض ہے

دوسرے عوام سے جرأت اظہار اس طرح چھینی جاتی کہ وہ اپنے معاشی حقوق کے لیے جب آواز اٹھاتے ہیں تو ان کی فکر پہ پہرہ لگا دیا جاتا ہے۔ ان کے خیالات پا بہ زنجیر کر دیئے جاتے ہیں۔ حقوق کی لے اگر پھر بھی تیز ہوتی ہے تو سروں پہ گرم سلاخوں کے شامیانے تان دیئے جاتے ہیں۔ "خطرے کی گھنٹی توجہ ہٹانے کے لئے بجائی جاتی ہے" "فلاں فلاں ملک سے "خطرہ" ہے" "ہندوازم خطرے میں ہے" اسلام خطرے میں ہے" "ملک کا نظریہ اور سالمیت خطرے میں ہے" اور پھر کوڑے، درے، پھانسی . . . جنگ ایسے نظام کی تقدیر ہے۔ اپنے معاشی تضادات کے بھنور سے نکلنے کے لئے خون کی ہولی کھیلنا اس کے لئے لازم ہے۔

دوسری سیاست محنت کش کی ہوتی ہے۔ جو ملک و قوم کو جنگ، نفرت، جہل اور زرگری کی بجائے امن، اخوت، محبت اور شانتی کی طرف لے جاتی ہے اس سیاست پہ یقین رکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ محض فرد کی تبدیلی یا ایک سیاسی لیڈر کی جگہ دوسرے کی آمد، انقلاب نہیں ہے، معاشی نظام کی تبدیلی ہی سے سیاست اور تہذیب بدلتی ہے۔ پرولتاری طبقہ یا محنت کش طبقہ جس وقت تک کہ ریاست کی مشینری پہ قابض نہیں ہوتا اس وقت تک عوامی انقلاب مکمل نہیں ہوتا، اور تین طرف اندھیرے اور ایک طرف اجالے کی جگہ چاروں طرف اجالے کا نظام نہیں لے سکتا۔

کلچرل فرنٹ کی ذمہ داری پروفیسر علی رضا حسینی اور محمد عابد نقوی کے سپرد تھی۔ ان دونوں کی نگاہ سیاست اور معاشیات کی تاریخ پہ بہت گہری اور عالمی ادب پہ بہت وسیع ہے۔ محمد عابد نقوی ہندوستان کے بہت نمایاں اور اہم مزدور لیڈر اور دانشور ہیں غرضیکہ ہر شام مختلف مکتبۂ فکر کے لوگ اور سارے بہن بھائی جمع ہوتے، کلچر اور تہذیب پہ بحث و مباحثہ ہوتا۔ روایت سے کہاں تک بغاوت جائز ہے۔ اس پہ تنقیدی نگاہ ڈالی جاتی کلچر پہ لینن کے نظریات سمجھاتے ہوئے جو بات کہی گئی تھی وہ اب تک ذہن میں محفوظ ہے۔ "ایک ایسے سماج میں جو طبقات میں تقسیم ہو ایک کلچر نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے . . . .

... سرمایہ دارانہ طبقاتی سماج ہر قومی کلچر کو دو کلچر میں تقسیم کر دیتا ہے . . . ایک کلچر مزدور طبقہ اور ترقی پسند ادیب، سرمائے کے جوئے تلے پیدا کر دیتے ہیں، دوسرا کلچر استحصالی طبقہ کا ہوتا ہے۔ پہلا کلچر نئے کلچر کا بیج بوتا ہے۔ کیونکہ حکمران طبقہ اس کی ترقی کے امکانات محدود کر دیتا ہے۔ اس لئے دوسرا یعنی بورژوا کلچر اس پر چھا جاتا ہے۔ مستقبل جمہوری اور سوشلسٹ کلچر کا ہے۔ یہ قومی کلچر کی بہترین روایت کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔

آفتاب کی کرنیں بہت دور تک اپنی کرنوں کا جال بچھا رہی تھیں۔ ہمارے وطن مصطفٰے آباد میں جہاں سارا کنبہ محرم میں اعزاداری کے لئے اکٹھا ہوتا تھا۔ اور عزاداری پر ایک کثیر رقم خرچ کی جاتی تھی۔ وہاں بھی نقشہ بدل گیا تھا۔ انجمن اصغریہ، انجمن حقوق نسواں وغیرہ قائم ہوئیں۔ مکتب اور مدرسے بنائے گئے۔ غلام حسین نقوی ایڈوکیٹ اور سید وصی نقوی (وزیر تعلیم یو پی) ان انجمنوں کے سرپرست بنے۔ عزاداری کی رقم ان اداروں پر خرچ کی جانے لگی۔ مجالس دلیوان خانے سے نکل کر عوام کے جلسوں تک پہنچ گئی ''حسین ڈے'' کے ذریعے انقلاب کا پیغام دیا جانے لگا۔ سید محمد تقی، سید محمد عسکری اور سید محمد صادق اور سید رضی صاحب قبلہ مراثی انیس کے ساتھ ان موضوعات پر بھی گفتگو کرنے لگے جو اعلیٰ اقدار اور انقلابی نظام حیات کی بشارت دیتی ہے۔ جوش کو پڑھنا محمد عقیل، محمد ہاشم اور محمد زاہد نے اپنے ذمے لے لیا۔ پردنیر، نجم الدین نقوی نے پہلی مرتبہ منبر سے اقبال کو متعارف کرایا۔ اور اس کی فکر کے روشن پہلو اجاگر کئے۔ اس طرح ہر طرف دبستان کھل گیا۔

کالج بلکہ اسکول ہی سے ہم لوگ محنت کشوں کی تحریک سے وابستہ رہے کہ اچانک پاکستان سے بلاوا آیا۔ اس لئے کہ اس وقت پاکستان میں جمہوری قوتیں زور پکڑ رہی تھیں، ظلم و ستم کا تخت سوا نیزہ تھا، اساتذہ، طلبار میدان میں اتر چکے تھے جو طوق و سلاسل میں مسلسل آزادی کی لے تیز کر رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سندھ میڈیکل کالج یونین کے صدر ڈاکٹر سرور نے قیادت سنبھال لی تھی انڈو پاک طلبار کانفرنس

کے انعقاد کا اعلان ہوا، ہندوستان سے ڈیلیگیشن آیا۔ ہم بھی شامل تھے۔ "مانند جام نے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ چونکہ وقت سے پہلے پہنچے تھے۔ اس لئے سب سے پہلے علامہ رشید ترابی جو میرے والد کے بہت قریبی دوست تھے۔ ان کے یہاں قیام ہوا۔ علامہ رشید ترابی معانی کے پروردگار اور امام آیات و آثار تھے۔ بہت ہی خوبصورت گفتگو سننے کو ملتی۔ منبر پر جلوہ افروز ہونے سے قبل میرے والد کو یہ کہتے ہوئے تقریر کی دعوت دیتے کہ اب ہندوستان کے ممتاز ادیب اور ماہر میر انیس سید محمد عسکری اپنے زریں خیالات پیش کریں گے۔" آبا ان کے اس انداز پر کچھ کہتے تو فرماتے "میں مقام شناس ہوں"۔ غرض یہ کہ علامہ صاحب کے گھر پر خوب خوب ناز برداریاں ہوتیں۔ اس کے بعد ہم لوگ مایہ ناز ڈاکٹر وحید الدین کے گھر پر قیام پذیر ہوئے ڈاکٹر صاحب کی بیگم جنہیں سب پیار سے آپا کہتے تھے "خلوص سراپا" ہیں۔ پوری شخصیت شبنم ہی شبنم، شعور و ادراک و آگہی کے بل پر پورا گھرانہ جمہوری اقدار کا علمبردار۔ محمد اختر معروف جرنلسٹ ہی نہیں بلکہ عوامی تحریک کے روح رواں تھے۔ اتنی معصوم، پرکشش اور محبت سے بوجھل شخصیت کہ خدا کی پناہ " ان کو دیکھو کہ ان سے بات کرو"، کی ہر آن منزل۔ سیاسی شعور ایسا نکھرا ہوا کہ ہر مسئلہ دو اور دو چار کی طرح صاف۔

بہر حال طلباء کا کنونشن ہوا۔ ڈاکٹر ہاشمی، جمال نقوی انیس ہاشمی بی الیس سی کے طالعلم ہادی نقوی نے طلبا کے مسائل پر مقالے پڑھے، تقاریر ہوئیں، طلباء جوق در جوق جلسے میں آئے ریزولیشن جو پیش ہوا اس پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر سرور نے انجام دیئے۔ ڈاکٹر سرور نہ صرف فرد بلکہ ایک انجمن اور تحریک ہیں انہوں نے اپنی تقریر میں عوامی تحریک سے طلباء کا کیا رشتہ ہے اور کیا ہونا چاہئیے۔ اس پر نگاہ ڈالی، ان کا آتشیں عزم، ذی شعور و بیدار مغز، طلباء کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر لپک رہا تھا۔ ہر مقرر آگ میں پھول کھلانے کی رسم زندہ کرنے کے لئے بے تاب تھا مشاعرہ بھی ہوا۔ شاعری کے تاجدار حمایت علی شاعر نے مجمع لوٹ لیا ممتاز ادیب اختر پیامی کی

نظموں نے آگ برسائی۔ مشاعرہ رات بہت دیر تک جاری رہا۔ بعد میں آرام باغ میں جلسے کا اعلان ہوا۔۔۔ حکومت نے جلسے پر پابندی عائد کر دی۔ طلباء نے پابندی کو توڑ دیا۔ جلسے کا آغاز ہوا، مختلف طلباء کے نمائندوں نے تقریر کی۔ مجھ سے بھی کہا گیا۔ تقریر ہوئی ساتھیوں نے خیر مقدم کیا، لاٹھی چارج کیا گیا، گولیاں چلیں اور ہم بچتے ہوئے کسی طرح گھر واپس آ گئے۔ اس وقت میرا قیام اپنی بہن شبیر بانو زیدی کے یہاں تھا۔ ان کے شوہر عبداللہ زیدی فوج میں میجر تھے۔ میں ابھی دروازے تک پہنچی تھی کہ چاروں طرف سے خاکی وردی والوں نے گھیراؤ میں لے لیا۔ مجھے گاڑی میں بٹھا کر کورٹ مارشل والوں کے سامنے لایا گیا۔ سوالات کی بوچھار ہوئی۔ حسن بھائی کی بھی طلبی ہوئی۔ الزام یہ لگایا گیا کہ یہ خاتون سادات کی نسل سے ہیں انہوں نے ہمارے طلباء ہی بلکہ ملک میں زہر پھیلایا ہے۔ عوامی حقوق کی بات کی ہے۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ الزامات کی فہرست کافی طویل تھی۔۔۔ چنانچہ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ کو ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر اس ملک کو چھوڑ دینا ہے۔۔۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ دیا گیا۔ گھر جانے کے بجائے ہمیں فوجی قید خانے میں جو عجیب طرز کا تھا وہاں رکھا گیا وقت چونکہ زیادہ تھا اور ہوائی جہاز صبح جاتا تھا۔ اس لئے ہم بھوکے پیاسے قید خانے میں رہے لگاتار اور مسلسل سوالات اور بیہودگی کے الزامات سننے میں آتے رہے۔ طلباء کو باہر سے اندر آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ میری دوسری بہن حسن کی شادی اس دوران ممتاز ماہر تعلیم مرزا عابد عباس کے ساتھ ہو چکی تھی وہ بھی آئیں۔ انہوں نے مجھ سے لپٹنا چاہا لیکن خاکی وردی کا ایک ڈنڈا ہمارے درمیان میں آ گیا۔ ہم اپنی والدہ کے ساتھ ۲۴ گھنٹے کے اندر روانہ کر دیئے گئے۔

ہندوستان پہنچنے پر ہمارے ساتھیوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہار پھول پہنا کر عزت نوازا اور بہت بڑا جلوس نکالا۔ جس کے ذریعے وہ یہ ثابت کر رہے تھے دیکھو۔۔۔ ہم حق کے پرستاروں کو کس طرح نوازتے ہیں۔

ہندوستان میں پُرسکون ندی کی طرح ہماری زندگی بہہ رہی تھی کہ اچانک بساط اُلٹ گئی۔ ہماری والدہ کا انتقال ہوگیا۔ زندگی کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ کالج کی پڑھائی ادھوری رہ گئی۔ ابّا نے بھوپال کو خیرآباد کہا۔ ہم نے ہجرت کی۔ لکھنؤ ہماری منزل قرار پائی۔ میری زندگی افسردہ شام بن گئی۔ اسپتال میں داخلہ مل گیا۔ غموں کے بھنور میں گھر گئی۔ اتنی ہی پڑھائی بہت کافی ہے۔ لکھائی پڑھائی کے دفتر میں اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔ میری بڑی بہن عطیہ نقوی جو ادیبہ ہیں۔ اور میرے بہنوئی غلام حسنین نقوی۔ مُصر تھے کہ میں پڑھائی جاری رکھوں، گھر میں چہل پہل تھی لیکن میں بجھا ہوا چراغ۔ ابّا سے ملنے علامہ نیاز فتحپوری، جناب اثر لکھنوی، جناب فراق گورکھپوری آتے اور بہت ہی اچھی باتیں ہوتیں حکمت کے پھول جھڑتے۔ لیکن مزہ پھر بھی نہیں آتا۔ اسی زمانے میں احتشام صاحب سے ملنا ہوا۔ سرور صاحب بھی آئے۔ سب نے مل کر آگے پڑھنے کے لیے آمادہ کیا۔ اور۔ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوگئی۔ دوستوں کا حلقہ بنا۔ اساتذہ سے دوستی بڑھی۔ لائبریری سے رفاقت پیدا ہوئی۔ احتشام صاحب نے اپنے شعور کی شعلگی سے مجھے گرفت میں لے لیا۔ ان کی سادگی قابلِ تقلید۔ ان کا خلوص قابلِ رشک اور ان کی نظر پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھی۔ احتشام صاحب کا نام لیتے ہی یادوں کی کہکشاں نگاہوں کے سامنے کھل جاتی ہے۔ حافظے کی فصیل پر دیئے جل اٹھتے ہیں۔ احتشام صاحب امام نقد و نظر تھے۔ نکتہ سرائے ادب تھے۔ استاد خوش فعال تھے۔ عظیم انسان تھے۔ ترقی پسند تحریک کے معمار تھے۔

نقاد کی حیثیت سے احتشام صاحب نے پہلی مرتبہ تنقید کا رشتہ عصرِ حاضر کی دانش و آگہی سے جوڑا۔ انھوں نے تجزیے میں ماضی کو احترام بخشا ہر عہد میں طبقاتی کشمکش کی روشنی میں ڈوبتی اور اُٹھتی ہوئی تحریکوں کے خد و خال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ شعور و آگہی کے ایوان میں یوں چراغ جلائے... "ادب مقصد نہیں ذریعہ ہے۔

ساکن نہیں متحرک ہے... جامد نہیں تغیر پذیر ہے... اسے تنقید کے فرسودہ اصولوں سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ بلکہ ایک فلسفیانہ تجزیہ ہی کام آسکتا ہے، جس کی بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی اور ارتقاءِ بالضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہو..."

ادب اور سماج کا رشتہ میکانکی نہیں ہے۔ اس کے متعلق لکھا۔

ترقی پسندی کچھ بھی نہیں ہے اگر وہ کسی بندھے ٹکے اصول کے تحت ہر مسئلہ کا فیصلہ کر دیتی ہے... ترقی پسند تحریک کا خیال ہے کہ ہر ادیب اپنے سماجی شعور کی بناپر اپنے طبقاتی رشتے میں اپنے معاشرتی عقائد اور فنی تصورات کی روشنی میں ایک نیا مسئلہ پیش کرتا ہے... جو ادیب سماجی ارتقا کی جس منزل میں ہے اسی کی مناسبت سے وہ جانچا جاسکتا ہے۔ اور اسی نقطہ نظر سے اس کی ترقی پسندی کے متعلق رائے قائم کی جاسکتی ہے۔"

(پریم چند کی ترقی پسندی "تنقید اور عملی تنقید ص۲۴")

احتشام صاحب کی شخصیت گلبرگ کی ہریالی اور پہلگام کا جھرنا تھی۔ پرسکون، شفاف، روشن، تابدار۔ تہوں میں ہلچل لیکن احتیاط، اعتدال سے سب سنبھالے ہوئے۔ نفع اندوزی کے دشمن دوسروں کو نفع پہنچانے کے رسیا۔ منافقت سے کوسوں دور، درد سے بہت قریب۔ مسحور کن شخصیت۔ جو بھی پاس سے نکل گیا بس انھیں کا ہو گیا۔ سادگی ایسی کہ شاہی پانی بھرے۔ چھوٹا سا گھر لیکن علم و دانش کا تاج محل سواری کے لیے صرف سائیکل۔ موٹر نشین سیٹھ کے رخسار پر طمانچہ۔

اچھا استاد جس کی زندگی کے 'سرورق' پر علم ہی نہیں محبّت ہی محبت ہوتی ہے۔ جو ہنر بیچتا نہیں طالبِ علم کو سجاتا ہے نوجوانوں کی بنتی ہوئی شخصیتوں میں گل بوٹے کھلاتا ہے ان کو وقت دیکر پھر سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ اوروں کو کچھ بنانے کے شوق میں خود نمونہ بنتا ہے۔ اچھے استاد کی بناوٹ کا تانا بانا ایسے ہی بنتا

ہے۔ احتشام صاحب ایسے ہی شفیق استاد تھے۔ جن کا احترام کرنے کو جی چاہتا تھا۔ ان کے کلاس میں تل رکھنے کو جگہ نہیں ہوتی تھی۔ ”علم کا سرچشمہ کیا ہے؟ قدریں اپنی اہمیت کیوں اور کیسے کھودیتی ہیں؟ صنعتی دور نے تنقید کو کیا دیا ہے؟ ہیئت اور اظہار کی سماجی حیثیت کیا ہے؟ اس قسم کے موضوعات پر احتشام صاحب کے لکچر ”وہ کہیں اور سنا کرے کوئی“ کی منزل پر ہوتے۔ اسباب وعلل کے رشتے تلاش کرنا۔ طبقاتی روابط میں فن کی محبت متعین کرنا، سائنسی نقطہ نگاہ سے ہر مسئلہ سلجھانا ان کا حصہ تھا۔

سرور صاحب بھی ہمارے استاد تھے۔ گل وگلزار شخصیت، شگفتہ تحریر، جو اپنے دامن میں تاریخی سچائی، حسن اور زندگی۔ لئے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہلکے پھلکے انداز اور حسن کاری کے ساتھ ادبی مسائل کو پیش کرنا ان کا حصہ ہے۔ سرور صاحب سادگی وپرکاری کے دلدادہ ہیں۔ وہ ملمع اور تصنع کے قائل نہیں۔ اصل دھات میں نقش ونگار بناتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا تانا بانا جامعتی ہے جو اچھے استاد کی ذہنی بناوٹ کے لیے ضروری ہے۔ انھیں اپنے شاگردوں سے والہانہ پیار اور انھیں ”کچھ“ دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ ان کی ہر بات ”میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے“ کی ادا رکھتی ہے۔ یہ شخصیت ایسی ہے کہ انسان اقرار کرے تو پارسا بن جائے اور انکار کرے تو کافر۔

بہرحال اسی زمانے میں ہندوستان کی سیاسی اور معاشی سطح پر بہت سی تحریکیں چل رہی تھیں۔ بیکاری، بھوک اور بے روزگاری کے خلاف بہت بڑی بڑی تحریکیں آگے بڑھ رہی تھیں۔ تہذیبی سطح پر اردو اور ہندی کا مسئلہ بہت الجھ گیا تھا۔ اردو کی جڑیں کاٹ کر اسے صرف شاخوں پر بٹھانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ رجعت پسند قوتیں ہندی کو سنسکرت کی طرف اور اردو کی رجعت پسند طاقتیں عربی اور فارسی کی

جانب اسے موڑنے پر تلی ہوئی چھری کٹاری نکالے میدان میں اتری ہوئی تھیں۔ جمہوری طرزِ فکر رکھنے والے خاموش تھے۔ انھیں حالات کے نتیجے میں ہم نے احتشام صاحب اور آلِ احمد سرور صاحب کی سرپرستی میں ایک آل انڈیا اردو کانفرنس منعقد کر ڈالی۔ پہلے تو ہاتھ پیر پھولے۔ احتشام صاحب نے بھی ڈرایا۔ "کام بہت بڑا ہے.. بغیر پیسے روپے کے کیسے کرسکوگی"۔ لیکن مجروح کے اس شعر نے ہماری رہبری کی۔

ع میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ذکی شیرازی، شارب ردولوی، حیدر عباس، صوفیہ بانو، حسن عابد، قمر رئیس، نگہت، عطیہ اور تمام ساتھی ساتھ تھے۔ غرضیکہ چاروں طرف ایک ہلچل اور ہنگامہ برپا تھا۔ نہ جانے کتنی کمیٹیاں بنیں۔ کتنا روپیہ برسا۔ کتنی ہر طرف سے آؤ بھگت ہوئی۔ ہیڈکوارٹر چونکہ عطیہ نقوی صاحبہ کا گھر تھا۔ اس لیے نیچے پلنگوں پر بیٹھ کر ہی ہم لوگ سارا کام کرتے ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر، مفکر، نقّاد، سنسکرت کے عالم نیاز حیدر اپنے انتہائی مخصوص انداز میں روزانہ مشورے دیتے اور 'کھٹیا کانفرنس' نام کی نظم بھی "گڑھ" کر سناتے ... یہ کانفرنس کیا تھی۔ طلباء کی جانب سے اردو زبان ـــ جمہوری فکر اور نئے تقاضوں کو لبیک کہنے کی گھن گرج آواز تھی جو چاروں طرف پھیل کر اپنا خراج وصول کر رہی تھی۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی مایہ ناز ادیب اور شاعر ایسا ہو جس نے اس میں شرکت نہ کی ہو۔ بمبئی سے عصمت چغتائی، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، سیّد محمد مہدی، علی گڑھ سے ڈاکٹر پروفیسر علیم، دہلی سے بشیر حسین زیدی اور سجاد ظہیر اور لکھنؤ سے خمار بارہ بنکوی، ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر مسعود حسین ادیب، مجاز، جاں نثار اختر اور وہاں کے مقامی شعراء اور ادیب افتتاحی اجلاس قیصر باغ بارہ دری میں ہوا۔ گورنر مہمانِ خصوصی تھے۔ میں چونکہ کانفرنس کی

یوپی اسٹوڈنٹس اردو کنونشن کے زیرِ اہتمام کے۔ایم منشی گورنر یوپی خطاب کر رہے ہیں۔ ساتھ میں مسز منشی ممتاز ادیب حیات اللہ انصاری اور چیرمین اردو کانفرنس تشریف فرما ہیں۔

چیئرمین بھی اس لیئے میں نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا ڈاکٹر علیم احتشام حسین۔ آل احمد سرور، عصمت چغتائی اور علی سردار نے مقالات پڑھے۔ جن میں عام طور پر اس بات پر زور دیا گیا تھا۔ کہ زبان خواہ اردو ہو یا ہندی اس پر کسی مذہب فرقے اور گروہ کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ اردو کا جنم کسی بادشاہ کے حکم سے نہیں ہوا۔ بلکہ وہ عوام کی ضرورتوں کا سہارا لیکر آگے بڑھی ہے۔ اس نے تحریک آزادی میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نے انگریزوں سے آزادی دلائی ہے۔ اور جب ملک آزاد ہو گیا تو یہ کیا ظلم ہے کہ اردو کو دیس نکالا دیا جا رہا ہے ... اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ اسے اسی ملک میں بڑھنا اور جمہوری قوتوں کو آگے بڑھا کر اپنا صحیح مقام حاصل کرنا ہے ... دوسرے روز سمپوزیم تھا۔ کانپور سے سلطان نیازی، محمد مہدی، پروفیسر علی رضا حسینی، کرنل شبیر حسین زیدی اور دیگر دانشوروں نے خطاب کیا۔ سمپوزیم میں طلباءؔ نے بہت بھاری تعداد میں حصہ لیا۔ صبح سے شام تک مقالے پڑھے گئے تقاریر ہوئیں بحث اور مباحثے ہوئے۔ رات کو مشاعرہ تھا۔ صدارت مایۂ ناز شاعر آنند نرائن ملا نے کی۔ قیصر باغ بارہ دری میں زندگی کے چشمے اُبل رہے تھے۔ روح کی بلند پروازی کے مناظر سامنے تھے۔ ہر لحظہ بدلتی ہوئی کائنات اپنا راز کھول رہی تھی۔ ہر شخص ہمہ تن گوش تھا۔ مشاعرے میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری اور ساحر لدھیانوی نے ذہنوں کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا تھا۔ کلام کی طاقت گہرائی اور نئے نصب العین نے مجمع سے داد تحسین وصول کی۔ مجاز بہت دیر سے آئے۔ لیکن "جام چھلکاتے آئے"۔ لوگوں نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ ان کے ایک ایک شعر پر داد کیا ملی مجمع لُٹ گیا۔ مشاعرہ اپنے عروج پر تھا۔ مجاز اچانک آنکھوں سے اوجھل ہو گئے "مجاز کو بھیجو" "مجاز کو دوبارہ سننا ہے" فضا میں نعرے بلند ہو رہے تھے۔ لیکن مجاز کا نشان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملا۔ تھوڑی دیر میں اپنی

مخصوص ادا لیے پھر آئے ''اندھیری رات کا مسافر'' ''خوابِ سحر'' ''آوارہ'' خوب لہک لہک کر سنائیں۔ اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ مجاز پڑھتے جا رہے تھے اس لیے کہ ''خیالِ خاطر احباب چاہیئے ہر دم'' کی روایت سے جڑے ہوئے تھے۔ مجاز نے قدم قدم پر ذاتی ناکامیوں کو جھیلا لیکن محبّت والوں کا یہی وہ سیلِ رواں تھا جس نے کبھی انھیں اقتدار کی چوکھٹ پر سجدہ ریز نہیں ہونے دیا۔ کبھی شکست خودگی کو نہیں اپنایا۔ وارفتگی ہی وارفتگی۔ مجاز جدید اور نئے ہندوستان کے گو تمام خط و خال کو سمیٹے ہوئے نہیں ہیں ان کی شاعری ایک مختصر سے عرصے کی شاعری ہے لیکن ایک ایسا عرصہ جو ہندوستان کی تاریخ کی سب سے اہم درمیانی زنجیر ہے اور اگر اس زنجیر اور کڑی کو ہٹا دیجیے تو تاریخ ہند کی تہذیبی دنیا ادھوری نظر آئے گی۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم اور اس کے بعد کی تاریخ۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی سرفروشی کی تاریخ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

صبح کا تڑکا تھا کہ ایک خبر بجلی کی طرح پھیل گئی ''مجاز کا انتقال ہو گیا''۔ خبر تھی ''ایک ہوٹل کی چھت پر سردی سے ٹھٹھر کر مجاز روٹھ کر چلا گیا!'' مجاز ایک عہد ایک دور تھا۔ تمام زندگی رجعت پسندی اس پر سنگباری کرتی رہی۔ وہ در در کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ تنگ دستی نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا۔ لیکن وہ تخلیق کی گنگا جمنا اپنی نقرئی انگلیوں سے بہاتا اور سماج کو سیراب کرتا رہا۔ مجاز کو اپنے موضوع سے گہری واقفیت تھی۔ خلوص کی شدت کہیں قلم میں نشتر کی زہر آلودگی بھر دیتی۔ اثر انگیزی کے تمام فنی حربے استعمال کرتی سیاہی کے پیراہن میں نشتر چبھوتی۔ کہیں دوسری طرف حسن و جمال کے لیے پُر کیف اور پُر امید فضا تیار کرتی۔ لیکن اس طرح کہ مقصد و مسلک فن کو مجروح نہ کرے اور نہ ہی صناعی نظریۂ حیات کو۔ دونوں کا حسین اور خوبصورت امتزاج اور ''خونِ جگر کی نمود'' لیے لالہ و گل کترتا ہوا وہ ساحری کرتا رہا۔ اور آج دنیا کو

ممتاز صحافی اور ورلڈ رپورٹ کے مالک سید سعید نقوی ماسکو میں روسی کمیونسٹ
پارٹی کے سکریٹری کامریڈ میخائل گورباچوف کے ہمراہ......

پہلے سے زیادہ ویران چھوڑ کر چلا گیا۔

کچھ عرصے بعد کشمیر میں اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ موضوع تھا "اردو ذریعہ تعلیم" ہندوستان کے مختلف علاقوں کے اکابرین وہاں موجود تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کہکشاں زمین پر اُتر آئی ہو۔ اردو کی ابتدا سے لے کر موجودہ تعلیمی نظام اور اس کے نقائص سب ہی زیرِ بحث آئے۔ تحقیقی مقالے پڑھے گئے۔ "اردو زبان کتنی سیّال ہے وہ زمانے کے سینے پر بہتی اپنی "سطح" ڈھونڈھنے کے لئے بے چین ہے۔ مادری زبان میں بچے کی تعلیم اس کی حقیقی نشو و نما کی ضمانت دیتا ہے۔ غیر زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے بچّے کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جہاں بھی اردو بولی جاتی ہے حکومت کا فرض ہے کہ وہاں وہ اردو پڑھانے کیلئے اسکول اور کالج بنائے اور اساتذہ کی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ صرف غالب اکیڈمی" "اردو انجمن" اور دیگر اداروں کو بڑی بڑی رقوم دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ جب جڑوں کو کاٹ دیا جائے۔ بچوں کو اُن کی مادری زبان میں تعلیم سے محروم رکھا جائے تو صرف شاخ پر بلبل بٹھانے سے فائدہ نہیں ہو سکتا غرضیکہ کانفرنس تین دن تین رات تک جاری رہی۔ میں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے طلباء کی نمائندگی کی اور ایک مختصر سا مقالہ اسی موضوع پر پڑھا۔

کشمیر میں قیام کے دوران دو واقعات بہت ہی دلچسپ ہوئے۔ لکھنؤ سے ہمارے ہمراہ جانے والوں میں سید غلام السیدین نقوی بھی تھے جو اب سعید نقوی کے نام سے مشہور ہیں جن کے متعلق نیاز حیدر جیسے عالم اور ممتاز شاعر نے کہا تھا کہ "خالق ازلی کے پاس جمع شدہ جتنی حسن و رعنائی ہے اس میں سے چھانٹ کر (سعید نقوی) سیدین کے جسم کو تراشا گیا ہے۔ اس کے ذہن کی شعلگی اور نظروں کے تیکھے تیر بدن میں ایسی آگ بھر دیتے ہیں جیسے ماچس سے روئی کا گالا جل جاتا ہے"۔ سیدین نے سوئیڈن اور برنسٹن یونیورسٹی سے جرنلزم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان کے چچا وصی نقوی جو محترمہ اندرا گاندھی

کے زمانے میں وزیر تھے اور فیروز گاندھی کے گہرے دوست تھے۔ اس رشتے سے سیدین نقوی کی سنجے گاندھی اور کانگریس کے دیگر زعماء سے بہت گہری چھنتی تھی۔ محترمہ اندرا گاندھی کے ساتھ شملہ کانفرنس میں بھی ساتھ تھے۔ میر انیس، فیض صاحب اور ساحر کی نظموں کا انگریزی میں اتنا خوبصورت ترجمہ کیا کہ فیض صاحب اور بنّے بھائی یعنی سجاد ظہیر نے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "ہمارے یہاں پی ایچ ڈی حضرات بھی اتنا رواں ترجمہ نہیں کر سکتے۔ اس کا ترجمہ کوندے کی طرح تند و تیز اور بیل بوٹوں کی طرح حسین ہے۔" اس وقت یہ محترم "سکنڈ word Report" کے مالک ہیں

کشمیر اور شیر کشمیر شیخ عبداللہ دونوں ایک ہی نام ہیں۔ کشمیر اور ہندوستان کی جد و جہد آزادی کی تاریخ سے جس طالب علم کو ذرا سی بھی دلچسپی ہے وہ شیخ صاحب کی عظمت و بزرگی کے سامنے سر تسلیم خم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد گرم و سموم سے روغن غذا حاصل کی۔ سیاست کی سنگیر نگیوں نے ان پر پتھر برسائے لیکن ان کے خال و خط ہمیشہ لو دیتے اور تاریکی کو کاٹتے رہے۔ تلوار کی جھنکاروں کے درمیان نفسیات سیاست کے شناور بن کر وہ کشمیر کی کشتی کے ناخدا بنے رہے۔ اور ارباب حل و عقد کو دماغ کی کھڑکیاں کھولنے کا روح افزا پیغام دیتے رہے۔

محبت کی آگ وقت کے ساتھ سرد ہو جاتی ہے۔ لیکن عقیدت کی آگ تا حیات دہکتی رہتی ہے۔ شیخ صاحب کے گھرانے پر پابندی لگی ہوئی تھی۔ اس گھرانے کی طرف نگاہ اٹھانا گناہ کبیرہ تھا۔ عقیدتمندی متقاضی تھی کہ حریت و آزادی کے اس علمبردار کے سامنے سر تسلیم و نیاز خم کیا جائے۔ باوجود پوری کوشش کے شیخ صاحب کا دیدار نصیب نہ ہو سکا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ان کے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا۔ اس کا سہرا سعید نقوی کے سر تھا۔ اس لئے کہ وہ ڈاکٹر فاروق کے دوست تھے۔

انسان خواہ خطاط ہو یا نقاش، مصور ہو یا سنگتراش، شاعر ہو یا ادیب و سیاستداں

ڈاکٹر فاروق عبداللہ ایک نجی تقریب میں اپنے مداحوں کے ہمراہ

اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے۔ اُس کے خیالات اپنے ہی دور اور اپنی ہی گرد و پیش کی دنیا سے بنتے اور سنورتے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ قید و بند کی صعوبتوں اور زنجیر و سلاسل کی آغوش کے پروردہ ہیں۔ ساری خصوصیات میدانی درخت کی ہیں۔ مضبوط اور بڑا اعتماد، عظمت و بزرگی کا احساس لئے اُن کا قد قدرے لانبا، آنکھیں بولتی اور مسکراتی ہوئی، نقشہ کھڑا کھڑا، چہرے پر کبھی نہ بجھنے والی ذہانت کی روشنی، روشنی سے ذہانت کی کرنیں پھوٹتیں، شوخی ٹپکتی اور طنز و مزاح کا رچا ہوا مذاق جھلکتا نظر آتا ہے۔ فکر میں پختگی، مسلک روزِ روشن، تکمیل کا جذبہ بھرپور، لہجہ بے باک، بے لاگ، حقیقت پرور، منافقت سوز، فیصلہ کن، کبھی ہار نہ ماننے والا، قدرے زور آزما، ہر لفظ کے پیچھے علمی سنجیدگی، درد کے رشتوں سے گہرا ربط انفرادی دکھ کے بجائے اجتماعی درد کا مداوا تلاش کرنے کی تڑپ، انداز میں نرمی و سختی ملی جلی کشمیر کی خوشبو رگ و پے میں سرائیت، دل کی باتیں جب اور جس وقت بھی ہوتیں، تندیٔ طبع بساط پر گلکاریاں سی کرنے لگتی۔ کہیں گفتگو میں رومانی فضا بیدار ہوتی کہیں طبقاتی شعور جاگ کر ادنیٰ اور اعلیٰ کے فرق پر شعلہ ریز ہوتا، شعور میں پختہ کاری اور تجربوں کی گھلاوٹ نظر آنے لگتی فاروق سے کشمیر کی تاریخ پر تفصیلی گفتگو ہوئی ذہن میں چند نکات جو اس وقت زیرِ گفتگو آئے اب بھی محفوظ ہیں۔..... ''کشمیر میں ۹۲ فی صد مسلمان ہیں جو سری نگر میں اور جموں میں آباد ہیں۔ جموں میں آبادی کا بڑا حصہ ہندو ہے۔ ۱۸۴۶ء میں کشمیر کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۷ ملین میں مہاراجہ کو فروخت کر دیا۔ اس وقت سے مہاراجہ کی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں برطانوی راج نے عوامی متحدہ محاذ کو کمزور کرنے اور اس کے ہاتھوں سے اپنے چراغ کو گل ہوتا دیکھ کر اسنے ہر نو آبادی کے سینے میں تقسیم کا خنجر پیوست کر دیا۔ ہندوستان کی کوکھ سے ایک دوسری مملکت وجود میں آئی یعنی پاکستان۔ دونوں طرف کے بورژوا لیڈر قومی مسئلہ کو صحیح عنوان حل نہیں کر سکے۔ بہنوں کا غرور، بچوں کی خوشیاں، سہاگنوں کا سہاگ، ماں کی کوکھ'' ہندو اور مسلمانؑ کے نام پر اجڑی۔ کمیں گاہوں میں بیٹھے ہوئے شاطروں کی شطرنج پر گلال کے بجائے ہندو اور مسلمان

کے خون کی ہولی کھیلی گئی۔ کشمیر کے زعفران کے کھیت سرخ ہو گئے۔ صدیوں کی ہندو اور مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں جو ساتھ رہنے سہنے سے اُگی تھیں خون میں نہا گئیں راجے مہاراجے اس مجرمانہ کھیل کے چیمپئن تھے . . . . . الحاق کا حق جو ہر ریاست کا حصہ تھا مہاراجہ کو بھی سامراجیوں نے عطا کیا تھا۔ کشمیر نے ہندوستان سے الحاق کیا۔ جسے ہندوستان نے قبول کیا۔ کشیدگی بڑھی، فوج حرکت میں آئی، جوابی فارمولے تیار ہو سکا plebiscite کی بات چلی، ثالث کی طرف نگاہیں اٹھیں۔ اپنے گھر کی بات باہر نکلی۔ N ۔ U کی سرپرستی میں سامراجیت کا مفاد پوشیدہ ہے۔ اس آنگن میں دونوں جانب سے درخواستیں گذاری گئیں مقدمہ دائر ہوا، مقدمہ پر جرح ہوئی۔ ۶ فروری ۱۹۴۸ء کے جنرل میکنوٹن کے ریزولیوشن کی روشنی میں پاکستان نے تجویز پیش کی کہ U.N کے تحت غیر وابستہ اور غیر جانبدار plebiscite کرایا جائے۔ بات آگے بھی بڑھی، ہندوستان نے دوسرا ریزولیوشن پیش کیا۔ افہام و تفہیم سے مسئلہ کا حل نہیں نکالا جا سکا۔ دونوں طرف کی فوجیں پھر حرکت میں آئیں۔ یونائیٹڈ کمیشن برائے ہند و پاک ۵ جولائی کو آیا ceasefire کا ریزولیوشن پھر پاس ہوا۔ لیکن ۲۱ اپریل کو فری اور غیر جانبدار پلیبیٹ کی بات بھی کی گئی کمیشن رخصت ہوا۔ جنگ سرمایہ دار کی نظامِ حیات اور اس کی فکر کی تقدیر ہے۔ آگ کے شعلے بھڑکے۔ چمن کے سرو قد ایندھن بنے ایک دو نہیں تین مرتبہ۔ جہل، نفرت، تاریکی کے ہاتھوں کثیر رقم جنگ پر خرچ ہوئی۔ اعتماد نے شک، محبت نے بدگمانی اور نفرت نے پیار کی جگہ لی۔ لیکن شعلوں کی راکھ سے محبت کی چنگاری نکل رہی تھی . . . . . جو آج نہیں تو کل محبت کا گلستان اُگائے گی۔ دونوں ممالک اپنی اپنی خود مختاری، سالمیت اور آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے ایک ایسی محبت کے سنہرے باب کا اضافہ کریں گے اور ایک ایسے نظامِ حیات کی داغ بیل ڈالیں گے جہاں کلی کلی آزاد ہو گی غنچہ غنچہ مسکرائے گا یہی وہ معاشرہ ہے جس کے لئے ہم اپنی زمین کشمیر پر قربانیاں دے رہے ہیں۔ تاکہ جتنی خوبصورت ہماری زمین ہے اتنی ہی خوبصورت ہماری ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی

زندگی بھی ہو ..... سعید نقوی اور فاروق کی گفتگو اور بحث و مباحثہ سے اسی قسم کا تاثر مل رہا تھا۔

آزادی و حریت کی لڑائی بین الاقوامی عوامی جمہوری لڑائی سے جڑی ہوئی ہے۔ اس پر بھی مختلف میٹنگوں کے دوران بات ہوئی۔ ہر موقع پر گفتگو ذرا طول پکڑ لیتی۔ کشمیر ہی زیر بحث تھا کہ اچانک سیّد بن نقوی (یعنی سعید نقوی) نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کی بات جوش صاحب کی زبانی سنائی ... " بھئی بات یہ ہے کہ کشمیر دراصل محبوبہ ہے جسکی اداؤں کی راہ میں سمندر اور پہاڑ حائل نہیں ہو سکتے دیوار احتساب درمیان میں نہیں آ سکتی۔ وہ وقت و تاریخ کے سنہرے پیروں پر بیٹھی۔ اسباب و علل سے بے نیاز کی چابکدستی فضا کو رنگین کر رہی ہے اور ہر ایک کی نظر کا رس چھین رہی ہے چنانچہ ایسے عالم میں جب پاکستان اس کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے تو ہندوستان کے چوکیدار کہتے ہیں "خبردار اگر اس کی طرف نگاہ اٹھائی" اور جب ہندوستان آگے بڑھتا ہے تو پاکستان تڑپ اٹھتا ہے۔ خبردار۔ اگر ذرا گھسا حرکت کی تو آنکھیں نکال لوں گا اور یوں "میرے تو دونوں میٹھے والی بات ہے۔ کچھ دن بعد فاروق صاحب نے ہمارا کھانا کیا۔ گھر بہت ہی روایتی انداز کا تھا۔ فرش فروش گاؤ تکیے قالین۔ ماں انتہائی پر تمکنت و پر وقار، بہن سرسوں اور جوہی کی طرح کھلی ہوئی۔ کھانا انتہائی شاہانہ انداز میں چنا گیا۔ مہمان نوازی انتہا کی تھی۔ شیخ صاحب کی بیٹیوں نے اپنے ہاتھ سے دستر خوان لگایا۔ فاروق نے پھلوں کی تھالیاں پیش کیں اس کام کے دوران انہیں ٹھوکر بھی لگی جس کے نتیجے میں خاصے برتن چکنا چور ہوئے۔ دوسرے دن ہم سب پکنک پر گئے۔ گاڑی فاروق چلا رہے تھے۔ آدمی تو بہت عظیم ہیں لیکن ڈرائیور اناڑی چنانچہ کھیتوں میں جا کر جیپ گری۔ خیر سب بچ گئے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ سارے شہر میں خبر پھیل گئی۔ ہم پر جرمانے ہوئے، وہاں کی پولیس والوں سے خوب خوب باتیں ہوئیں بہر حال ہم رہا ہوئے۔ اسی دوران دلیپ کمار کی بہنوں کو بھی ہماری آمد کا علم ہوا۔ ان لوگوں سے ہماری بمبئی سے ہی یاد اللہ تھی۔ میں ریسرچ کے سلسلے میں جب بمبئی گئی ہوئی تھی اس وقت عصمت آپا کے گھر ہی ٹھہری تھی۔ عصمت آپا تو مہتاب ہیں جن کے ارد گرد ستارے جمع رہتے

ہیں۔ چنانچہ دلیپ کمار کے گھرانے سے نہ صرف ہماری ملاقات ہوئی بلکہ سعیدہ ، فوزیہ ، تاج رب نے مل کر ہمیں ہماری شدن خالہ اور ہمارے بھائی پروفیسر سراج نقوی سے ہمیں مستعار لے لیا اب جو ملاقات ہوئی تو پرانی یادیں عود کر آئیں۔ دلیپ کمار کا گھرانہ الیگزینڈر ریلیس، بوٹ ہاوس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم بر اجمان ہوئے۔ دلیپ کمار سے بڑے مزے مزے کی باتیں ہوئیں۔ بہن بھائی مل کر زیادہ تر جان سن، باسویل ملٹن اور کبھی کبھی اور کبھی زیادہ دقیق موضوعات چھیڑتے۔ روز نئی کتابیں آتیں اور سب بہنیں مل کر چاٹ جاتیں۔ بڑی بہن کو انگریزی ادب سے زیادہ فارسی ادب کا ذوق ہے۔ چنانچہ حافظ ، فردوسی ، نظیری خوب خوب سناتیں۔ یہ سارا گھرانہ نہ صرف خوبصورت، خوب سیرت اور بے پناہ ذہین ہے بلکہ انسانی رشتوں کا شناسا اور قدر دان بھی ہے۔ مٹھی بند کر کے انسانوں کا درد کیسے دور کیا جاتا ہے۔ غالباً یہ اس گھرانے کی دیرینہ ریت ہے۔ نہ جانے کتنے گھرانوں کے چراغ اس گھر سے جلتے ہیں۔ اور کتنی زندگیاں سنورتی ہیں۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ دولت شہرت، حسن اور علم اگر سب چیزیں اکٹھا ہو جائیں تو انسان کے قدم زمین پر نہیں ٹکتے۔ لیکن یہاں زندگی زمین کے سینے سے جڑی ہوئی ہے۔ اس لیے مہکتی اور چہکتی" ہے۔

کشمیر میں خواجہ غلام السیدین صاحب کا بھی نیاز حاصل ہوا۔ عالم اور خوبصورت مقرر محکمہ تعلیمات کے سکریٹری تھے۔ ان کے والد خواجہ غلام الثقلین کا شمار ہندوستان کی بلند پایہ شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ اس گھرانے سے میرے والد کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ اسی رشتے سے میں سیدین صاحب سے ملی۔ ریسرچ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا Humanities Seholar Ship کی انہوں نے نشاندہی کی ... میں لکھنؤ آگئی۔ امتحان میں اتفاق سے پوزیشن بھی ملی اور تمغات بھی اسکالرشپ کے لئے انٹرویو دیا۔ محترم چیلاپتی راؤ، پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے انٹرویو لیا۔ اس وظیفے کی ایک شق یہ تھی کہ ہر تیسرے مہینے رپورٹ انگریزی اور اردو میں پیش کی جائے گی تھیسس بھی انگریزی اور اردو یعنی دونوں زبانوں میں ہوگا۔ انگریزی

کا تھیس۔ حکومت ہند کی ملکیت قرار پائے گا۔ ریسرچ گائیڈ ایک لکھنؤ اور دوسرا دہلی سے ہو گا۔ چنانچہ لکھنؤ سے احتشام حسین اور دہلی سے ڈاکٹر کے ایم اشرف کا نام تجویز ہوا۔

دہلی بھی عجیب و غریب شہر ہے جو شکل نظر آئی، واقعی "تصویر" نظر آئی، ایک طرف ہندوستان کی ثقافتی علمی و ادبی ہنگامہ آرائیوں کا مرکز۔ دوسری جانب ارباب اختیار کی سازشوں اور طالع آزمائی کا مسکن۔ آزادی سے دوری اور آزادی پر جان دینے۔ دونوں روایتوں کی سرزمین۔ میں دہلی آگئی۔ اور اپنے بھائی محمد مہدی کے ساتھ رہنے لگی۔ بھائی کی بڑی بیٹی زلفیہ جواب ڈاکٹر ہے۔ اس سے خوب دوستی تھی۔ لیکن شیریں اور فیروز جواب ریسرچ اسکالر ہیں) خاصی لڑائی رہتی۔ بھابھی سے دوستی اور دشمنی کی دھوپ چھاؤں۔ مہدی صاحب سیاسی شخصیت ہونے کے ساتھ ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ اس لئے ان کے گھر پر مایہ ناز فنکار بیگم اختر ممتاز فن کار امجد علیخان، موسیقار مدن بالا مشہور رقاصہ پدمنی وغیرہ کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا۔ دہلی میں ان کے تین ڈرامے غیر معمولی حد تک مقبول ہوئے۔ "غالب کون ہے" اس میں غالب کو بالکل نئے روپ میں پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور محترمہ اندرا گاندھی جیسی عظیم ہستیوں نے ڈرامے کو چار گھنٹے متواتر دیکھا۔ "ہیر رانجھے کی خالق" شیلا بھاٹیہ اور ان کے شوہر حالی ممتاز ڈرامہ نگار حبیب تنویر، شمع زیدی اور دوسرے فنکاروں نے اس موقع پر محبت کے پھول نچھاور کیے۔ "جان غزل" غزل کے ارتقا کی نہایت خوبصورت کہانی ہے۔ بیگم اختر کی گائیکی نے اگر اسے چار چاند لگائے تو دوسری جانب من موہنی مدن بالا اور عظیم فنکار بہگل کے حسین و جمیل داماد نے اداکاری کے نگینے ٹانکے۔ "اقبال کا آدم" اقبال انٹرنیشنل کانفرنس میں کھیلا گیا۔ یہ ڈرامہ بیلے کے روپ میں پیش ہوا۔ اس میں اقبال کی فرنگیوں کی جانب مخصوص ذہنی رویئے کی کیفیت کو ابھارا گیا۔ سجاد ظہیر کی مایہ ناز بیٹی مونا اور راج ببر جیسے اعلیٰ پایہ کے فنکاروں نے سبک رفتاری خود اعتمادی اور منفرد انداز کے ساتھ کچھ اس طرح اسے پیش کیا کہ اڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر تبریزی اور جرمنی و بلغاریہ کے

ڈیلگیٹ سب اسٹیج پر آ گئے۔ ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے ہندوستان کی سیاسی و تہذیبی زندگی سمٹ آئی ہے جو فرنگیوں کے خلاف بغاوت کے ترانے گاتی آگے قدم بڑھا رہی ہے۔

مہدی صاحب کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر ہیں۔ گھر ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا سنگل صاحب، سجاد ظہیر، رینو چکرورتی۔ اے کے گوپالن، ہومی داجی، دہر صاحب، شرماجی وغیرہ سے یہیں ملنے کا اتفاق ہوا۔ سید عابد حسین (کامرس سکریٹری) ہمیشہ ایک نئی کتاب بغل میں لئے داخل ہوتے۔ انکی بیوی ڈاکٹر کار کی چونکہ ذہانت اور علم میں اپنے شوہر سے دس درجے آگے ہیں۔ اس لئے ان موجودگی میں بحیثیں بہت ہی دلچسپ ہوتیں۔ چونکہ دونوں ہی حسین ہیں اس لئے بات ذرا اور بھی غور سے سنی جاتی۔ دونوں پارٹی لائن بقول شخصے فٹ کر کے چلے جاتے اور بیانیہ تکمیل تک یہیں پہنچانا پڑتا تا۔ ڈاکٹر زیڈ اے احمد اور حاجرہ بیگم سے بھی یہیں نیاز حاصل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا قد چھ فٹ، سجیلا گٹھا ہوا جسم ماتھا چوڑا۔ گھنی بھنوؤں کے نیچے سے جھانکتی ہوئی روشن چمکدار اور غیر معمولی ذہین آنکھیں، سیاہی کے سامنے لوہا اور اپنوں میں موم سے بھی زیادہ نرم۔ تقریر بہتا ہوا دھارا، رو کے سے بھی نہ رکے۔ گفتگو تلخ و شیریں تجربوں کا نچوڑ۔ قید و بند کی تنہائیوں کے تذکرے جان لیوا۔ حاجرہ آپا بھی بہت سلجھی اور تندہی سے کام کرنے والی "پیس کمیٹی" "افرادالیشن" ادارے جیسی مختلف انجمنوں سے وابستہ۔ اور بہت سرگرم مجھے مختلف ادبی سیاسی اور تہذیبی سطحوں پر ان کے اور رینو چکرورتی کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا اور میں نے ان ہستیوں سے بہت سیکھا۔

ڈاکٹر اشرف کا تصور کرتی ہوں تو افق ذہن پر وادی کہسار طالع ہو جاتی ہے اور رگ و پئے میں خون گنگنانے لگتا ہے۔ پستہ قد۔ گندمی رنگت۔ کسرتی گٹھیلا بدن سینہ نکلا ہوا سینہ، گھنی بھنوئیں۔ روشن اور از خود ہنستی ہوئی آنکھیں۔ نگاہ اتنی بلند کہ افق اس کے لئے سنگِ میل اور ستارے گردِ کارواں لباس سے لاپرواہ، خاکی پتلون تو نیلی قمیص۔

کف کھلے ہوئے۔ جوتے کے بند آدھ کھلے ماتھے پہ بال اڑتے ہوئے۔ حسن و علم کا "لیس دین"
بقول انہیں کے ان کا مشرب، انکساری و ہمدردی کا مجسمہ۔ شاگرد ول کے گہرے دوست
چار آنے کا ٹکٹ لے کر بس کا سفر کرتے۔ کوئی شاگرد ساتھ ہوتا تو اس کا ٹکٹ بھی اپنے پیسوں
سے خریدتے، راستے میں اگر اتفاقاً سوال کیا! ڈاکٹر صاحب آپ اپنی رقم اپنی ذات پہ کیوں
نہیں خرچ کرتے تو جواب ہوتا "یہ اپنی ذات کیا ہے"۔ "یہ ذاتی رائے کیا ہے"، نظریئے کے
حوالے سے گفتگو شروع ہو جاتی ...... پیسے بچانا فرض ہے تاکہ پارٹی کے کاموں میں صرف
کیا جا سکے" وہ ادیب بھی تھے نقاد بھی تاریخ داں بھی تھے اور سیاست داں بھی۔ سیاست و
ادب میں وہ صرف نظریاتی نہیں عمل کے قائل تھے۔ انکی زندگی ہر سطح پہ جہاد، قید و بند
اور طوق و سلاسل سے مسلسل تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جب خیر و شر کی طاقتیں ٹکرا رہی ہوں
تو نظریاتی سطح پہ۔ انسان کو خواہ وہ ادیب ہو یا نقاش اسے صرف قلم ہی سے نہیں عملی میدان میں
بھی اترنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ سمندر تھا جس کی پہنائیوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے
ان کی فکر روشن، ہر سطر ڈھلی ہوئی اور ہر لفظ جرات کی کہانی تھا۔ برصغیر کی تحریک آزادی
میں ڈاکٹر اشرف نے جو چراغ جلائے اس کی لو سے ہزاروں چراغ ہمیشہ جلتے رہیں گے
کلاس روم میں ہوں، یا میدان عمل میں، مزدوروں کے ساتھ ہوں یا دوستوں کے وسیع حلقے
میں ان کی فکر پہاڑوں، دریاؤں سے گذرتی تو ڈاکٹر صاحب سیلاب بن جاتے۔ "جناب
بات دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہن پر ایک ہزار برس تک مسلم جاگیریت اور شہنشاہیت
کی حکمرانی رہی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور مذہبی افکار پر اس کی
چھاپ بدستور موجود ہے۔ صدیوں تک حکومت کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذہنوں میں یہ خیال
راسخ ہو گیا کہ مغل شہنشاہیت ابدالآباد تک قائم و دائم رہے گی۔ مسلمانوں کے نچلے طبقے کو
زیرنگیں رکھنے کے لیے حکمراں بڑی بڑی مساجد تعمیر کراتے۔ صوفیائے کرام خانقاہیں بنواتے
دینیات کے مکتب قائم کیے جاتے۔ درس گاہوں اور دینی اداروں کے معلمین کو "مدد معاش"

کے نام پر وظیفے دیئے جاتے تاکہ سب شہنشاہوں کے حق میں دست بدعا رہیں اور جب اور جس وقت نیچے سے آواز اٹھے تو اسے دبانے کے لئے "جہاد فی سبیل اللہ" کا نعرۂ مستانہ بلند کر دیا جائے۔ علمائے اسلام نے مدت درازسے انسانیت کو مومن و کافر اور دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب میں تقسیم کر دیا تھا۔ جہاد مسلمان کا صرف مذہبی نہیں قومی فریضہ ہے یہ سب حربے تھے عوام کو بے وقوف بنانے اور مذہب کی افیون دے کر سلانے کے تاکہ ظل اللہ کا کاروبار حیات "بابر بہ عیش کوش" کے طور پر چلتا رہے . . . . دیکھئیے آج بھی ہر مسلمان ملک میں یہی صورت حال ہے۔ پیر، قاضی، ملا، زاہد اور اقتدار سب مل کر اسی طرز پر فکری تانا بانا بن کر عوام کی "قسمت" سے کھیل رہے ہیں۔ بس اسی مقام پر پہنچیں کہ کیسے اور کس طرح جلدی سے، اندھیرے کو روشنی، غارتگری کو انسانیت میں بدلا جائے اور زندگی میں حسن بکھیر دیا جائے۔

میں جس وقت ڈاکٹر اشرف سے ملی وہ صحت کی خرابی کی بنا پر کمیونسٹ پارٹی کے کام سے زیادہ تدریسی کام میں مشغول تھے۔ ان کے انداز اور وضع قطع کو دیکھتے ہی سمجھ گئی ڈرتے ڈرتے اپنا تعارف کرایا . . . . پیارے انداز میں ہنستے ہوئے بولے آپ کا نام نشان پتہ کیا ہے . . . ؟ یہ سب صحیح ہے۔ لیکن آپ کا حسب نسب۔ یعنی شجرہ کیا ہے ؟" . . . میں گھبرا گئی . . . وہ ڈاکٹر صاحب فلاں گھرانے سے ہوں اور . . . . "یعنی آپ کے حسب نسب کا حال اب تک نہیں کھلا" تھوڑی دیر ٹھہر کر میں نے کہا . . . میں محمد مہدی کی بہن ہوں ایکدم کرسی پر سے کھڑے ہو گئے "ارے بھئی تم ہمارے مہدی کی بہن ہو" تو اب بات بنی شجرہ بھی کھل گیا۔ قبیلہ بھی معلوم ہو گیا"۔ اچھی کھاد اور شفاف پانی اگر ملے گا تو گلستان بن جائے گا . . . " ڈاکٹر صاحب اور لائبریری ایک ہی تصویر کے دو رخ تھے . . . . ہمیں بھی طویل مدت تک وہاں ٹھہرنا پڑتا تا۔ کبھی کبھی تو طبیعت جھنک ہو جاتی۔ اپنے ہاتھوں سے گرد جھاڑ کر کتابوں کے انبار اپنے اور ہمارے سامنے لگا دیتے۔ اور ہمارا سارا وقت اسی میں برباد ہوتا۔

نثار احمد فاروقی "میرؔ کے نہ صرف معتقد بلکہ رسیا ہیں۔ لائبریری کی دیکھ بھال ان کے سپرد رہتی۔ ان کو ہمارے حال پر رحم آجاتا۔ انہیں کے ساتھ گوپی چند نارنگ (صدر شعبہ اردو) بھی ہم پر ترس کھاتے۔ اور ہماری خاطر داری چائے سے کی جاتی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس زمانے میں ادب کی دنیا میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ باتوں میں موتیوں کے ہار گوندھتے تھے اور ہم پر رعب ڈالتے لیکن نثار احمد فاروقی اپنے تیکھے جملوں اور لانبے لانبے دعوؤں سے ہار بکھیر دیتے۔ دونوں ہی کی نظر گہری تھی اسی لئے تو ہم نے ان دونوں کے سامنے سپر ڈال دی تھی۔ خلیق انجم اور ذہین نقوی بھی اس اقلیم کے دعویدار تھے۔ بلاغت کے دریا بہاتے۔ باتوں باتوں میں سب کو بہلائے جاتے۔ نتیجے میں بغیر پیسے ادا کئے چائے پیتے۔ ڈاکٹر اشرف کے کمال کے ارد گرد یہ بھی طواف کر رہے تھے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب آئے اور سناٹا۔ ایک اکیلے ڈاکٹر صاحب ہزاروں پر حاوی ... کبھی غالب کی "دستنبو" پر نگاہ ڈالی جاتی۔ کبھی خاقانی، فردوسی، حافظ اور خیام جھوم جھوم کر سناتے۔ سنٹرل ایشیا کی تہذیب چونکہ ان کا مخصوص موضوع تھا اس پر "گل افشانی گفتار" کے انداز دیکھنے میں آتے۔ بھگت سنگھ اور چندر شیکھر کے قصے سناتے۔ ارونا آصف علی سے ملاقاتیں کراتے۔ سب کو کام سے لگا دیتے اور پھر کبھی سوشلزم پر تقریر ہوتی ... ہم نے تو تہیہ کر رکھا تھا کہ انگریزوں کو ملک سے نکال کر ہم محنت کشوں کا راج قائم کریں گے .... تشدد کی بھی ہمارے پیچھے روایت ہے .... لیکن ہلکی بہت ہلکی.. کبھی انقلاب کے معنی سمجھاتے۔ بھئی انقلاب کے معنی افراد کی تبدیلی کے نہیں بلکہ یہ ہیں کہ طبقاتی شعور بیدار کیا جائے اور وہ اس طرح کہ محنت کشوں کو منظم کیا جائے .. عوامی تحریک کے پاٹ کو چوڑا کیا جائے۔ طبقاتی رشتوں کے بدلے بغیر انقلاب مکمل نہیں ہوتا۔ پرولتاری ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے کے لئے "ہتھیاروں سے جہاد" ضروری ہے۔ پھر پیار سے ہنسنے لگتے۔ ادھر تو ہم پر علم کی "صبح طلوع" ہو رہی تھی۔ ہمارے ذہن کی گاگر میں تھوڑی سی تازگی آرہی تھی۔ ادھر خاندان کے بزرگوار حضرات جو ہر شخص کا اپنے آپ کو عارف گردانتے ہیں۔ ہماری شادی کے لیے بساط بچھائے مہرے پر مہرے چل رہے تھے

لیکن عجیب مذاق تھا۔ جو بھی شہسوار میدان میں اترتا، اسے "شٹ اپ" کے ڈنڈے دی جاتی اور پھر وہیں سے چالیں شروع ہوتیں جہاں سے کھیل شروع ہوا تھا۔۔ ہماری چھوٹی خالہ جو الہ آباد میں مقیم تھیں۔ ظہور قاسم کا پیغام لائیں۔ شکلاً ظہور قاسم خاصے معقول انسان نظر آئے لیکن پرانی فکر یعنی فرسودہ روایات میں گندھے ہوئے۔ دولت کے دلدادہ غرضیکہ وہاں بھی "شٹ اپ" پڑی اور نجات ملی۔ سلطان نیازی بھائی جان کے دوستوں میں سے تھے کانپور میں وکیل تھے۔ ان کی ترقی پسندی کی دھوم تھی۔ بھائی کے ذریعے ان سے ملاقات ہوئی سلسلہ چل نکلا۔ لیکن ابھی گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہی ہوئی تھی کہ لال جھنڈیوں نے ہمارا استقبال کیا۔ آپ تقریر نہیں کریں گی۔ سنا ہے کہ آپ نے پھر زیڈ اے احمد کے جلسے میں تقریر کی ... ریسرچ نہیں کرینگی۔۔ فائدہ نہیں ... یعنی تعزیرات ہند کی ہر شق کے ہم تختۂ مشق بننے لگے۔ ہماری بھابی کو ہر بات کا علم تھا ...... وہ ہماری مدد کو آئیں اور ہماری گلو خلاصی ہوئی۔ بساط بدستور بچھی رہی چالیں چلی جاتی رہیں۔

اسی زمانے میں لکھنؤ میں آل انڈیا مزدور کانفرنس ہوئی۔ ڈاکٹر زیڈ اے احمد اس کانفرنس کے روح رواں تھے۔ مختلف علاقوں سے وفود نے شرکت کی۔ میں مزدور تحریک سے وابستہ تھی۔ رینو چکرورتی کے ساتھ مزدوروں اور امن کمیٹی میں کام کر رہی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا۔ قدآور شخصیتوں کی دو خصوصیات بہت نمایاں ہوتی ہیں اول تو یہ اس کے نیچے گھاس نہیں جمتی دوسرے یہ کہ وہ اپنی ذات کو پس پشت رکھ کر چھوٹوں کی ذہنی تربیت کرنے کے لیے انہیں آگے بڑھاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی پہلو سے ہماری پذیرائی کی۔ جاجرہ آپا اور ڈاکٹر صاحب اکثر مواقع پر میری تقریریں کر اس پر کڑی تنقید بھی کرتے اور نئے نئے نکات سے ذہن کو آراستہ بھی کرتے ... کانفرنس کا انعقاد امین الدولہ پارک میں ہوا تھا پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مقررین اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ملک کی مختلف اہم شخصیتیں امن کمیٹی کے صدر سندر لال، ایم پی ایس کے بنرجی، کامریڈ گوپالن

وغیرہ وغیرہ موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے حکم کی تعمیل میں میں نے بھی کچھ یونہی سی تقریر کی۔ تقریر ختم کر کے پلیٹ فارم سے اتری ہی تھی کہ ایک صاحبہ نے ہمیں گلے سے لگالیا۔ "آپکی تقریر بہت ہی اچھی تھی آپ کے گھرانے سے تو ہمارا گہرا رشتہ ہے۔۔۔ آپ کے خیالات بہت حسین ہیں۔۔۔" خاتون کے لہجے میں کھنک اور شائستگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لانبا قد، سانولی رنگت، گھنگھریالے بال چہرے پر ذہانت۔ گفتگو آگے بڑھی۔ معلوم ہوا کہ لندن سے نفسیات میں ایم اے کیا ہے۔ قمر زیدی کے نام سے مشہور ہیں۔ میں نے ان کا دعوت نامہ قبول کیا اور گھر گئی۔ گھر انتہائی سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ لکھنؤ کی نفاست ہر پہلو سے آشکارا تھی۔ گفتگو خاصی طویل ہوئی ہم نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ "میں آپ کے خیالات سے بالکل متفق ہوں۔۔۔۔ قمر نے کہنا شروع کیا۔۔۔ ملک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمیشہ جاگیردار طبقہ ہوا کرتا ہے اس کی باقیات کو بھی بیخ و بُن سے اکھاڑنا لازمی ہے۔۔۔ ورنہ ملک ہمیشہ پس ماندہ رہیگا۔۔۔ پھر آہستہ سے بولیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یوں تعلق تو ہمارا بھی اسی طبقے سے ہے۔۔۔ لیکن ہم سب بہن بھائیوں نے بغاوت کر دی۔ بڑے بھائی علی امام نے راجہ کا خطاب واپس کر دیا۔ اور اس " حلقہ یاراں " میں شامل کیا ہوئے بلکہ سنتے ہوئے بولیں "کنوینر" بن گئے جس میں ڈاکٹر رشید جہاں، پروفیسر احمد علی، جمال قدوائی، کموڈور خالد جمیل انتہائی ذہین خاتون مایا جمیل اور جمیل صاحب تھے۔ دو ایک حضرات کو چھوڑ کر ان لوگوں نے ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔۔۔ دوسرے بھائی حسین امام نے وکالت کا پیشہ اپنایا۔ تیسرے نے حکومت کی ملازمت قبول کی اور چھوٹے بھائی تو سب سے زیادہ باغی نکلے۔ انہیں ابا کا جاگیردارانہ انداز بہت ہی ناپسند تھا۔ چنانچہ بھائی صاحب کے ساتھ مل کر ساری زمینیں کسانوں میں بانٹ دیں۔ گھر میں کہرام ہوا۔ مقدمے بازیاں ہوئیں۔۔ جب بات آگے بڑھی تو سوئیڈن چلے گئے۔۔ وہاں اس وقت ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کر رہے ہیں۔۔۔ ہم سب دراصل اپنے بھائی راجہ صاحب محمود آباد کے جو تاریخ برصغیر میں نورتن ہیں ان کے پیرو ہیں

حالانکہ سچ پوچھئے تو اس گھرانے کے سامنے خاک پا بھی نہیں ... " لیکن آپ کا راجہ صاحب کے گھرانے سے کیا تعلق ہے ؟

میں نے دریافت کیا ؟

بھئی راجہ صاحب محمود آباد اور راجہ صاحب بھٹوامئو (بارہ بنکی کے قریب اسٹیٹ) یہ دونوں بھائی بھائی ... لیکن آپ نے اپنے متعلق تو کچھ بتایا ہی نہیں ۔ میں نے سوال کیا ... ؟

قہقہہ لگاتے ہوئے بولیں .... ہمارے والد راجہ شہنشاہ حسین نے ہماری شادی " برابری " کے لحاظ سے رعواڑے میں لگائی ۔ صاحبزادے چونکہ یورپ کے شیدائی تھے ۔ اس لئے انگریزی جھوردی اور دولت کی نمائش اس قدر کی کہ خدا کی پناہ ... چنانچہ ہم نے اپنے بھائیوں کے ذریعے انکار کر دیا ۔ بھائی چونکہ ترقی پسند خیالات کے ہیں ۔ اس لئے کسی نے کچھ بھی نہیں کہا ... اور بیرسٹر صاحب کے بیٹے ڈاکٹر سبط زیدی سے ہم نے شادی کر لی ... ابھی باتیں ہو ہی رہی تھیں ڈاکٹر صاحب آگئے ۔ سراپا بہار ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ ، علم سے بوجھل انداز ، دلکش ہنسی انہوں نے مشفقانہ انداز میں دو چار باتیں کیں ... اور محفل برخاست ہوگئی ۔

ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ ایک دن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک ایک شخص داخل ہوا ۔ لانبا قد ، کسرتی بدن ، گندمی رنگت ، گھنگھریالے بال بڑی بڑی آنکھیں ، چال ڈھال ڈھیلی ڈھالی ، قمر نے تعارف کرایا ۔ یہ میرے بھائی ہیں ۔ سوئیڈن سے آئے ہیں ان سے ابھی زیادہ بات نہیں ہونے پائی تھی کہ بہن صاحبہ ہمارے گھر پیغام لے کر پہنچ گئیں ابا اور ہماری بہنوں نے رشتہ پسند کیا ۔ لیکن ہم نے اور بھابھی نے حسب دستور " نا " کہہ کر چلتا کیا ۔ ابا ناراض ہو گئے ، قمر کو صدمہ پہنچا ۔ ایک مدت تک ان کے یہاں آنا جانا ملتوی ہو گیا ... ایک دن ٹیلی فون آیا ۔ اماں کی صحت یابی کا جشن ہے آپ لوگ قیصر باغ کی کوٹھی پر تشریف لائیے میں اپنی بہن عطیہ نقوی کے ہمراہ گئی ... سارا گھر جگمگا رہا تھا ۔ خوبصورت لڑکیاں اور خواتین غرارے پہنے مصروف کار تھیں ۔ اماں بیچ میں بیٹھی ہوئی تھیں ان کے نزدیک ان کی بڑی بہو قمرن بیگم

بیٹھی ہوئی تھیں۔ انتہائی نازک اندام خوبصورت . . . سب بیٹے ماں کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے . . . تھوڑی دور میراثنیں کلو کے ہمراہ بیٹھی گانا گا رہی تھیں . . . تھوڑی دیر کے لیے وقفہ ہوا اتنے میں سوئیڈن والے صاحب آگے بڑھے . . . اچھی ہیں آپ ؟ تھوڑی دیر رک کر اور یہ کہہ کر تان پورہ لیا اور ایمن الاپنا شروع کیا۔ چند منٹ کے بعد غائب ہو گئے . . . . کھانا ہوا . . . . محفل سجی . . . نوابین کے لطیفے بیان ہوئے۔ علی امام نے نواب صاحب اثر دولہ کا ایک واقعہ سنایا کہ انہوں نے تازہ ہوا کھانے کے لیے ایک ہوائی جہاز خریدا تھا جب انہیں تازہ ہوا کھانی ہوتی تو انگریز پائلٹ انہیں اڑا کرلے جاتا اور پھر واپسی پر وہ اپنے جہاز کو کھونٹے سے باندھ دیتے . . . قہقہہ بلند ہوا۔ قمر نے بات کاٹتے ہوئے کہا . . . بھائی اپنا بھی تو حال بتائیے۔ مسکرائے پھر بولے ہاں بھئی۔ ہم بھی بہت سی حماقتوں سے گذر چکے ہیں . . . بات یہ ہوئی کہ ہمارے دادا جان نے ہمیں مسند نشینی بخش دی۔ حسن ، دولت ، شہرت ، اقتدار یہ تینوں باتیں اگر ایک جگہ اکٹھا ہو جائیں تو پھر قدم زمین پر نہیں ٹکتے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ بھی یونہی ہوا۔ باہر دیوان خانے میں محفل سجتی۔ ایک طرف موسیقار ، ادباء اور دوسری طرف حاشیہ بردار ، جام پر جام چھلکتے . . . . خس کی ٹٹیاں چھڑکی جاتیں۔ کڑاکے کی دھوپ میں لبقول شخصے چہار باسی " چھڑکاؤ کرتے۔ ہم داد عیش دیتے . . . اور جب رات گئے تک نڈھال ہو جاتے اور غش کا عالم طاری ہو جاتا تو ہم ہاتھ اٹھا کر کہتے۔ " تخلیہ " ، ابھی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ آواز آئی " اور اب حال یہ ہے کہ لوگ محفل سجاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے " تخلیہ " ، اور ہمارے بھائی محفل سے اٹھ کر چلے آتے ہیں . . . سوئیڈن سے آئے ہوئے صاحبزادے اس طرح گلفشانی کر رہے تھے بات دلچسپ تھی۔ خوب ہی قہقہے بلند ہوئے . . . . ڈاکٹر سبط زیدی نے ایک جملہ اپنے مخصوص دھیمے انداز سے کہا۔ بھائی یہ تو بتائیے۔ یہ حسین امام (رحمن) کی بیوی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے . . . . . ؟

اماں . . . . کچھ سوچتے ہوئے بولے . . . ارحمن کی بیوی تو راجہ صاحب محمود آباد کی شادی کا گاؤ ہیں . . . . اور کیا . . . " اور اگر بھائی عالیہ جیسی لڑکی آپ کے گھر

میں آجائے تو"۔۔۔ تو کیا۔۔۔ بس بھٹو امیٔواسٹیٹ میں اندرا گاندھی آجائیں گی۔۔۔ بھائی کی بات کاٹ کر کاظم امام نے اس طرح فقرہ چیت کیا۔۔۔۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔۔ وقت گذرتا گیا دلچسپیوں کے دائرے وسیع ہوتے گئے۔۔۔ پھر صاحبزادے سوئیڈن چلے گئے۔ میرے گھر والے خوش تھے۔ بات صحیح رخ پر جاری تھی کہ اچانک قمر کے پاس خط آیا" مجھے انجنیئرنگ کا کورس تمام کرنا ہے۔ وقت کی کمی ہے۔ شادی ابھی نہیں کرنا ہے" خط ملتے ہی ہم پر اوس پڑگئی۔۔۔ اب تک تو کسی نے بھی اس طرح کی جرأت نہیں کی تھی۔ جس ملک کو جاہا تسخیر کیا اور پھر اسے مفتوح کے حوالے کر دیا۔ یہ سب کیوں ہوا؟ ہماری انا ریزہ ریزہ ہوگئی۔ ہماری بھابھی بڑی ظالم نکلیں۔ پھر بلیچ کی ماہر ہیں انہوں نے طنز و مزاح کے حسین تیر ہم پر برسانا شروع کر دیا۔ " منہ پھیر کر چلا گیا"۔۔۔۔ پرنس جو ٹھہرا۔۔۔۔ میں سخت الجھن میں گرفتار ہوگئی۔ قمر نے صاحبزادے کا پتہ لیا۔۔۔ خطوں کی بارش کردی۔ ہر خط میں گلاب باڑی لگائی۔ پھول مہکے، خوشبو دور دور تک پھیل گئی۔۔۔۔ دونوں گھرانوں نے خوشبو کا خیر مقدم کیا۔ دونوں طرف کے گھر خوشیوں میں نہا گئے۔ کاظم کی اماں نے جو بہت بڑی مومنہ اور پاکدامن بی بی تھیں۔ انہوں نے مجھ پر محبت کے پھول برسائے۔ کاظم کے بھائی حسن امام کی بیوی فرزانہ باجی اور ان کے بچوں حیدر امام نے جو اس وقت لندن میں پروفیسر ہیں اور دوسرے بیٹے باقر جواب پائلٹ ہے) اور نکہت نے بھی مجھ پر ہیرے موتی برسائے۔ چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ کاظم نے مجھے سوئیڈن لے جانے کی تیاری مکمل کرلی ان کی ملازمت اور گھر بار سب وہیں تھا۔ اس لئے میرا وہاں جانا طے ہوگیا۔ مجھے سوئیڈن جانے کی خوشی بھی تھی۔ لیکن رنج بھی۔ رنج اس لئے کہ یوں میں کتنے سے بہت دور ہو جاؤں گی اور پھر جب میں نے پاکستانی شہریت و قومیت قبول کرلی ہے تو کیوں نا میں بی بی کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹے جائیں۔ چنانچہ میں نے پاکستان جانیکا فیصلہ کرلیا۔

پاکستان میں آمد، شعبۂ تعلیم سے وابستگی

پاکستان میں کنبے والوں نے ہم پر پھول برسائے۔ پھولوں کی سیج سجائی۔ بی بی نے خاص طریقے پر مجھے گجروں سے لاد دیا۔ شاید اس لئے کہ بی بی خود بھی گجر الھتیں۔ چھوٹی چھوٹی لیکن روشن آنکھیں، درمیانی ماتھا، بیضاوی چہرہ چمپئی رنگت، گھنے بہت لانبے بال، امی کی طرح سرو قد، نازک اندام، متوازن چال، مدہم لہجہ، معتدل آرا، محتاط انداز کی خوگر، پورا وجود چاند کی ٹھنڈک میں نہایا ہوا۔ پرسکون روشن۔ شفاف ذہن، دور رس نگاہ، ہمہ جہتی احساس، قابلِ رشک ضبط و تحمل، ناانصافی کے سامنے ٹھوس چٹان، درد کی منزل پر شبنم، ہموار فکر، پیکر اخلاق، غم کی مزاج داں، سچی رازداں، پھیل جائیں تو کہکشاں، سکڑ جائیں تو جلتا ہوا چراغ۔

بی بی بچپن ہی سے خاندان کی محبوبہ تھیں، چچا، پھوپھی، خالہ، نانی بہن بھائی بی بی کے صرف پرستار ہی نہیں تھے بلکہ انہیں مرجع شعور و آگہی سمجھتے تھے۔ ہر سنکٹ میں بی بی نیا پار لگاتیں۔ اس کی وجہ بی بی کی ذہانت اور خاندانی تہذیب و اقدار پر غیر معمولی گرفت تھی۔ اختلاف خواہ چھوٹوں سے ہو یا بڑوں سے احترام کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ شائستگی سے بات منوائی، میلو ڈرامے سے بہت دور تھیں۔ کڑوے بول مسکرا کر پیتیں، بس ٹھنڈک فرحت، دلنوازی، یوں لگتا جیسے

؎ پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ان کی موجودگی سب کے لئے ڈھارس کا سبب تھی۔ بقول غالب

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

شادی کے بعد بی بی حیدرآباد ہی میں رہیں اس لئے کہ ان کے شوہر مرزا عابد عباس پہلے سٹی کالج کے پرنسپل تھے بعد میں تعلیم کے سکریٹری ہوگئے۔ عابد بھائی کے لیے بی بی بیوی نہیں

محبوبہ تھیں ان کی دلجوئی و ناز برداری ان کا شیوہ تھا۔ حیدرآباد کے مردم خیز اور جوہر شناس خطے نے بی بی کی بہت زیادہ پذیرائی کی۔ بی بی وہاں کی ہیروئن تھیں، "جشنِ موسیقی" کی کبھی صدارت کرتیں، کبھی طلباء و طالبات کے مذاکرے میں جج بنتیں، کبھی ریڈیو سے عورتوں کا پروگرام کرتیں، کبھی مجالس کی روحِ رواں بنتیں، کبھی میر رسول بخش تالپور کے ساتھ جڑ کر محنت کی افسردہ راتوں میں تارے کھلاتیں۔ کبھی مسیحائی کے فرائض انجام دیتیں۔ اپنے اثر و رسوخ سے کام لیکر اسپتالوں میں مریضوں کا داخلہ کروا یتیں۔ محروم بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرتیں۔ جتنی سیدہ بی تھیں۔ جن کا کوئی نہیں تھا بی بی ان کی تھیں دل و جان کی گہرائیوں سے۔ مفلس کا جنازہ لے کر بیٹھنا، غموں کے گھاؤ پر مرہم رکھنا، گھر والوں کے بوجھ کو ہلکا کرنا، بوجھل قدموں کو سہارا دینا۔ جھکی ہوئی کمر کے لئے عصا بننا۔ ٹوٹے ہوئے گھر کو آبدار بنانا بی بی کا مسلکِ حیات تھا۔

بی بی کا حلقہ، تعارف و ملاقات "نیرنگ بو قلمونی" تھا۔ ایک طرف رندان بادہ خوار حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی، الیاس عشقی، عظیم عباسی، قاضی صاحب تھے۔ حمایت کی شخصیت کا بانکپن اور شاعری کی نظریاتی پختگی تو زمانے کو جھکا کر اپنا خراج وصول کر چکی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ حیدرآباد میں رہتے ہوئے وہ عابد بھائی کے گھرانے کو محروم رکھتے۔ چنانچہ ہر جشن میں وہ میر محفل ہوتے۔ ان کے علاوہ بی بی کے دوستوں میں ڈاکٹر فاروقی اور انکی بہت پیاری سی بیوی منور بھی تھیں۔ یہ دونوں اندھیرے میں روشنی، بربریت میں انسانیت اور زندگی میں حسن کی پہچان ہیں۔ ان کے لئے بی بی شمع اور یہ پروانے تھے۔ اس طرح امداد صاحب اور ان کی بیوی فرحت ہیں۔ یوں پیشے کے لحاظ سے تو امداد صاحب ڈی آئی جی تھے ڈنکے کی چوٹ تھے۔ لیکن حقیقی سطح پر مفکر اور نکتہ رس ادیب ہیں۔ تاریخ کے تقاضوں کو محسوس کر کے ایک نئے فکری نظام سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا انکی ذکاوت کی دلیل ہے فرحت ذاکرہ ہیں۔ اسی "ذکر" کے رشتے سے انسانوں کو پہچاننے کی غیر معمولی صلاحیت

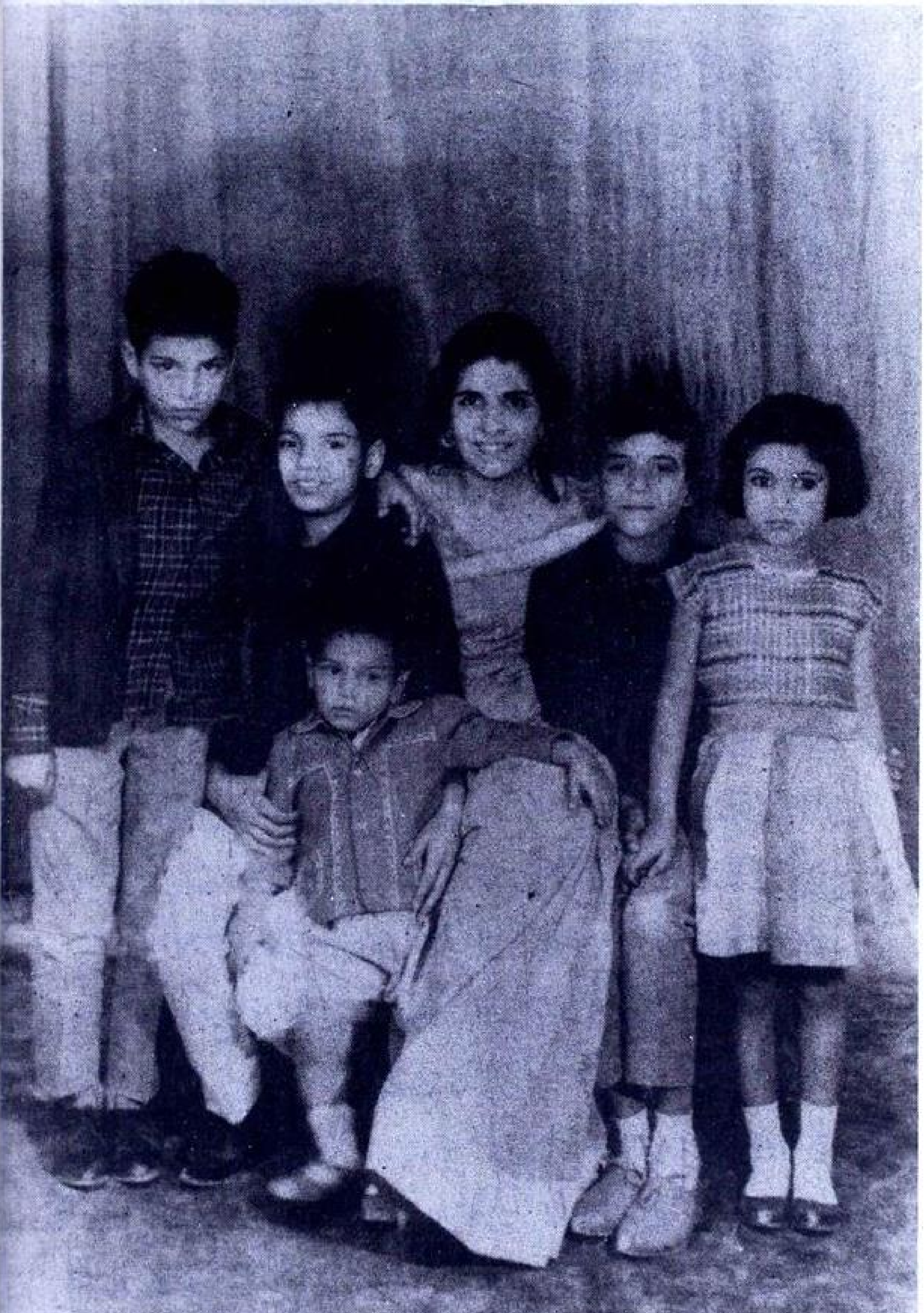

بی بی اپنے گلستاں میں

سے مزین ہیں۔ " تخت وتاج " سے بے نیاز، بس انسان اور بہت اچھے انسانوں کے درد کو دور کرنے میں پیش پیش بی بی کے دوستوں کے حلقے میں مسز نظر بھی ہیں۔ بہت ہی پیاری شخصیت سراپا خلوص و محبت، کوئی لے یا نہ لے جھکی جھکی محبت بانٹنا ان کا فریضہ تھا اسی طرح مہدی صاحب اور مسز مہدی بھی ان کی بہت ہی ناز برداری کرتیں۔ پروین اور فیضی تو ہر وقت ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ پروین نیاز صاحب کمشنر کی بیٹی ہیں۔ انتہائی بردبار اور پرکشش شخصیت کی مالک۔ فیضی بھی بہت ذہین، یوں شیریں دہنی، خلوص اور ذہنی شعلگی نے ہر کس و ناکس کو بی بی کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ سب تو بی بی کے پرستار تھے لیکن بی بی ہماری! بچپن ہی سے ہمارا اور بی بی کا سنجوگ انگور کی بیل کی طرح تھا۔ ان کا دل میری جانب یوں کھنچتا تھا جیسے ندی کا پانی ترائی کی جانب۔ گھر میں دھوبی کے آنے پر خوب ہنگامہ ہوتا میں اپنے کپڑوں کے ساتھ بی بی کے کپڑے بھی اپنی الماری میں بند کر دیتی۔ امی کی ڈانٹ پڑتی اور جب میں اٹھواٹی کھٹواٹی لے کر لیٹ جاتی تو بی بی بہت پیار سے سمجھاتیں " دیکھو تم چلاتی ہو ... تو سب تمہیں ہی برا کہتے ہیں۔ بجی باجی، ٹین باجی، حمدان باجی سب کو تم چاہتی ہو لیکن وہ تمہیں برا کہہ رہی تھیں ... اچھا ... تم سب ہمارے کپڑے پہن لو ہم کچھ نہ کہیں گے۔ اور یوں بی بی منا لیتیں۔ پھر ہماری دوستی ہو جاتی۔ ابا کے منشی جی سے اپنا کام کرواتی ڈانٹ کی زد پر آتی تو فوراً بی بی ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے کر مجھے بچا لیتیں۔

لائبریری میں ہمارا جانا ممنوع تھا کیونکہ ابا کا خیال تھا کہ میں کتابوں کی ترتیب بدل دیتی ہوں ذرا ہم نے خلاف ورزی کی اور بس کتابیں فرش پر پھینک دی جاتیں۔ حکم نامہ صادر ہوتا " عالیہ سے کہو کتابیں ٹھیک سے رکھے " میں تو ابا کے جاتے ہی ان کے پلنگ پر دراز ہو جاتی اور بی بی ہمارے حصے کا کام سمیٹ لیتیں۔ امتحان میں ہم سے اکثر کھانا خراب ہو جاتا۔ بی بی اپنا پکایا ہوا کھانا دے کر ہمیں پاس کرا دیتیں۔ ہم ان کے حصے کا کھانا، سلطانہ،

اور حمیدہ آپا (جسٹس سلام الدین کی بیٹی) ہماری مایہ ناز استاد، کو کھلا دیتے۔ بی بی غصہ کرتیں۔ لیکن جیسے ہی ہماری آنکھوں میں آنسو آتے فوراً مجھے گلے سے لگا کر پیار کرلیتیں ڈبیٹ میں اکثر بی بی کو پہلا انعام ملتا۔ میں ان سے خوب جھگڑا کرتی۔ گھر پہنچتے ہی بی بی یوں اعلان کر دیتیں "امی علو کو فرسٹ پرائز ملا ہے" اور بس ہم خوش ہو جاتے۔

کراچی میں ہمارے گھر جوش صاحب اور فیض صاحب کی محفل ہوتی یا منور علی خاں صاحب اور بیگم اختر کے ساتھ شام منائی جاتی۔ مزدوروں کے اعزاز میں جلسہ ہوتا یا علامہ رشید ترابی کے ساتھ نشست ہوتی یا گھریلو محفل ... بی بی حیدرآباد سے آجاتیں، ہمارا گھر سجاتیں، سارا انتظام کرتیں۔ ہم بس رانی بنے بیٹھے رہتے۔ میرے دوست سلمان علی چودھری محمد علی جیسے مائیہ ناز ادیب کے فرزند بلند اقبال جو ماسکو میں ہمارے سفیر تھے بی بی کے حسن انتظام کے بہت ہی معترف تھے۔ ان کے علاوہ میری عزیز ترین دوست عفت بلگرامی جو فن کا جیتا جاگتا مجسمہ ہیں اور ان کے شوہر عابد بلگرامی ذکاوت ہشرافت و پاکیزگی کا نمونہ ہیں۔ بی بی کے لہجے کی نرمی، وجود کی مہتابی ٹھنڈک اور ان کے انسانی رشتوں میں خلوص و محبت کی تلاش کے بے پناہ مداح تھے۔ بی بی میرے گھر کو ہر طرح کی زینت بخشیں میرے سب بہن بھائی مجھ سے تحفے لیتے لیکن بی بی کو جب بھی ہم نے کچھ دینے کی کوشش کی ہمیشہ یہی کہا "علو یہ تمہارے اوپر اچھا لگتا ہے .... تمہارا گھر سجا ہوتا ہے تو ہمیں خوشی ہوتی ہے .... بس تم خوش رہو .... کاظم سے لڑا مت کرو۔ پھر یوں سمجھانا شروع کرتیں۔" تم خود سوچو کاظم نے عمر کا بہت بڑا حصہ یورپ میں گذارا ہے۔ نیا ذہن نئی اقدار ہیں۔ تمہارے گھر والوں کی طرف سے کاظم کی انا کو زخمی کیا گیا .... لیکن ان کی بڑائی یہ ہے کہ شائستگی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا .... وہ صحیح کہتے ہیں .... تم بھی بس ignore کرو۔ تم آنسو نہ بہایا کرو۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

بی بی کاظم کی حلیم الطبعی اور شائستگی کی دل سے قدردان تھیں۔ ان کے سامنے

کسی کو بھی حرف زنی کی ہمت نہیں تھی۔ کاظم کی حمایت میں بی بی کا لہجہ کبھی نرم و ملائم اور کبھی تیز اور رواں ہو جاتا۔ کاظم ہی کی محبت میں اطہر عباس کو جو اس وقت ماشاءاللہ اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور ذہانت اور محبت میں بی بی کا پر تو ہے۔ انہوں نے ہمارے پاس چین بھیجنا چاہا لیکن چونکہ اس وقت وہاں کلچرل انقلاب شروع ہو چکا تھا اور تمام حضرات اپنے بستر لپیٹ رہے تھے۔ اس وجہ سے اطہر کو چین بلانے کی بات آگے نہیں چل سکی۔ جس کا صدمہ مجھے آج تک ہے۔ بی بی ان لوگوں میں سے تھیں جو ان کہی باتوں کو سن لیتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے کبھی اس مسئلہ پہ بات نہیں کی بلکہ اس کے برعکس اگر کسی نے زیر لب شکایت بھی کی تو اس کی پرواہ نہیں کی اور ہم لوگوں کی حمایت ہی میں بیان دے ڈالا صرف اس خیال سے کہ کہیں مجھے صدمہ نہ پہنچے۔

میری بہت ہی چہیتی بھانجی نشی (میامی میں پروفیسر) کی شادی تھی۔ سارا کنبہ جمع تھا۔ مجھ سے اس کے کچھ زیورات کھو گئے، کتنے والے مجھ پر برس پڑے شرمندگی میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ بی بی تڑپ اٹھیں۔ پہلے گھر والوں سے بگڑیں "آپ لوگ علو کو کچھ نہ کہا کریں ...... اور پھر آکر مجھ سے لپٹ گئیں۔ "تم رویا نہ کرو" مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ تمہارے آنسو ہم سے دیکھے نہیں جاتے۔"... بی بی نے ماتھے پہ پیار کیا میری پیشانی دمک اٹھی آنسو گہر بن گئے....

لیکن آج بی بی کے جانے سے میرا طور در آغوش گھر خاموش ہے۔

زندگی نغمہ و آہنگ تھی تیرے دم سے
موت نے چھین لیا کیسے تیرے ہاتھ سے ساز

بس اب تو دل درد کا ڈھیر ہ ہے۔ "بے کار دہکتا ہوا درد، کڑوا درد درد جو نس نس میں جذب ہے درد جو دل کے تاریک شگوفوں" سے رستا ہی ہے۔ دور تک صرف دھواں ہے کہیں بھی سایہ نظر نہیں آتا۔ پورا وجود نیم رنگ ہے اور کچھ بھی نہیں

بیلے کی کلیاں مرجھائی ہوئی ہیں۔ بن کھلے ہی مئی گرم ہوا کے تھپیڑوں سے جھلس گئی۔ میرے وجود میں آنسوؤں کا الاؤ جل رہا ہے۔ ریشم کا پلو نہیں جو آنسو پونچھے ... چاندنی نہیں جو کڑی دھوپ سے اٹھالے۔ آتشِ عزور یاس نہیں جو خود اعتمادی پیدا کرے، شبنم نہیں جو شعلوں سے نکال لے، خاموش مدرسہ نہیں جو مجھے جینے کا سلیقہ عطا کرے۔ چمن آرا نہیں جو مجھے سراپا چمن بنا دے۔

درد کے آنسو جو بھی پونچھ دے وہ اپنا ہے، ہمیشہ کے لیے اپنا ہے، درد کے رشتوں کا جال کرنوں کی طرح بچھا ہوا ہے۔ کرنیں سمٹ جائیں تو انسان آفتاب میں ڈھل جاتا ہے ... میرے ارد گرد دل والوں کا ہجوم ہے۔ فیض صاحب، ایلیس، سبط حسن، ڈاکٹر سرور ذکیہ سرور، آپا، شمشاد، نثار، نشی، بیگم حسن مصطفےٰ، مرضیہ نقوی، بیگم اصغر نواب، حمایت، محسن بھوپالی ... درد والوں کے قافلے میں مسز امداد بھی ہیں اور مسز نظر بھی چکی والی مائی بھی ہے اور احمد بھی، پلنگ بننے والا بھی ہے اور نجمن توا بھی . . . . یہ سب میرے آنسو پونچھ رہے ہیں . . . درد کے رشتوں کا جال کرنوں کی مانند ہے سمٹ جائیں تو زمین پر کروڑوں سورج نکل آئیں۔ ان کی باہنیں زمین کی نسوں میں پیوست ہیں۔ کوشش کے باوجود کاٹی نہیں جا سکتیں . . . . . درد میں گندھے ہوئے انسان تنہا نہیں ہوتے . . . ان کے آنسو، رائیگاں نہیں جاتے . . . . . آنسو قرمزی و بنفشی رنگت میں ڈھل جاتے ہیں۔ جھلسے ہوئے ہونٹوں میں شیرینی گھول دیتے ہیں . . . بی بی تپتی نگاہوں کے لیے آبِ حیات تھی . . . . . اور آبِ حیات تو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

وقت نے آہستہ بہت آہستہ مجھے دل کے رخسار پر اپنا ریشمی ہاتھ رکھا۔ ہرے زخم خشک ہونا شروع ہوئے۔ بکھرے ہوئے خیالات میں یکجہتی پیدا ہونے لگی۔ انسانوں سے محبت کا جذبہ میٹھے پانی کے سوتے کی طرح پھوٹ نکلا۔ علم کے میدان سے رشتہ جوڑنے کی خواہش بیدار ہوئی۔

۔ کراچی یونیورسٹی میں اردو کی جگہ خالی ہوئی ۔ اس زمانے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صدر شعبہ اردو تھے ۔ ہماری ان سے بہت اچھی یاد اللہ تھی ۔ چنانچہ میں نے درخواست گذاری ، انٹرویو ہوا ۔ میں خوش تھی ۔ ساتھیوں نے مبارکباد دی ۔ لیکن ہماری ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی ۔ طلباء کو علم کا نذرانہ پیش کرنے کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی میرا قصور میری ڈگری بن گئی ۔ اردو ڈیپارٹمنٹ کو ڈگری یافتہ " پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی نہیں بلکہ مستقبل میں "بننے والے" پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ضرورت تھی ۔ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر شاہ علی نے میری ملازمت کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ۔ اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ ڈپارٹمنٹ میں "عورت کے لئے سیٹ" کا انتظام کرایا جائے ۔ اور اس طرح مجھے یونیورسٹی ملازمت دیدے لیکن " راز مملکت " سمجھنا تو صرف " فرماں روا " کا حق ہے ۔ معمولی انسان اسے نہیں سمجھ سکتا ۔

مجھے جس وقت پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی تھی اس وقت میرے سارے وجود میں شہنائیاں بجیں تھیں ۔ باپ نے ماتھے پہ پیار کیا تھا ۔ اساتذہ نے محبت کے پھول نچھاور کئے تھے ۔ لیکن آج میں بھیگی آنکھوں اور دکھے دل کے ساتھ یونیورسٹی کی سڑک پر کھڑی تھی نئی ملازمت کی راہ تلاش کر رہی تھی ۔

کچھ عرصے بعد پی آئی اے ٹریننگ انسٹیٹیوٹ میں مجھے ملازمت ملی ۔ انسٹیٹیوٹ کا ماحول بہت خوشگوار تھا ۔ یہاں طلباء کی مختلف زبانوں میں تراش خراش کی جاتی تھی ۔ اساتذہ اور طلباء کے درمیان انتہائی قربت تھی ۔ دونوں ایک دوسرے کے دوست اور ساتھی تھے ۔ مجھے طلباء سے گہری ذہنی لگاوٹ پیدا ہوگئی ۔ ادارہ کے حالات بہت ہی سازگار تھے ۔ اچانک بالائی سطح پہ ہماری طلبی ہوئی ۔ ہمارے خلاف "فرد جرم" پڑھ کر سنائی گئی ۔ " آپ نے طلباء کے ذہنوں کو مسموم کیا ہے ... ' استحصال ' کے معنی

سمجھائے ہیں۔" اجارہ داری" کا مفہوم بتایا ہے۔ محمود بیگ اور دیگر صاحبان ارباب حل و عقد کے سامنے ہماری پیشی ہوئی۔ پی آئی اے یونین کے صدر نے ہماری وکالت کی ہمارے ساتھی اساتذہ نے ہماری حمایت میں ہر قسم کی سعی کی۔ لیکن بے سود فیصلہ میرے خلاف ہوا۔ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لئے پی۔ آئی۔ اے انسٹی ٹیوٹ کے در پہ کھڑی سوچتی رہی۔ نئی ملازمت کا انتظار کرنے لگی۔

اسی زمانے میں سرسید کالج میں پرنسپل کی جگہ خالی ہوئی میں نے حسب دستور یہاں بھی درخواست لگائی۔ اس یقین اور وثوق کے ساتھ کہ اس جگہ کا ملنا تو لازمی ہے۔ اس یقین کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کی سلیکشن کمیٹی کے سربراہ الطاف حسین بریلوی تھے۔ جو صدر ایجوکیشنل کانفرنس بھی تھے۔ الطاف صاحب ہماری' صلاحیتوں' کے بہت ہی معترف تھے۔ سرسید کالج میں انہوں نے ہمارے کئی ایک لیکچر بھی کرائے تھے انٹرویو بورڈ کے سامنے میں پیش ہوئی۔ درخواست دیکھی گئی۔ کچھ دیر گذر جانے کے بعد مجھ سے کہا گیا۔۔۔" آپ تو ماشاءاللہ بہت لائق ہیں۔۔۔۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں اتنے لائق لوگوں کی تو ہمارے یہاں جگہ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں ہم اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ ہم آپ کو انٹرویو بورڈ میں شامل کرلیں۔۔۔۔۔۔

وضعداری، بزرگی اور خوردی کے نقطۂ نظر سے میں نے الطاف صاحب کی بات مان لی انٹرویو بورڈ میں شمولیت منظور کی۔ اور آمنہ کمال کے تقرر پہ صاد کر دیا۔ پھر پی۔ ایچ۔ ڈی، کی ڈگری ہاتھ میں لئے دوسری ملازمت کے لئے راہ تکنے لگی۔

بلوچستان یونیورسٹی میں کرار حسین صاحب وائس چانسلر مقرر ہوئے کرار صاحب علم وفضل کا نشان ہیں۔ ان کی تقرری کا ہر طرف سے خیر مقدم ہوا۔ میں نے بھی انہیں پھول پہنائے۔ بلوچستان یونیورسٹی میں اردو لکچرار کی جگہ خالی ہوئی۔ میں نے حسب دستور یہاں بھی درخواست گذار دی۔ اس مرتبہ یقین ہی یقین تھا۔ کرار صاحب

کیا ۔ میرے شاگرد بہت ذہین اور ذکی تھے ۔ انہیں پڑھانے میں غیر معمولی حظ محسوس ہوتا ۔ سوالات اتنے بلیغ کرتے کہ اگر پروفیسر پوری طرح مسلح نہ ہو تو طلباء کو مطمئن کرنا ناممکن ہوتا ۔ کالج ختم ہونے کے بعد بھی ہم لوگوں کو کام کرنا ہوتا ۔ تعلیمی ادارے کا جو ماحول ہونا چاہیئے وہ سب کچھ موجود تھا ۔ ۔ ۔ ۔ میں بہت مطمئن تھی ۔ اچانک میری بیٹی منی چلی گئی ۔ میری پوری شخصیت بھنور میں پھنس گئی ۔ ہاتھوں سے زیست کی باگ چھوٹ گئی ۔ چاروں طرف آنسو ہی آنسو بکھر گئے ۔ کوشش کے باوجود اپنے طلباء کو کچھ بھی نہیں دے سکی ۔ میں بیمار ہو گئی اتنی زیادہ کہ آخر ملازمت چھوڑنا پڑی ۔

طبعیت جب بحال ہوئی تو مجھے آدم جی سائنس کالج میں ملازمت مل گئی ۔ شیخ صاحب کالج کے پرنسپل تھے ۔ کالج کے ذرے ذرے سے انہیں محبت تھی ۔ اور کالج کا ذرہ ذرہ بھی ان کی قدر کرتا تھا ۔ تنظیمی صلاحیتیں ان پر ختم تھیں ۔ کالج کی فضا "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست" کے مصداق تھی ۔

طلباء کا تعلیمی معیار بہت اعلیٰ تھا ۔ سخت امتحان کی منزلوں سے گذر کر داخلہ ملتا تھا ۔ طلباء میں استدلال کا انداز اور قدرتِ اظہار بلا کی تھی ۔ چاروں طرف حرکت و عمل و علم کی ایک پھیلی ہوئی دنیا تھی ۔ مسلمات ، عقاید اور عقلیت میں تمیز کرنے کی صلاحیت بیدار تھی ۔ جنہیں سنوارنے میں اساتذہ کا بہت بڑا ہاتھ تھا ۔

اساتذہ عموماً طور پر تعلیم کو تجارت نہیں عبادت سمجھ کر ادا کرتے ۔ ڈاکٹر نجم الدین ، پروفیسر امان اللہ ، پروفیسر ماجد ، پروفیسر رضوی ، ڈاکٹر فاطمہ ، ڈاکٹر مشتاق غرضیکہ کالج میں درس و تدریس کا چرچا ہی چرچا تھا ۔ انگریزی کے پروفیسر شمشاد تھے انہیں سیاست ، ادب اور تاریخ پر غیر معمولی عبور تھا ۔ وہ شمشاد قد بھی تھے اور شمشاد رخ بھی ۔ ان کی بیوی نشاط ۔ وہ بھی انگریزی کی استاد تھیں ۔ ان کے علاوہ نثار معین تھے ۔ گو وہ سائنس کے پروفیسر تھے لیکن شمشاد کی طرح ادب و موسیقی و سیاست کے رسیا ۔ ان

سے خاندانی تعلقات کی بنا پہ اور ساتھ ہی اپنی ڈگری کی وجہ سے اردو کی سیٹ ملنے کی یقینی امید تھی ۔ صدر شعبہ اردو ممتاز اور مایۂ ناز نقاد مجتبیٰ حسین تھے ۔ کوئٹے میں ملازمت مجھے ہر عنوان پسند تھی ۔ اول تو یہ کہ میں اپنی بہن مسز زیدی اور بعد میں اپنے بھائی زاہد نقوی کے ساتھ وہاں بہت دن رہ چکی تھی ۔ زاہد نقوی وہاں ریڈیو میں پروگرام منیجر تھے ۔ انہیں موسیقی سے غیر معمولی شغف تھا ۔ میر انیس، کو پڑھنے کا فن جانتے تھے ۔ اس وجہ سے وہاں خوب ہی خوب محفلیں سجتی تھیں ۔ وہاں کی خوبصورت یادیں میرے ذہن میں محفوظ تھیں ۔ وہاں میرے اور بھی بہت سے ساتھی اور دوست تھے جن سے مجھے ذہنی قربت تھی .... بہرحال میری درخواست منظور ہوئی ۔ انٹرویو ہوا ۔ کامیاب بھی ہوئی لیکن تقرر نہیں ہوا ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی بدنصیب ڈگری یہاں بھی آڑے آئی ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے راز ہائے سربستہ کے پیچ یہ کہتے ہوئے کھولے ... " بڑے لوگوں کے درمیان تمہاری جگہ بنانے کے لئے ڈگری نہیں بننے دی گئی .... خیال یہ تھا کہ تمہارے یہاں آنے سے توازن خراب ہوتا ہے ۔" بلوچستان یونیورسٹی کے در پہ ڈگری ہاتھ میں لئے میں سوچتی رہی میرے ریسرچ گائیڈ ڈاکٹر کے ایم اشرف جیسا عالم، فاضل، دانا اور محقق علی گڑھ یونیورسٹی میں ۵۰۰ روپے کی ملازمت نہیں پا سکا تو میں تو ایک ذرہ ہوں اور ذرہ کی حیثیت ہی کیا ۔ بوجھل قدموں کے ساتھ گھر واپس آگئی ۔ ڈگری لئے اور کسی نئی ملازمت کی پھر راہ تکنے لگی ۔

پریمئیر کالج ناظم آباد میں اردو پڑھانے کے لئے لیکچرر کی ضرورت تھی پریمئیر کالج کا شمار ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ہوتا تھا ۔ اس کے پرنسپل ظفر مہدی زیدی تھے ۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین، محنتی، مخلص اور جوہر شناس تھے ۔ وائس پرنسپل عسکری صاحب تھے ۔ ماہر تعلیم تنظیمی صلاحیتوں سے مالا مال ۔ میں نے یہاں بھی ملازمت کے لئے درخواست دی ۔ انٹرویو ہوا ۔ میں کامیاب ہوئی ۔ چنانچہ میں نے پڑھانا شروع

اساتذہ کی شخصیت خانوں میں بٹی ہوئی نہیں بلکہ انتہائی مربوط تھی۔ فکر کی شمعیں ہر طرف روشن تھیں۔ نئے چراغ نئی روشنی بکھیر رہے تھے۔ علم کی گہما گہمی تھی۔

. . . . ایک دن میں کلاس لے رہی تھی کہ اچانک کسی نے یہ کہتے ہوئے چراغ چھین لیا ..... "آج سے آپ کی ملازمت ختم کی جاتی ہے"..... یہ نوٹس پڑھ لیجئے .... آپ کا کسی خفیہ سیاسی جماعت سے تعلق ہے ..... سی۔آئی۔ڈی والا روز روز کالج کا گھیراؤ کرتا ہے .... آپ کے بارے میں بات کرتا ہے ... . . آپ کے خلاف ہمارے پاس Intelligence Report کی رپورٹ ہے۔ ہم آپ کی قابلیت کو مانتا ہے۔ آپ کا شاگرد آپ کو بہت پسند کرتا ہے .... اب ہم اگر آپ کو رکھنا بھی چاہے تو نہیں رکھ سکتا .... ہم مجبور ہے .... سیٹھ لوگوں کا یہ کالج ہے .... ہم کیا کرے ......"

شیخ صاحب ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔ الوداعی پارٹی ہو رہی تھی۔ اساتذہ کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے .... طلبا کی آنکھوں کے کنارے گیلے تھے... میں خاموش تھی ... . . . پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ہاتھ میں لئے آدم جی سائنس کالج کے در پہ کھڑی پھر کسی نئی ملازمت کی راہ دیکھ رہی تھی۔

کالج آف ہوم اکنامکس میں اردو کی جگہ خالی ہوئی میں نے وہاں بھی درخواست گذاری۔ "مجھ سے پہلے میرے افسانے گئے"۔ . . . . حسب دستور انٹرویو ہوا۔ لیکن جواب " " تھا۔ میں کالج سے مایوس واپس جا رہی تھی کہ اچانک ایک سیٹھ صاحب کی صاحبزادی سے ہماری ملاقات ہوگئی ... . ہماری صورت دیکھ کر انہیں ترس آیا۔ اپنے باپ کے کالج میں ہمیں ملازمت کی پیشکش کردی۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر بولیں "ہمارا کالج ذرا نیا ہے ..... آپ کو ذرا کام زیادہ کرنا ہوگا ..... کرلوگی ..... پھر ہاں ... ہماری ممی اکیلی ہے

اگر ہو دے تو آپ اس کے ساتھ تھوڑا گپ شپ بھی کرو۔ اس کا دل بہلاؤ . . . .
آپ کا پیسہ بھی ہم بڑھا دے گی . . . . میں سیٹھ صاحب کی بیٹی کے دلنواز
سخن سن رہی تھی۔ بھیگی آنکھوں اور دکھے دل سے ڈگری لئے پھر نئی ملازمت کا انتظار
کر رہی تھی۔

سیاست سے وابستگی

ملازمت کے دوران میں نے تین سطحوں

یعنی سیاست ، ادب اور ثقافت کے میدان میں کام شروع کر دیا تھا اور ان جمہوری قوتوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرلیا تھا جو صداقت ، ایمان ، علم اور عمل کی جرأت مندانہ داستانیں ہر موڑ پر رقم کرچکی تھیں اور پاکستان میں ایک "آفتاب تازہ" پیدا کرنے کی سعئ مسلسل میں مصروف تھیں ۔ پاکستان کی سیاست سے رشتہ استوار کرنے کے لئے یہاں "مملکت خداداد" کے ذہن کو سمجھنا ضروری تھا۔ جو ایک طویل تاریخی عمل کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا تھا ۔ کیونکہ کوئی تاریخی تجربہ ، مصنوعی طور پر رونما نہیں ہوسکتا ۔"

صدیوں پہلے جب مسلمان اس خطے میں داخل ہوئے

اور انہوں نے اپنی جگہ بنانا شروع کی اس وقت ہندوستان ذات پات جو طبقہ داری لعنت کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا مبتلا ، اقتصادی بد حالی کا شکار ، برہمنوں یعنی بالائی طبقے کے مذہبی تشدد سے دوچار تھا۔ غلامانہ پیدا واری رشتوں کی جگہ جاگیر دارانہ رشتوں کی بیل جڑ پکڑ رہی تھی۔

مسلمان جس وقت ہند کی زمین پر وارد ہوئے

وہ غلامانہ دور سے نکل کر جاگیردارانہ دور میں کم وبیش قدم رکھ چکے تھے۔

یوں تو مسلمان یہاں کئی رُخ سے داخل ہوئے

گو ہر گروہ مسلمان تھا لیکن اسلام کا تصور ہر قبیلے اور ہر گروہ کی نظر

میں مختلف تھا۔ جس کا سلسلہ بحمداللہ آج بھی ہماری رگِ مسلمانی میں جاری وساری ہے ۔ ابن بطوطہ کے مطابق محمود غزنوی جیسے "مجاہد" اور غازی نے اسلامی فتویٰ کی روشنی میں مندر پر حملہ کرنا "عین اسلام" قرار دیا تھی وہ ریت ہے جس پہ بیشتر اسلامی ممالک کے رہنما اور قائد آج بھی عمل پیرا ہیں ۔ "غیر اسلامی" زمین کو اپنا سمجھنا اور بزور شمشیر حاصل کرنا اور اس پہ اپنی فتح کا نشان نصب کرنا ہمارے حکمرانوں کا ہمیشہ "طرۂ امتیاز" رہا ہے ۔ محمد تغلق جیسے فرمانروا نے اسلام کے اصولوں کے مطابق ہندوؤں کا خون بہانا اور پھر انہیں تمغے دینے میں لطف حاصل کیا اور ہندوؤں کو مفلسی کی قبا میں دیکھ کر پرسکون ہوا

H.G. Rawlinson India "A short cultural

History" (London) P-1952 - 230

علاؤالدین خلجی ، محمد بن قاسم ، غیاث الدین نے اپنے مذہبی مشیروں کی مدد سے ہندوؤں کے خلاف ایسے قوانین وضع کئے تاکہ ان کی حیثیت گداگر سے زیادہ نہ رہ جائے ، بلکہ تیمور نے ۱۳۹۸ء میں یہاں تک کہا کہ مسلمان حکمرانوں کو ہندوؤں پہ زیادہ مظالم کرنے چاہیئں ۔ برہمنوں کو چھوڑ کر سب کافروں سے اس لئے جزیہ لیا گیا ۔

Autobiography of Timur 101-Elliot and Dowson

فیروز شاہ تغلق نے جو ۱۳۵۱ء میں دہلی کے تخت پر بیٹھا قرآن کی روشنی میں یہ حکم صادر کیا کہ اگر ہندو جزیہ دینے سے انکار کریں تو انہیں خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا جائے جس کے نتیجے میں کروڑوں ہندو مسلمان ہوئے۔ Cambridge History of India Vol-III- 188

دہلی کے سلطانوں نے اپنے دورِ حکومت کو "مذہبی" انداز میں چلایا ان کے مشیر اور مذہبی پیشواؤں نے قرآن اور سنت کی روشنی میں فتوے دیئے کہ چونکہ ہندو اہل کتاب نہیں ہیں اس لئے کافر ہیں اور ان کی جگہ قرآن کے مطابق دوزخ ہے۔ اگر خدا ان کے سلسلے میں رحمدل نہیں ہے تو حکمرانوں کو کسی قسم کی رحمدلی دکھانے کا حق نہیں پہنچتا۔ A. Dow-The history of Hindustan translated from the persian of Mohammad Farishta(London)1768

مسلمانوں کا دوسرا فکری تانا بانا صوفیوں کے روپ میں ابھرا جو مذہبی تنگ نظری کی جگہ روشن خیالی اور تشدد پسندی کی جگہ مذہبی رواداری اور نفرت و جہل کی جگہ محبت اور الفت کے گیتوں سے دھرتی کی مانگ میں سیندور لگانا چاہتا تھا۔ یہ تحریک دراصل کلیسا، ملائیت اور مذہبی ٹھیکہ داروں کے خلاف تھی اور ریاست کی زیادتیوں کی مخالف تھی۔ کبیر، تلسی داس، شاہ بھٹائی، وارث شاہ، میرا بائی، نے زمین کے ہیرے موتیوں کو سنگھاسن پہ بٹھایا اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل سے فکر کی ایک نئی جہت کا تعین کیا۔

تیسرا رجحان مسلمانوں میں مجدد الف ثانی اور پھر شاہ ولی اللہ کے نظریات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ حضرات اس زمین پر "خلیفہ" ہونے کے ناطے سے حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے متمنی تھے۔

چوتھا سلسلہ فکر مغلوں سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے تہذیبی، سیاسی، معاشی، سماجی نظام اور اس کے اندرونی

تضادات کو نظر میں رکھتے ہوئے دو پالیسیاں مرتب کیں۔ ایک متحدہ ہندوستان جس میں رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر حکومت کا قیام، دوسرے چھوٹے جاگیر داروں کو ایک وسیع جاگیرداری کا حصہ بنا کر شہنشاہ کو "خلیفۃ الارض" بنانا۔

مسلمانوں کی حکمرانی نے ہندوستان کے سماج میں تغیر و تبدل اور روش میں انقلاب پیدا کیا۔ اقتصادی طور پر نئے حکمرانوں نے فتح حاصل کی۔ ہندوستانی سماج کی بڑی اکثریت نے گو کہ روا داری کا مظاہرہ کیا۔ ان کی لائی ہوئی قدروں کو تسلیم کیا۔ لیکن پھر بھی ایسی اکثریت بھی موجود تھی جو ابھی ان اقدار کو دل سے ماننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اقتصادی نظام کے اندرونی تضادات گہرے ہوئے اور حکمراں طبقے کے اپنے تضادات نے بھی رنگ دکھانا شروع کیا۔ انگریز تاجر کی حیثیت سے آچکے تھے۔ اب وہ ہندوستان کی معیشت اور سیاسی نظام پر بھی اپنا شکنجہ کاڑ رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہندوستانی سماج میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستانی فوج نے مسلم حکومت کے خلاف بغاوت کی داغ بیل ڈالی۔ ہندوستانی افواج کی یہ بغاوت برطانوی استبداد کے خلاف عظیم ایشیائی اقوام کی عام بے اطمینانی کی لہر کا ایک حصہ تھی کیونکہ بنگال کی فوج کی بغاوت بلاشبہ ایرانی اور چینی لڑائیوں سے بڑا قریبی تعلق رکھتی ہے۔" "کارل مارکس" اس انقلاب کے دوران صرف ۲۷ ہزار مسلمان دہلی میں قتل کر دیئے گئے۔ ہندوستانیوں کو شکست ہوئی اب مسلمانوں کے سامنے تین راستے تھے

۱۔ اسلحہ جمع کر کے پھر سے سرکار انگلشیہ کے خلاف انقلاب لایا جائے۔

۲۔ انگریزوں کے ساتھ وقتی سمجھوتہ اور مصلحت اندیشی سے کام لے کر ان سے جڑا جائے۔

۳۔ گوشہ نشینی اختیار کی جائے یا ہمیشہ کے لئے انگریزوں کے سامنے سپر ڈال دی جائے۔

انگریز جس وقت ہندوستان میں آئے وہ اپنے ملک کی صنعتی برکات کو بھی ساتھ لائے جس نے ملک میں جاگیرداری رشتوں کی جگہ نئے پیداواری رشتوں کو جنم دیا مشینیں اپنے ساتھ ایک نئی قوت لے کر آرہی تھی جس کا خیر مقدم غالب نے اپنی معرکتہ الآرا غزل میں اس عنوان کیا تھا اور مستقبل کی قوتوں کو یوں دیکھا تھا

"صاحبانِ انگلستاں را نگر" "شیوہ انداز اینہا را نگر"

لیکن انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا سیاسی تسلط قائم کرنے کے بعد شاطرانہ حکمتِ عملی یہ اختیار کی کہ معاشی نظام کی بنیادوں کو تبدیل کرنیکے بجائے اور اسے صنعتی انقلاب کی ڈگر پر ڈالنے کی بجائے ہندوستان کو خام مال کی منڈی میں تبدیل کر دیا اور یہاں جاگیردارانہ نو آبادیاتی نظام کی داغ بیل ڈالدی۔

چونکہ انگریزوں نے سیاسی قوت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ اس لئے ان کی مشتبہ نگاہیں ہمیشہ مسلمانوں کے تعاقب میں رہتی۔ انہیں یہ یقین تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو متحد کرنیکے بعد کسی بھی وقت حکومت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ٹیپو سلطان، سراج الدولہ اور ریشمی رومال کی تحریکیں ان کے اس خیال کو تقویت بخش چکی تھیں۔ اس لئے انگریزوں نے مسلمانوں کو دوسرے درجے کا شہری بنانے اور ساتھ ہی مقامی باشندوں سے لڑانے کی پالیسی کا آغاز کیا۔

سب سے پہلے انہوں نے پرانے مسلمان ریاستی حکمرانوں کی جگہ نئے حکمران مقرر کئے مگر ان کے اختیارات محدود کر دیئے۔ ان ریاستوں کے حکمرانوں کو فوج بنانے کی اجازت تھی۔ لیکن صرف انگریزوں کی مدد کے لئے۔ اس کے ساتھ انہوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو مراعات دینے کی پالیسی اختیار کی۔ مسلمانوں کو مختلف شعبوں سے نکالا جانے لگا۔ انہیں سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں عضوِ معطل بنایا جانے لگا۔

ان حالات میں مسلمان مفکرین نے مختلف انداز میں اپنا لائحہ عمل تیار کیا۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے تحت " دارالحرب " کی پالیسی وضع ہوئی۔ یہ وہابی تحریک تھی۔ لیکن برطانوی امپیریلزم کے خلاف تھی گو اس کا مقصد جیسا کہ کہا گیا سلطنتِ الٰہیہ قائم کرنا تھا۔

دوسرا گروہ سرسید کا تھا جو انگریزوں سے مصالحتی روش اختیار کرکے مسلمانوں کو انگریزی زبان سے آشنا اور صنعتی برکات سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ چونکہ تمام مسلمان مفکرین کے سامنے واضح اقتصادی پروگرام نہیں تھا اس لئے انہوں نے مصلحتاً مذہب کو بنیاد قرار دیا۔ یہ وہ فکری عمل تھا جس نے انگریزوں کو خاصی تقویت دی

اس میں شک نہیں کہ ہر قومی تحریک اپنے ملک کے سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ہی انگریزی سرکار کی " عنایات " کے نتیجے میں قائم ہوئیں۔ کانگریس پر حاوی طبقہ جاگیرداروں سے زیادہ بورژوا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تھا اور مسلم لیگ پر جاگیرداروں اور نوابین کا اثر غالب تھا۔

۱۹۰۶ء میں جس وقت مسلم لیگ قائم ہوئی تو یہ رپورٹ بھیجی گئی " آج اہم واقعہ ہو گیا ... جس کا اثر ہندوستان کی تاریخ پر صدیوں رہے گا ..... ۶ کروڑ مسلمانوں کو باغی مخالفین (کانگریس) کی صفوں میں شامل ہونے سے روک دیا گیا ہے۔" ....

" ہندوستان " منٹو اور مارلے ۱۹۲۴ء ۴۶

انگریزوں کی خواہش کے خلاف وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کا پاٹ چوڑا ہونا شروع ہوا۔ کانگریس کی طرح اس میں بھی سامراج دشمن حلقہ پیدا ہونا شروع ہوا جس نے جمہوری عمل کو بھی آگے بڑھایا۔ انگریزوں کے خلاف کانگریس لیگ

اتحاد ہوا۔ جس میں قائد اعظم نے فرمایا کہ "میں نے تمام زندگی ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کی اور فرقہ واری مطالبات کو کبھی پسند نہیں کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آج یہ اتحاد متحدہ ہندوستان کو جنم دینے میں بہت بڑا حصہ لے رہا ہے ۔"

جنگ کے فوراً بعد ملک عوامی تحریکوں کی لپیٹ میں آگیا ۔ خلافت تحریک شروع ہوئی ۔ علی برادران اور گاندھی جی نے قیادت کی ۔ ہندو مسلم اخوت کا روح پرور سماں زمانے نے دیکھا اس دوران ۱۹۱۷ء کا سوشلسٹ انقلاب روس میں ہو چکا تھا اس کی کرنیں تاریکی کو کاٹ رہی تھیں ۔ نئے خیالات جنم لے رہے تھے ۔ برطانوی سامراج سے لہریں ٹکرا رہی تھیں ۔ برطانوی سرکار کا یہ خواب اور یہ کوشش کہ " مختلف مذہبوں اور نسلوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ انہیں زور شور سے باقی رکھیں ۔ "

" بی ڈی باسو ۔ ہندوستان میں برطانوی عیسائی حکومت کا قیام صہ ۴۷

اسی کے متعلق جان اسٹریچی نے لکھا تھا کہ

" ایسے مختلف عناصر کے پہلو بہ پہلو ہونے سے جو آپس میں برسرِ پیکار ہوں ، ہماری سیاسی طاقت کو تقویت ملتی ہے ۔" جان اسٹریچی ہندوستان صہ ۲۲۵

ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قوت کے سامنے انگریزوں کی سازشیں بے نقاب ہو رہی تھیں ۔ لہریں ساحل تک پہنچ چکی تھیں ۔ منزل سامنے تھی ۔ کہ یکایک ' چورا چوری " کے واقعے سے گھبرا کر عدم تشدد کا سہارا لے کر گاندھی جی نے تحریک بند کرنیکا حکم دے دیا ۔ اس سے انگریزوں کو فائدہ اور قومی تحریک کو نقصان پہنچا ۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اختلافات کی خلیج چوڑی ہو گئی ۔ قومی تحریک کے تضادات جو وقتی طور پر دب گئے تھے ابھر کر سامنے آگئے ۔ تاریخ آگے بڑھی ، تحریک چوڑی ہوتی ۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت انتخابات ہوئے دونوں جانب کے لیڈروں نے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن بے سود ۔

پنڈت نہرو نے اس مقام پر اپنے ایک خط میں واضح کیا کہ

" سارے تجزیہ کے بعد ہندوستان میں صرف دو قومیں رہتی ہیں۔ ایک برطانوی سامراج دوسری کانگریس، جو ہندوستانی قومیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے صرف ایک گروہ کی نمائندہ ہے۔ اس کا عوام الناس سے تعلق نہیں "

خطوط۔ پنڈت نہرو ۱۲۲۔ انگریزی ایڈیشن

پاکستان کی تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے مختلف مفکرین نے مختلف تشریحات اور توجیہات پیش کیں جس میں سے ایک یہ بھی تھی کہ " ایک قوم تاریخی طور پر ارتقا حاصل کی ہوئی۔ ایک استوار جمعیت ہے جس کی زبان ایک ہو۔ جو ایک ہی علاقے میں رہتی ہوں اس کی معاشی زندگی اور نفسیاتی ساخت ایک ہو ...... صرف مذہب قوم کی بنیاد نہیں۔"

" مارکسزم مسئلہ قومیت "

اسٹالن

۱۹۳۷ء تک مسلم لیگ نے اپنی منزل مقصود یہ قرار دی تھی۔ کہ " ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد کرایا جائے اور آزاد جمہوری ریاستوں کا وفاق بنایا جائے " لیکن انگریز اپنی چالوں میں کامیاب ہوا۔ سیاسی حالات نے مختلف رخ اختیار کیا۔ دونوں جانب کانگریس اور مسلم لیگ کے اندر اکھنڈ بھارت اور پاکستان کی تحریک نے زور پکڑا۔ جاگیردار اور بورژوا رہنما قومی مسائل کو صحیح عنوان حل نہیں کر سکے۔ قائداعظم کی متحدہ ہندوستان کی فکر پروان نہیں چڑھ سکی۔ تضادات گہرے ہوئے۔ مذہب اسلام اور دین ہندو نے جھنڈے گاڑ دیئے دونوں جانب " آگ برابر لگی۔ قومیت کی بنیاد مذہب قرار پایا۔ تاریخ آگے بڑھی۔ مذہب کی لے تیز ہوئی جس کی تہہ میں اقتصادی گتھیاں کارفرما تھیں۔ قرارداد لاہور منظور ہوئی، اس قرارداد کی روح میں مجدد الف ثانی سے لے کر شاہ ولی اللہ، جمال الدین افغانی، سرسید، اور علامہ اقبال جیسے مفکرین اسلام کی " روح پرور فکر " کا پرتو نظر آ رہا تھا

تحریک پاکستان کے بطن سے جذبۂ حریت، جذبہ جہاد مسلمانی بیدار ہوا۔ تحریک آگ کی مانند ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں انگریز نے برصغیر کے سینے میں تقسیم کا خنجر پیوست کر دیا۔ یہ پالیسی اس فکر کا منطقی نتیجہ تھی جس نے فلسطین کے سینے کو دو پارہ کیا تھا۔ بہرحال ایک نئی اسلامی مملکت صفحۂ تاریخ پر ابھری۔ یہ تحریک اپنے جلو میں کٹی ہوئی چھاتیاں، بہنوں کا سرنگوں سہاگ، اجڑی گودیاں، معصوم چیخیں، تقدیس انسانی کا بہتا ہوا خون کا دریا لے کر آیا۔ قربانیاں ہی قربانیاں، لیکن یقین کی منزل کڑی، یقین یہ کہ قربانی کا ثمر ہر خالی ہتھیلی کو نصیب ہوگا، آنسو لعل و گہر بنیں گے۔ ہر زندگی کے آنگن میں چاندنی مسکرائے گی۔

پاکستان جس وقت وجود میں آیا یہاں کی معیشت پر جاگیردار، سرمایہ دار، خوانین اور وڈیرے جونک بنے عوام کا خون چوس رہے تھے۔ قید و بند ان کا مقدر تھا، آئینی حقوق، جمہوری طرز حیات اور سیاسی عمل نہ ہونے کے برابر تھا۔ عوام مختلف محاذ پر اس نظام کو بدلنے کے لیے قربانیاں دے رہے تھے۔ پہاڑوں کی سی استقامت کے ساتھ تاریکی سے لڑ رہے تھے۔ صبح کے اجالے کے منتظر تھے۔ کہ ایسے وقت میں قائداعظم جن کی فکر جمہوری اقدار کی آئینہ دار تھی۔ جن کی ذات مسلمانوں کے لیے مشعل راہ تھی۔ جن کا ہر لفظ آہنی استدلال سے مزین تھا۔ وہ صحیفۂ اقتدار کی باگ ڈور پر ہاتھ رکھ کر یہ حلف اٹھا رہے تھے کہ۔ ۔ ۔

From today a Muslim ceases to be a Muslim, and Hindu ceases to be a Hindu in Political sense---------- all shall enjoy equall rights and status as citizen of this country"

پاکستان علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر ہے۔ جسے پایۂ تکمیل تک قائداعظم نے پہنچایا۔ قائد اعظم کی فکر میں علامہ اقبال کی فکر کا یہ تو ہر مقام پر کروٹیں لیتا نظر آتا ہے۔ اقبال نے ۱۹۲۷ء میں زبورِ عجم میں کھلے ہوئے روشن الفاظ میں یہ کہا تھا۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایان کشتِ دہقان خراب
انقلاب
انقلاب اے انقلاب
من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب اے انقلاب

قائداعظم نے اسٹیٹ بنک کے افتتاح کے موقعہ پر جاگیرداروں، زمینداروں، سرداروں کو اس طرح یہ چیتاونی دی کہ پاکستان محنت کش طبقوں کی مدد سے بنا ہے اس لیے کسی بھی شخص کو عوام کے معاشی، سیاسی، تہذیبی حقوق سلب کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

I want to warn the feudal lords and the capitalist that I am not going to give these licences to plunder and exploit the poor peasants and workers In this Society the people would enjoy freedom from exploitation oppression, subjegation of man by man. Where the people would receive the honour & dignity as human being.

"Quaid-i-Azam Centenary Bouquet"

قائد اعظم آزادیٔ فکر، آزادی فرد، آزادی بیان اور آزادیٔ
صحافت کے قائل تھے۔ کیونکہ وہ ایک روشن ذہن انسان تھے۔ جمہوریت اور آمریت
کے فرق کو جانتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جمہوری طرز فکر ۔ بارش ہے جو مٹی میں عطر
بسا دیتی ہے۔ ذرہ ذرہ کو مہکا دیتی ہے۔ احساس بہار کو ہر دل میں جاگزیں کر دیتی
ہے۔ اس کے برعکس آمریت آزادیٔ فکر کو چھین لیتی ہے۔ پھولوں پہ پتھر برساتی ہے،
خوبصورت مناظر کے روپ کو کجلا دیتی ہے۔ انسان کو حسرت و یاس کا مجسمہ بنا دیتی ہے
اس لئے انہوں نے ابتدا سے انتہا تک آزادی تقریر و تحریر اور آزادی فکر و نظر کی قندیل
کو ہمیشہ روشن رکھا تاکہ تاریکی اور جہل کٹے اور اجالا پھیل جائے۔ ایک مقام پر یہ
اس طرح فرمایا

I am alway against any man's liberty being taken away without judicial trial"

Compiler Syed Shamsul Hasan
Royal Book Company Karachi 1976
P - 266

"No, you are the editor of the paper, not I, you know your business better. These are my humble suggestions, it is for you to accept or reject them"

"Jinnah as parliamentarian"
Mohammed Zafar - I.A. Rehmani
& Ghani
Quaid-i-Azam Centenary Bouquet

کسی بھی مہذب معاشرے میں صحافت کو ریڑھ کی ہڈی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ ایک میزان ہے جس پہ حق و ناحق کو پرکھا جاتا ہے، ایک کسوٹی ہے جو کھرے اور کھوٹے کو کستی ہے۔ یہ ایک لَو ہے جو اجالے کو تاریکی سے جدا کرتی ہے۔ حکمرانوں کو جمہوریت کی حقیقی راہ دکھاتی ہے۔

آزادیٔ صحافت کے حقیقی علمبردار کی حیثیت سے قائداعظم نے فرمایا . . . .

"Protect those journalist who are doing their duty and who are serving both the public & the Govt. by criticising the government freely, independently, honestly ------- which is an education for any government"

"Selected speeches & statements of Quaid-i-Azam Mohammed Ali Jinnah"

Complier M. Rafique Afzal

Lahore-1973 P- 73-76

اسلام عدل کو بنیادی ستون قرار دیتا ہے۔ عدل کا لفظ مجرد نہیں۔ اس کا تعلق معاشرتی و معاشی نظام حیات ہے۔ جو ہر لحظہ حق و انصاف کو سیسہ پلائی دیوار بنا سکے۔۔ ظلم کی ٹہنی توڑ سکے مظلوم کی حق رسی کر سکے۔ عدلیہ قوم کا وقار، روشنی کا منارہ، یقینِ حق کا سرچشمہ اور راہ صداقت میں جہاد کا نام ہے۔ اسے اہل معاب، نہیں، اہل ذہل" ہونا چاہیئے

I am always against any man's liberty being taken away without judicialtrial"

Cimpiler Syed Shamsul Hasan "Plain

قائداعظم کی نگاہ بلند اور تخیل چھولوں سے اٹا ہوا تھا۔ اس لئے . . . . .

Royal Book Company Karachi 1976 P-266

آزادی فکر و نظر سے بحث کرتے ہوئے اس طرح روشنی ڈالی اور صحافت کی آزادی کے معنی کیا ہیں اس طرح سمجھائے۔

"No, you are the editor of the paper, not I you know your business better. These are my humble suggestions, It is not be taken away in this fashion, "Jinnah as Parlimentarian" editors Mohd. Zafer- I.A. Rehman & Ghani Jafar- Awami Press - Lahore - P - 82

کسی بھی طبقاتی معاشرہ میں قوم کی بڑی اکثریت کا مفاد ایک مختصر سی اقلیت کے مفاد کے تابع ہوتا ہے۔ اسی سے قومی بے ترتیبی جنم لیتی ہے۔ مساوات کا نظریہ کچلا جاتا ہے... فکر پا بہ زنجیر ہوتی ہے۔ اس لئے نو آزاد شدہ ممالک کے لیے یہ امر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں آزاد قومی معیشت کو فروغ دیں۔

جس وقت تک قوم آزاد قومی معیشت کی تعمیر نہیں کرتی اس وقت تک اس کی سیاسی آزادی بے معنی ہوتی ہے۔ خود اعتمادی جو ایک قوم کا سب سے بڑا اثاثہ ہوتی ہے اس سے وہ عاری ہوتی ہے۔ قوم کے لیے اپنے آپ پر اعتماد ایک لازمی امر ہے۔ اسی کی بدولت ایک قوم اپنے ذرائع اور وسائل کو اپنے طور پر استعمال کر کے باعزت زندگی گذار سکتی ہے۔

کوئی ملک جو بیرونی افواج کے سہارے قائم ہو تو وہ سیاسی طور پر دوسرے ممالک کا کاسہ لیس بن جاتا ہے اور بالآخر وہ آزاد کہلانے کے باوجود کسی بھی ملک کی نوآبادی بن کے رہ جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک آزاد قومی معیشت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی معیشت کے بل پر حکومت قدامت پرستی، جہل پرستی، اور فرقہ پرستی کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے اور ہر راہ پہ آزادی فکر و نظر کے چراغوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ آزادی صحافت کی ضمانت دیتی ہے۔ آزاد صحافت تنقید کے حق کی طالب ہوتی ہے۔ تنقید حکومت کے ذہن کے جالے صاف کرتی ہے اور حکومت کو راہ حق دکھاتی ہے، قوم کو غرور بخشتی ہے۔

قائد اعظم کے پیش نظر یہ تمام اسباب و علل اور محرکات تھے جنھوں نے معاشرے میں جمود اور گھٹن کو پیدا کیا تھا۔ اس کے خلاف وہ جہاد کرنا چاہتے تھے تاکہ ایک صحت مند ایسا معاشرہ قائم ہو جہاں حق و انصاف کا بول بالا ہو، مساوات کا پودا پروان چڑھے اور سر آنگن میں بالغ نظری کے پھول کھلیں۔

قائد اعظم کے بعد قائد ملت ملک و قوم کی قسمت کے مالک بنے۔ قائدِ ملت "مسلمانوں کے درد آشنا" تھے۔ "لہجہ غازی کی تلوار کی مانند تیز" اور "عمل" پاکستان کو عظمت کی چوٹیوں پر کھڑا کرنے کا متمنی تھا۔ اسی جذبے کے تحت وہ اونچی پہاڑی کی ڈھلوان پر سبز پرچم لے

کر کھڑے ہوئے۔ سیاسی جماعت کو منظم کرنے کی خاطر تخلیقی ذہن نے اجتہاد کی راہ اختیار کی۔

۱۔ قائداعظم نے گورنر جنرل بننے کے بعد مسلم لیگ کی صدارت کے فرائض چوہدری خلیق الزماں کے سپرد کر دیئے تھے۔ لیکن قائد ملت لیاقت علی خاں نے وزیراعظم کے عہدے پر ہونے کے باوجود مسلم لیگ کی صدارت قبول فرمائی۔

۲۔ جیسا کہ کہا گیا قائداعظم کی فکر کا خمیر جمہوری روایات سے اٹھا تھا وہ سیکولر ذہن کے مالک تھے اس لیئے انہوں نے قوم کو سیکولر آئین کا روح افزا پیغام دیا۔ تاکہ قوم گمراہ نہ ہو . . . شہید ملت لیاقت علی خاں صاحب نے اجتہاد سے کام لے کر . . . .
اس طرح پیش کیا . . . .

OBJECTIVE RESOLUTION

This constituent assembly representing the people of Pak ------ resolve to frame a constitution for the sovereign independent state of Pakistan ! Wherein the principles of democracy, freedom, equality and social justice as enuncitated by Islam shall be fully observed.

Wherein the Muslims shall be enabled to order their lines in the individual and collective spheres in accord with the teaching and requirements of Islam as setout in the Holy Quran and the Sunnah"

سیاسی مفکرین کا کہنا یہ ہے کہ شہید ملت نے قائداعظم کی جمہوری طرزِ فکر کی جگہ ریاستی اور انتظامی معاملات میں "اسلامی جمہوریت کا اضافہ کیا جو ان کے یا تو اجتہادِ فکر کی دلیل ہے یا" وہ علماء دین کا دباؤ جن کی فکر میں شاہ ولی اللہ کی فکر سموئی ہوئی تھی اور یہ لوگ شہید ملت کے ارد گرد گھیرا ڈال چکے تھے ان کی وجہ سے لیاقت علی خاں انتظامی امور میں" خدا اور اسلام" جیسے متبرک مقدس اور بابرکت ناموں کو ملوث کرنے پر مجبور ہوئے۔ جبکہ عوام کی حاکمیت کسی بھی طور خدا کی حاکمیت سے متصادم نہیں ہے۔

شہید ملت نے بہرحال دستور بنانے کی سعی لاحاصل کی۔ دستور ساز اسمبلی کام کرتی رہی۔ ممبران اسمبلی خصوصاً میاں افتخارالدین اور شہید حسین سہروردی کی جانب سے الیکشن کرانے کی متواتر مانگ کی گئی۔ ایک مرحلے پر یہ بات بھی کہی گئی کہ" آپ چونکہ غیر منقسم ہندوستان کی اسمبلی کے رکن ہیں۔ نئی سلطنت کے وجود میں آنے کے ساتھ اس اسمبلی کی قانونی حیثیت بدل جاتی ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔ عوام سے نیا Mandale لیا جائے اور اس کے بعد حکومت چلائی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ انتخابات عوام کی پختگی ذہن اور سیاسی شعور کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ یہ بات سیاسی انسان ہونے کے ناطے نواب زادہ صاحب کے ذہن میں صاف تھی۔ لیکن یہاں کی صورتِ حال بقول نواب اکبر بگٹی "کچھ یوں تھی کہ" پاکستان میں پانچ قومیتیں آباد ہیں۔ سندھی، بلوچی، پٹھان اور بنگالی، پنجابیوں نے طے نہیں کیا ہے کہ وہ قومیت ہیں یا مسلمان۔ صرف ہندوستان سے آئے ہوئے بس صرف مٹھی بھر مسلمان ہیں"

لیاقت علی خاں ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمان تھے۔ ان کے خلاف گاہے بگاہے مختلف انداز سے سازشوں کے جال بنے جارہے تھے۔ قومی رہنما انہیں اپنا لیڈر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ زمین سے پرانا رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے جڑوں تک ان کی رسائی نہیں تھی بالائی سطح پر صرف افسر شاہی جس کی تربیت سامراج نے اپنے نوآبادیاتی

مقاصد کے لئے کی تھی وہ اقتدار میں شریک ہونے اور اس کا حصہ بننے کے لئے تمام تر لیاقت علی خاں کے ساتھ تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ جاگیر دار طبقے سے بھی رشتہ بنتا تھا اور وہ بھی ہوس اقتدار کا مریض تھا۔ چنانچہ وہ بھی لیاقت علی خاں کے ساتھ تھا۔

لیاقت علی خاں پارلیمانی طرز فکر سے آشنا تھے۔ چنانچہ انہوں نے عوامی دباؤ میں آ کر صوبائی انتخابات کرائے۔ افسر شاہی نے اپنا کرتب دکھایا ہر صوبے میں جاگیر دار اور وڈیرے منتخب ہوئے۔ اقتدار میں بیوروکریسی کی شمولیت لازمی قرار پائی۔ ہر وہ حکومت جو عوام سے خائف ہوتی ہے وہ دو قوتوں کو جنم دیتی ہے ایک بیوروکریسی دوسرے فوج دونوں ہی کو خوب خوب منظم کیا گیا۔ اقتدار میں برابر کا شریک کیا گیا۔ تاکہ عوام کے غیظ و غضب کی آگ فوج کی سنگینوں کے ذریعے "محل سرا" تک نہ پہنچ پائے۔ مرکز میں الیکشن نہیں کرائے جا سکے۔ بہت سی "مجبوریاں" آڑے آئیں۔ پارلیمانی نظام حیات قائم کرنے کا وہ مقصد جو قائداعظم کے سامنے تھا۔ وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ نائو منجدھار میں ہی رہی۔

کسی بھی ملک کی داخلی پالیسی اس ملک کے حکمراں طبقے کے طبقاتی کردار سے متعین ہوتی ہے۔ اگر بالائی طبقہ برسر اقتدار ہے۔ تو داخلی پالیسیاں اسی طبقے کی "خوشیوں"، اور مفادات کو نظر میں رکھ کر مرتب کی جاتی ہیں۔ یعنی اگر عوام ناخوش ہوں تو کم از کم "خواص" خوش باش دو آباد اور پھلتے پھولتے آگے بڑھتے رہیں۔ خارجہ پالیسی داخلی پالیسی سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ اقتدار بالائی قوتوں کے ہاتھ میں ہو۔ داخلی پالیسیاں وہ مرتب کر رہے ہوں اور خارجی سطح پر وہ ان قوتوں کے ہمنوا ہوں۔ جہاں عوام مسند نشین ہوں۔ کبھی مصلحتوں کی بنا پر، اگر یوں ہو بھی جائے تو وہ عمل اضطراری مصنوعی اور غیر فطری کہلاتا ہے۔

قائد اعظم کی قد آور شخصیت کے سامنے بڑے بڑے ارادے کانپ کر ٹوٹ چکے تھے۔ شہید ملت کے اردگرد بیوروکریسی اپنا حلقہ اثر بڑھانے کی فکر میں مبتلا اور اقتدار میں شریک ہونے کے لئے بے چین تھی۔

" داخلی سطح پر وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین اور ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین لیاقت علی خاں کے خلاف گروپ بندی میں مصروف تھے۔ وزیر خزانہ غلام محمد، وزیر خارجہ سر ظفر اللہ لیاقت علی خاں کے ساتھ وقتی طور پر اپنے مفادات کی نگہبانی کے لئے جڑے ہوئے تھے ادھر فوجی سطح پر ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ جنرل رضا ۔ ۱۹۵۱ ۔ C بننے کے لیے جال بُن رہے تھے۔ ایئر فورس اور نیوی کی جانب سے حکومت کے Nationalisation کے پروگرام پر اعتراضات وارد ہو رہے تھے۔ جنرل محمد ایوب خاں جو اس وقت 14th Div کے GOC, تھے۔ Adjitant General بنا کر لائے گئے تھے۔ معاشی طور پر ملک کو خود کفیل بنانے کے بجائے اور انتظامیہ کو صحیح طور پر چلانے کے بجائے برطانوی سرکار پر انحصار کر نیکی عادت ثانیہ کے تحت فوج کے کل پرزوں کو درست کرنے کی خاطر امریکہ کی جانب گرسنہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

پاکستان کو آزادی کے فوراً بعد ہی مسلہ کشمیر جو اسے برطانیہ سے تحفے میں ملا تھا۔ اس کے حل کے لئے بڑی طاقتوں کی امداد کی ضرورت تھی اس وقت کے سیاستدانوں نے ماضی کے تعلقات اور نظریاتی ہم آہنگی کی بنیاد پر برطانیہ اور امریکہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بین الاقوامی سطح پر برطانیہ کا غروب نہ ہونے والا آفتاب تمام خام مال کی منڈیوں میں غروب ہو چکا تھا آزادی اور قومی جدوجہد نے انہیں بوریا لپیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس خلا کو پر کرنے اور قومی جدوجہد آزادی کے ابال پر بند باندھنے کے لیے دوسری سامراجی طاقت کی ضرورت تھی جو اس خلا کو بطریق احسن پر کرے اور عوامی امنگوں کو کچل کر سامراجیت کی آغوش کو آسودہ کرے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جنوبی ایشیا میں امریکی پالیسی کے خدوخال زیادہ واضح نہیں

تھے۔ فروری ۱۹۴۵ء میں مالٹا میں تین بڑی طاقتوں امریکہ، سوویت یونین اور برطانیہ نے اپنے حلقہ ہائے اثر کے متعلق جو فیصلے کئے تھے اس میں امریکی صدر روز ویلٹ نے ایشیا اور بحرالکاہل کے خطے میں اپنے مقبوضات پر کڑی نگاہ رکھنے کی واضح نشاندہی کی تھی۔ وقت گذرنے کے ساتھ امریکہ جدید نوآبادیاتی طاقت بنا اور جنوبی ایشیا کی پالیسی پر نگاہ التفات پڑنے لگی لیکن واضح لائحہ عمل مرتب نہیں ہو سکا۔

چنانچہ پہلی ستمبر ۱۹۴۷ء میں فنانس منسٹر غلام محمد نے امریکی Charged Affairs کی خدمت میں جب یہ درخواست گزاری کہ انہیں Informal talk کرنا ہے۔ تو امریکہ کی جانب سے واضح جواب نہیں ملا اس کے بعد فیروز خاں نون "good will" مشن پر گئے، اور امریکہ کے حضور یہ میمورنڈم گذارا۔

Pakistan will have to look for freind and the trusted friend. They could have like Turkey is U.S.A. ---------- if U.S.A. & Britain help Pakistan to become strong the people of Pakistan will fight to the last man against Communisim to keep their freedom.

Sulzberger - Long Row
Memories & Diaries 1934-London

بہر حال امریکہ کو کئی حوالوں سے معاشی اور دفاعی ضروریات کا احساس دلایا گیا بالآخر جب امریکی محکمۂ دفاع نے اس علاقے میں اپنی دفاعی منصوبہ بندی کا آغاز کیا تو اس

بات کو تسلیم کیا گیا کہ جنوبی ایشیا میں پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو سوویت یونین کے خلاف دفاعی نظام میں ان کے کام آسکتا ہے۔ یعنی پاکستان کی اہمیت ان کی نگاہ میں سوویت یونین کے ارد گرد دفاعی حصار قائم کرنے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئی۔ جبکہ نوزائیدہ ملک ہونے کی حیثیت سے پاکستان امریکہ کی ترجیحات میں اس وقت کہیں نہیں تھا۔

شہید ملت نے داخلی اور خارجی حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے تین پالیسیوں کی بنیاد ڈالی۔ "کشمیر کے مسئلہ کے حل"، "چین سے دوستی" "امریکہ کے ساتھ دوستی" امریکہ کی رضا مندی کے بغیر قائد ملت لیاقت علی خاں نے یہ سمجھ کر کہ چین ایشیا کی اہم ترین قوت ہے اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور تعلقات استوار کئے یہ ان کا انتہائی اہم کارنامہ ہے چین سے پاکستان کے تعلقات قائد ملت کے مرہون منت ہیں۔ امریکہ کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی خاطر روس سے آیا ہوا دعوت نامہ "To be or not to be" کی نذر ہو گیا۔ کیونکہ اس دعوت نامے کی قبولیت میں امریکہ کی ناراضگی کا خدشہ مضمر تھا۔

" مسلمان ملک ہونے کے ناطے مسلمانوں کا کمیونزم کے قریب جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ کمیونزم کے اصول "اسلامی قوانین" کے منافی ہیں ...... یہ عین ممکن ہے کہ ہندوستان اپنے حالات کی وجہ سے کمیونزم کی گود میں چلا جائے۔ لیکن اس وقت پاکستان مشرق وسطیٰ میں اس صورت حال سے بچانے کے لیے آخری bulwark ثابت ہو گا۔ امریکہ کو چاہئیے کہ پاکستان کو اقتصادی اور فوجی سامان سے لیس کرے تاکہ پاکستان ہر چیلنج کا مقابلہ کر سکے۔

The charge d' Affiars in Karachi

(Lewis to Marshall) 26Oct-1947 F.R.1947

واشنگٹن کے دورے پر جس وقت شہید ملت گئے انہوں نے پاکستان کی خوشحالی اور ترقی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر ممکن طریقے پر اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح پاکستان جیسے ٹوٹے اور شکستہ قالب میں جان آجائے اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اور اس کی خود مختاری

اور سالمیت باقی رہے اس کے لئے امریکی پالیسی کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے ایک مقام پہ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ،،

If your country will guarantee our territorial integrity, I will not keep any army at all.

Records of the Military Advisor to N.E.A. 19 May, 1948

Draft of a report on "Need for SANACC Appraisal of possible U.S. military interest in South Asian Region

شہید ملت کے روس نہ جانے کا خیر مقدم امریکہ میں خوب خوب ہوا۔ پاکستان کی افسر شاہی جو بہت پہلے اپنے مفادات کی نگرانی کے لئے امریکہ سے پینگیں بڑھا چکی تھی اور شہید ملت کے اردگرد حصار بنا چکی تھی اس کے لیے یہ زریں موقع تھا کہ فائدہ اٹھائے۔ اسی فکری تانے بانے کے پس منظر میں ۳ر جون ۱۹۴۹ء میں اسکندر مرزا سکرٹری منسٹری آف ڈیفنس میجر جنرل افتخار خاں کمانڈر 10TH DIV مسٹر غلام محمد امریکہ سے اسلحہ کی خرید کے لئے روانہ ہوا۔ غلام محمد نے امریکہ کو خوش کرنے اور ان سے ساز باز کے لیے ہر ہتھکنڈا اختیار کیا۔

Informally and repeatedly declared their desire to associate themselves closely with U.S. in long-range defence planning. Records of the Military Advisor to N.E.A. 14 Nov., 1949

شہید ملت امریکہ سے دو شرائط پر دوستی کے حق میں تھے ۱۔ کشمیر ۲۔ پختونستان۔
جس وقت امریکہ نے ان شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا اس وقت شہید ملت نے کوریا میں فوج بھیجنے سے انکار کر دیا اور اس کے برعکس چین کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ یہ انداز فکر نتیجہ تھی اس جمہوری طرز حیات کی جس کے وہ تمام زندگی مبلغ رہے اور پارلیمنٹری ڈیماکریسی قائم کرنے اور عوام کو سیاسی حق دینے کے فیصلے کے پابند رہے۔

امریکہ بہر حال کسی نہ کسی صورت اور برطانیہ "خصوصی وجوہات کی بنا پر شہید ملت سے ناخوش تھا اندرونی سطح پر ایک" مخصوص گروہ" کی نظر میں شہید ملت کا جمہوری رخ حیات کھٹک رہا تھا۔ گو وہ سختی حالات کے شکار ہونے کے نتیجے میں امریکہ کی حمایت حاصل کرنے میں بہت آگے نکل گئے۔ لیکن پھر بھی اپنی خود مختاری سالمیت اور جمہوری طرز کو بچانے میں وہ پیش پیش رہے۔ یہی وہ بات تھی جو بالائی قوتوں اور ان سے جڑے ہوئے مخصوص گروہ، کو ناگوار گذری۔ جس کے نتیجے میں لیاقت علی خاں کی حیات کا چراغ گل کر دیا گیا۔ سازش کی تفتیش کی کوئی بھی گرہ کھل نہیں سکی۔ بہر حال اتنا ضرور ہوا کہ غلام محمد، اسکندر مرزا اور دیگر ساتھیوں نے شہید ملت کی وفات پر سکون کا سانس لیا۔

"I got the impression that they were all feeling relieved" Ayub Khan - "Friends not Master"

شہید ملت کی وفات کے بعد پاکستان کی تاریخ دوراہے پر کھڑی ہو گئی۔ اب یہ طے ہونا تھا کہ آیا پاکستان میں پارلیمنٹری ڈیموکریسی رہے گی یا "کسی دوسری طرز کی حکومت" قائم ہو گی۔ امریکہ مخصوص" افراد" یا گروپ" کو عطیات دے گا یا عوام کی قربانیوں اور اس سیاسی شعور کا جس کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا ہے۔ اس کا احترام کرتے ہوئے عوام سے حق رائے دہی طلب کرنیکی بات ہو گی۔

غرضیکہ غلام محمد صاحب کی " نیک خواہشات "کے نتیجے میں داخلی اور خارجی سطح پر وقت کے ساتھ ساتھ یہ طے پایا کہ حکومت میں لانے یا آنے کے لئے خواہ وہ " فرد" ہو یا " گروپ" امریکہ کی رضامندی لینا ضروری ہے۔ جس ریت پر بحمد للہ آج تک ہمارے حکمراں سختی سے عامل ہیں۔

اس وقت کے اقتدار کے ڈھانچے میں افسر شاہی کے نمائندے اسکندر مرزا، فوج کے سربراہ ایوب خاں، وزیر خارجہ ظفر اللہ اور خارجہ سکریٹری اکرام اللہ اور سکریٹری جنرل چودھری محمد علی تھے۔

مختصر یہ کہ ہوسِ اقتدار کی خوفناک جنگ، جوڑ توڑ کی سازش کا دور شروع ہوا جان لیوا زہر ملک کے رگ و پے میں سرایت کیا جانے لگا، بحرانوں نے جنم لیا۔ ہر تجربہ ایک نئے بحران کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ملک میں پہلا بحران اس وقت آیا تھا جب مسلم لیگ کے مقابلے میں حسین شہید سہروردی اور افتخار حسین ممدوٹ نے اپوزیشن کو ایک باقاعدہ شکل دینے کی کوشش کی تھی۔ افسر شاہی کے حلقوں نے ان کی اس جدوجہد کو حب الوطنی کے منافی محمول کیا تھا۔ دوسرا بحران شہید ملت کے قتل کے بعد اس وقت رونما ہوا جب افسر شاہی نے سیاست دانوں پر سبقت حاصل کرلی۔ وزیر اعظم ناظم الدین برخاست ہوئے۔ دولتانہ بے ٹھکانے ہوئے۔ غلام محمد فیل مست بنے، تہذیب و تمدن روندے گئے۔ شعور پہ بجلی گرائی گئی، آئین کی دھجیاں بکھیرنے کی "بابرکت" ریت ڈالی گئی۔ اسکندر مرزا نے کنٹرولڈ ڈیماکریسی کا کرتب دکھایا۔ "مارشل لا کے سنہری باب" کی داغ بیل ڈالی گئی۔ آئین سے بے آئینی، جمہوریت سے آمریت کی جانب سیاسی حکمراں ٹولہ مسافت کی منزلیں طے کرنے لگا۔ محنت کشوں کی تحریکیں خون میں نہانے لگیں۔ آذر کے نقوش کھلانے لگے۔ آوازِ حق دبانے کے لئے عبادت سمجھ کر قزاق اجل میدان میں کود پڑے۔ شوق کا بازار سرد ہوا۔ تخلیق کے معبد سنگسار ہوئے فکر پر پہرے بیٹھے، منصور دار پر چڑھے، سقراط نے زہر کا پیالہ پیا، عیسیٰ صلیب کی نذر ہوئے حسن ناصر قلعے کی آہنی سلاخوں کے پیچھے جہل کا لقمہ بنا۔ حسن ناصر کی خطا اور اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ محنت کشوں سے پیمانِ وفا باندھ چکا تھا۔ کسانوں کو جاں فزا شربت پلانے کے لئے بے چین تھا۔ ہر افسردہ جاں کو حیات بخش جام دینے کی تڑپ میں مبتلا تھا وہ بہت عظیم تھا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی جس نے کبھی

کانگریس کے ساتھ جبڑ کر اور کبھی مسلم لیگ کی حمایت کر کے مزدوروں، کسانوں، طلباء اور دانشوروں کے قافلہ عزم کی قیادت کی تھی۔ انگریزی سامراج کے خلاف جہاد اکبر کا فریضہ انجام دیا تھا حق خود اختیاری کے اصول کے تحت پاکستان کی حمایت میں نعرہ زنی کی تھی۔ پاکستان اور ہندوستان میں جاگیرداروں اور رجواڑوں کے خاتمہ کی بات کی تھی۔ قومی اور بیرونی سرمائے کی ضبطی کی بات کی تھی۔ قومی خود مختاری کے اصول کے تحت صوبوں کی خود مختاری کی جنگ کی تھی۔ جمہوری و ترقی پسند قوتوں کو ہر محاذ، ہر موڑ اور ہر گام پر نیو کلونیل ازم کے خلاف صف آرا کیا تھا۔ فرقہ واریت کے زہر کو کھینچ کر محبت کی امرت بہانے کی ہر سعی میں محنت کشوں کے ساتھ جبڑ کر ان کی قیادت کی تھی حسن ناصر کی حیات کا چراغ اس قصور میں بجھا دیا گیا کہ اس نے بجھے ہوئے دلوں میں تیل ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ حسن ناصر شہید ہوا۔ انگریز اور امریکی سامراج کی پروردہ حکومت نے رنگ سحر کو کجلا دیا .... لیکن کاروانِ شوق کا شوق اور بڑھا۔ درختوں کی شاخوں پر سروں کے چراغ جل اٹھے۔ چراغ بجھتے جلتے تاریکی پر وار کرتے اجالا پھیلاتے چلے جا رہے ہیں۔ منزل کی جانب رواں دواں ......

بہر حال بالائی دنیا میں گھناؤنے اور کریہہ کھیل رچے گئے۔ ڈراموں کا باب در باب کھلا۔ اصل بات یہ کھلی کہ پاکستان کے اصل حکمراں اب تک جاگیردار تھے۔ سرمایہ دار کو اس میں جگہ نہیں ملی تھی حالانکہ کوریا کی جنگ کے نتیجے میں وہ خوب پختہ ہو چکا تھا۔ اس کا دائیں بازو نوکر شاہی جو اپنے قدم پہلے ہی جما چکا تھا اقتدار سے پوری طرح فیض یاب نہیں تھا۔ چنانچہ بیرونی سرمایہ دار امریکہ کی سرپرستی حاصل کی گئی۔ تاکہ حکومت کا قلع قمع کیا جانا آسان ہو جائے۔ چنانچہ مختلف ناگ لہراتے ہوئے نکل پڑے اور ڈگڈگیاں بجانے والے سامنے کر دیئے۔ اور اپنی سیاسی و اقتصادی طاقت کو بڑھانے کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ جاگیرداروں کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے "زرعی اصلاحات"

کی بات چلی۔ لیکن جاگیرداروں نے جلد ہی معاملے کو بھانپ لیا۔ چنانچہ سمجھوتہ ہوا جس کے نتیجے میں اب صرف جاگیردار نہیں بلکہ سرمایہ دار فوجی اور سول افسر شاہی ملک کی حقیقی مالک اور تخت کی وارث بن گئی۔

یہ بات روز روشن کی طرح صاف ہے کہ ہر طبقہ اپنے مفادات کے پیش نظر تاریخی، معاشی اور سیاسی حالات کے تحت نظریہ وضع کرتا ہے اور اس نظریے کے ذریعے سیاسی و معاشی پروگرام شروع کرتا ہے اور پھر اس فلسفۂ حیات کو عملی شکل دیتا ہے۔ پاکستان کے حکمراں طبقے نے سامراج کی خوشنودی کے تحت سیاسی سطح پر پہلے "کنٹرولڈ ڈیماکریسی" اور پھر "بی ڈی سسٹم" کا سہارا لیا۔ اس کے دو پہلو تھے پہلا یہ کہ انتخابات کا نام رہے یعنی دنیا کی جمہوری حکومتوں سے بھرپور رہے۔ کیونکہ مارشل لا کی حکومت بہر حال دھرتی کے نام پر دھبہ ہوتی ہے۔ دوسرا پہلو مد نظر یہ تھا کہ سیاست کے جمہوری عمل سے عوام کا رشتہ کاٹ کر بغیر مسلک و مقصد و منشور "فردی سیاست" اور محلہ کی "برادری" کی سیاست کو رواج دیا جائے۔ پھر چند مہروں کو توڑ کے دیگر گردنیں جھکانے پر مجبور کر دیا جائے۔ ایوب خاں نے بی ڈی کے انتخابات کا اعلان کر دیا۔

انتخابات کے اس فیصلے نے محنت کش عوام کو جن کے سروں پر گرم سلاخوں کے شامیانے تان دیئے گئے تھے اور جو سامراجی اور سرمایہ کے جوئے تلے پس رہے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ڈرامے کے خدوخال دیکھے۔ مختلف سیاسی جماعتوں نے انتخابی محاذ بنایا۔ گو یہ اتحاد انقلابی جماعتوں کا متحدہ محاذ نہیں تھا۔ جس میں محنت کشوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی ہو لیکن بہر حال جمہوری سیاسی مطالبات ان کا مسلک تھا۔ عوام نے اس کا جی جان سے خیر مقدم کیا۔

حزب اختلاف نے اپنا امیدوار محترمہ فاطمہ جناح کو منتخب کیا۔ لیکن یہاں بی ڈی نظام کے خلاف گھبرا گئے۔ حکومت کے پروردہ مولویان دین اور قاضی حضرات کی طلبی

ہوئی، توڑے نذر ہوئے، گردنیں جھکیں، مفتی حاضر ہوئے، عورت کا انتخاب میں حصہ لینا ازروئے قرآن و سنت جائز نہیں،، سیاسی جماعتوں کے اتحاد کے پیچھے ذی شعور عوام کی قوت کا سمندر تھا جو کسی بھی فتویٰ فروش مولوی کے دام میں آنے کے لئے تیار نہیں تھا محترمہ فاطمہ جناح کے نام کا اعلان ہوتے ہی دریا کا بند ٹوٹ گیا۔ ''شہریاروں،، کو نیچا دکھانے کے لئے سرفروشوں کے قافلے نکل پڑے۔

میرا رشتہ عوامی تحریکوں سے مضبوط ہو چکا تھا۔ محمود الحق عثمانی، محمود علی قصوری، خان عبدالولی خان، غوث بخش بزنجو کی شعلگی ذہن اور سیاسی بلند نگہی میرے خالی دامن کو مالامال کر چکی تھی۔ سیاسی کارکنوں نے اپنے انقلابی عمل اور انقلابی فلسفے سے میرے ذہن کی تطہیر اور میرے عمل میں روح پھونک دی تھی۔

اب متحدہ محاذ قائم ہو چکا تھا۔ سکرٹریٹ میں شہزادی عابدہ سلطان چیرمین اور نیپ کی جانب سے میں جنرل سکرٹری مقرر ہوئی۔ نیز آفتاب بیگم، بیگم اختر سلمان عثمانی صاحب جسٹس لاری اور دیگر رہنماؤں کی سرکردگی میں ہم لوگ طوفانی دوروں میں مصروف تھے۔ لانڈھی، کورنگی ملیر، محمود آباد، بنس روڈ غرضیکہ کوئی علاقہ ایسا نہیں تھا جہاں لاکھ۔ ۲ لاکھ کا مجمع دیکھنے اور سننے کو نہ ملا ہو۔ ہر طرف عوام کا شعور عظمت کی سرحدوں کو چھو رہا تھا۔ تین چار بجے رات تک جلسوں میں تقریریں کرتا، جلوس نکالنا ہمارا معمول تھا۔ عوام کے بے پایاں خلوص، جوش اور محبت نے ہمیں حوصلہ اور شعور بخشا اور ہم دم لے کر عوام کے قدموں سے قدم ملا کر آگے بڑھتے رہے تحریک کا پاٹ چوڑے سے چوڑا تر ہوتا جا رہا تھا نعرے فلک شگاف بن رہے تھے۔ حضرت جوش ملیح آبادی کے یہ زریں الفاظ فضا میں گونج رہے تھے۔

'' تارے لرز رہے ہیں سویرا قریب ہے ''

جلسوں کا روح پرور سماں اس وقت بھی نگاہوں کے سامنے ہے۔ لیاقت آباد اس وقت کا لسنین گراڈ تھا۔ کچھار کھانے والے درندے ان سے گھبراتے اور بپا ہوئے

ان کے ارد گرد جمع رہتے تھے۔ یہاں کے جلسے میں محترمہ کی آمد متوقع تھی۔ ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر سامنے تھا۔ ار ۵ ار لاکھ انسانوں کا مجمع تھا۔ اچانک اعلان ہوا ،، محترمہ کسی مجبوری کی بنا پر یہاں نہیں آسکیں گی۔ انہیں کسی اہم ترین میٹنگ میں شرکت کے لئے لاہور جانا ہے ،، جوش ٹھنڈا ہوگیا۔ بے چینی اور اضطراب نے ڈیرا ڈالا۔ قرعہ فال " میرے نام نکلا۔ ابتدا میں گھبرائی مائیک پر آتے ہی بات اس شعر سے جونہی شروع کی۔

ے ہمارے پھول ہمارا چمن ہماری بہار
ہمیں کو جا نہیں ملتی ہے آشیانے میں

یوں محسوس ہوا جیسے پھولوں کی بارش کا موسم آگیا۔ تپے " ہوئے ہونٹ، گرسنہ نگاہیں تشنہ لبوں نے میرے حق میں ہاتھ بلند کرکے نعرے لگائے۔ یہ وہ ہاتھ تھے جو سرمئی، بنفشی، قرمزی دہاتی اور لال جامے تیار کرتے ہیں لیکن ان کے بچوں کے جسم پہ درد کے پیوند ٹکے ہوئے ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو " قصر ناز ،، کو پتھر سے کاٹ کر تعمیر کرتے ہیں لیکن سونے کے لیے پتھر کے فرش ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو کھیتوں، کھلیانوں، کارخانوں میں تخلیق کی گنگا جمنا اپنی کھردری انگلیوں کے پوروں سے بہاتے ہیں۔ لیکن ان کی بچیوں کے ہاتھ پیلے نہیں ہوتے اس لیے کہ وہ جہیز نہیں اکٹھا کر سکتے۔ ان کے بچے بڑی بڑی لمبی لمبی موٹروں کے سامنے چنبیلی، بیلا اور جوہی کے ہار بیچتے ہیں لیکن خود ہار نہیں پہنتے۔ ڈگری لے کر پھرتے ہیں لیکن " سفارشی ،، نہ ہونے سے گاڑیاں صاف کرتے ہیں۔ لیکن ان کا شعور جوان ہے یہ اس بوڑھے نظام کو چکنا چور کیے بغیر آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ لوگوں کے ارادے یکجا ہوں تو بڑی سے بڑی طاقت کو اکھاڑ پھینکنا مشکل نہیں ہوتا۔ فضا مہک رہی تھی۔ بوجھل قدم مضبوط ہوئے، خالی ہاتھ بھرے۔ اور تشنہ لبی محبت کے جام چھلکانے لگی۔ فضا میں نعرے گونج رہے تھے۔ ظلم آج نہیں تو کل مٹ کر رہے گا۔۔ آج نہیں تو کل ساتھی۔ آج نہیں تو کل۔

دوسرا جلسہ متحدہ محاذ کی جانب سے ہیبل پارک میں منعقد ہوا۔ زمین تو کیا ڈال ڈال

پات پات پر انسان ہی انسان نظر آرہے تھے۔ جلسے والوں کا موڈ بتا رہا تھا جیسے آج ہی یہ غیر مہذب حکومت کی دھجیاں بکھیر کر۔ ظلم کی قبا کو تار تار کر کے، مگر اسی کے ہاتھوں کو توڑ توڑ کر کلی کلی مسکرانے والا نظام لے آئیں گے۔ ناحق کی جگہ حق کا نظام قائم کر کے رہیں گے۔

اسٹیج پر جسٹس لاری، محمود الحق عثمانی، محمود علی قصوری، جی ایم سید سید علی نقوی، شہزادی عابدہ سلطان، نیر آفتاب، بیگم اختر سلیمان اور دوسرے سیاسی رہنما، کارکن موجود تھے۔ جلسے کے کنوینر مایہ ناز مقرر جسٹس لاری تھے۔ میرے نام کا سب سے پہلے اعلان ہوا مجمع نے پرتپاک نعروں سے میرا خیر مقدم کیا۔ مائیک پر آکر ابھی میرے منہ سے دو چار جملے نکلے ہی تھے کہ پورا پارک اندھیرے میں ڈوب گیا۔ بجلی کے تار کاٹ دیئے گئے' لاٹھی چارج ہوا۔ چاروں طرف تلواریں چمکنے لگیں۔ غلیظ چہروں اور درندہ صفت حکومت کے پروردہ انسانوں نے آگ لگا دی۔ پنڈال شعلوں کی زد پر تھا۔ کاظم اور ان کے بڑے بھائی حسین امام میرے نزدیک بیٹھے تھے وہ مجھے اور بیگم اختر سلیمان اور عابدہ سلطان کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ مقدمہ چلا حکومت نے ہمارا پاسپورٹ ضبط کیا۔ جائیداد یعنی ایک چھوٹا سا گھر تھا وہ بحق سرکار ضبط ہوا۔ ایک کے بعد دوسرے مقدموں میں پیشی ہوئی۔ مختلف بریگیڈیر صاحبان نے جواب طلبی کی۔ آمریت نے سرزنش کا ہر حربہ آزمایا۔ بات صرف اتنی تھی کہ باطل حق کی زد پر آکر تلملا اٹھتا ہے۔ اندھیرا روشنی کی تاب نہیں لا سکتا۔ عوام کی بلند ہمتی، بلند نگہی اور بلند سیاسی شعور نے حکمرانوں کو یہ باور کرا دیا کہ عوام نے ان سے طاقت چھیننا شروع کر دیا ہے۔ آگ کو فاصلے سے بھانپ کر اور خود کو جلتا دیکھ کر مٹھی بھر افراد کے بل پر بنی ہوئی حکومت نے سنگینوں کا سہارا لیا اور اس کی چھاؤں میں انتخاب کا فیصلہ اپنے حق میں ہونے کا اعلان کر دیا۔

محترمہ اگرچہ انتخاب میں کامیاب نہیں ہو سکیں لیکن اس جد و جہد کے نتیجے میں عوام کا شعور اور زیادہ نکھر آیا۔ انہیں حکومت کے کردار کو سمجھنے میں زیادہ مدد ملی۔ ساتھ ہی اپنی قوت کا احساس گہرا ہوا۔ حسین شہید سہروردی کے قومی جمہوری محاذ نے عوام کو متحرک کرنے

میں جو کردار ادا کیا تھا وہی کم و بیش اس تحریک نے بھی کیا۔ عوامی تحریکوں کا لا وابستہ رہا تھا۔ ایوب خاں کا قبیلہ ہراساں تھا۔ چاروں طرف دوڑ دھوپ جاری تھی۔ اسی دوڑ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ رونما ہوا کہ گوڈو ر خالد جمیل جو کاظم کے بڑے بھائی یعنی علی امام کے کلاس فیلو اور دوست ہیں۔ وہ ایوب خاں کے مشیرِ خاص تھے۔ خالد بھائی بہت دلچسپ انسان ہیں ٹھمریاں، دادرے، سوز، سلام، کیا خوب پڑھتے ہیں۔ سیاسی سوجھ بوجھ بس ایسی کہ ایوب خاں کے نزدیک تھے۔ بہرحال اُن سے نظریاتی اختلاف رکھتے ہوئے ان سے ملنے کو جی چاہتا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے تقریباً سب بچے انتہائی انقلابی ہیں گڈو یعنی حسین تو عوامی جدوجہد کے نتیجے میں لگاتار جیل میں رہا۔ خالد بھائی کے علاوہ محسن صدیقی سے بھی آپ نظریاتی اختلاف کے باوجود ملنے پر مجبور ہیں۔ نفاست ان پر ختم ہے۔ مشاعرہ ہو یا موسیقی، کھانا ہو یا دوستوں کی محفل گفتگو ہی نہیں ہر چیز کے پور پور میں نفاست نظر آتی ہے۔ ایک اور شخصیت جس سے مل کر خوشی ہوتی ہے وہ ہیں جسٹس نصرت سراپا بہار، انتہائی جاندار ذہن اور ویسی ہی گفتگو۔ نظریاتی اختلاف اپنی جگہ پر بہرحال خالد بھائی نے اسی تحریک کے دوران ہم سے ملنے کی خواہش کی، تشریف لائے، دلچسپ گفتگو رہی۔ درمیان میں فرمایا "فیلڈ مارشل کو تمہاری جیسی ہستیوں کی تلاش ہے۔۔۔ تمہاری تقریر کی دھوم ہے۔۔۔۔ کاظم عالیہ کو بتاؤ کہ اگر ایک تقریر فیلڈ مارشل کی حمایت میں کر دیں تو وزارت، سفارت، سب ان کے قدموں پر ہے" میں بھرا تھال دے رہا ہوں"۔

خالد بھائی کے لہجے کی نرمی، سختی اور درشتگی کے منافی تھی۔ چونکہ وہ شعر شاعری کے دلدادہ ہیں۔ اس لئے میں نے اسی زبان میں جواب دینا مناسب سمجھا میں نے کہا خالد بھائی میر انیس نے حق پرستوں کے لئے کس قدر خوبصورت انداز میں بات کہی ہے

گہ عطر میں ڈوبے ہیں کبھی خون میں تر ہیں۔

حسد کے ہیں بس اس کے ہیں جدھر ہیں بس ادھر ہیں۔

بہر حال ایوب خاں ڈنڈی مار کر سنگینوں کے بل پر بی ڈی کا ڈھونگ اور سوانگ رچا کر کافی مدت قوم پر مسلط ہو گئے لیکن تابکے عوام کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ روزی، روزگار اور بھوک کے خلاف عوامی احتجاج نے شدت اختیار کی۔ طبقاتی تضاد گہرا ہوا۔ قومی تحریکیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ ایوب خاں کو تخت و تاج اچھلتا نظر آنے لگا۔ چنانچہ قومی جدوجہد سے ڈر کر جنگ کا نعرہ لگا دیا گیا۔ ایوب کے ارد گرد ان کے پروردہ مولویوں اور قاضیوں نے جن کا محمود غزنوی اور محمد بن قاسم سے فکر کا سرا جوڑا ہوا تھا جن کے لئے جزیہ لینا تو اب ممکن نہیں تھا کیونکہ دو مختار سلطنتیں وجود میں آ چکی تھیں۔ چنانچہ یہ فتویٰ صادر کیا گیا کہ "دارالحرب" پر حرم کے پاسبان حملہ کر دیں۔ عوام کی توجہ بنیادی مسائل سے ہٹانے کے لئے مٹھی بھر لوگوں کی مدد سے آئی ہوئی حکومتیں یوں پٹارے کھولتی رہتی ہیں۔ چنانچہ جنگ کا بگل بجنا شروع ہوا میری بہن کے گھر کے نیچے میجر اختر اور کیپٹن اطہر سب ملک کے پیاروں کے ہمراہ لام پر پہنچا دیئے گئے کیونکہ جنگ سامراجی نظام حیات کی تقدیر ہے جو الٹ پھیر کر اسے اسی مقام پر پہنچا دیتی ہے معاشی تضادات کے بھنور سے نکلنے کا واحد راستہ ان کے سامنے جنگ ہوتا ہے۔ عوام دہان اور تیل کی طرح بکاؤ مال سمجھ کر جنگ کا ایندھن بنتے ہیں۔ فکر کا یہی وہ تانا بانا تھا جس کے نتیجے میں ۱۹۶۵ کی پاک بھارت جنگ ہوئی۔

سامراجی قوتیں چین کی بڑھتی ہوئی طاقت سے گھبرا گئی تھیں۔

انہوں نے ہندوستان پر زور ڈالا کہ وہ چین کے گرد گھیراؤ ڈالیں، جنگ تھوپیں۔ چنانچہ ایسا ہوا۔ سامراجیوں نے پاکستان کو بھی اس میں شامل کرنا چاہا۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا اس لئے ایوب خاں نے بھارت کو مشترکہ دفاع کی پیشکش کی۔ لیکن چونکہ ہندوستان کے سرمایہ دار طبقے کی قوت سے پاکستان کے سرمایہ دار خائف تھے اپنے تضادات سے نکلنے کے لئے میدان جنگ میں راستہ تلاش کرنے لگے۔ جنگ کا کردار وقت کے ساتھ بدلا۔ اور فوج اور عوام ایک ہی پلیٹ فارم پر آتے نظر آئے۔ بھارت کو شکست ہوئی۔ سامراجیوں نے دباؤ ڈالا چونکہ یہ ان کے پلان کے خلاف

بیٹھا۔ جنگ بندی ہوئی۔ معاہدہ تاشقند ہوا۔ معاہدہ تاشقند کے سلسلے میں مختلف حلقوں میں مختلف قسم کا ردِ عمل ہوا۔ ایک طبقے نے جنگ بند ہونے سے اطمینان کا سانس لیا۔ دوسری جانب بھٹو صاحب نے اس معاہدے کی مخالفت میں اپنا زور صرف کر دیا۔

جنگ کے نتیجے میں دونوں جانب کے گلستاں میں آگ لگی۔
دامنِ گل تار تار ہوا۔ لالہ زار خانۂ ویراں بنا۔ توپوں کی دھمک نے زندگی کا حسن کجلا دیا۔
ہر طرف صلیبیں، ہر جانب ناگفتہ بہ تعزیریں، پتہ پتہ خاک بسر ہوا۔

امن آزادی کی آسودہ تمنا ہے۔ حسن و محبت کی شرطِ اولین ہے محبوبہ کا تمتماتا ہوا رخسار ہے۔ بچوں کی بنفشئی مسکراہٹ ہے دامن کا کھلتا ہوا آنچل اور نگاہوں کا چھلکتا ہوا جام ہے۔ امن کی قوتیں جنگ سے زیادہ طاقت ور اور کوہ گراں ہیں۔ امن کی قوتیں جنگی جنون پر غالب آئیں۔ توپوں کے دہانے اب سرد تھے۔ ماں بیٹے کی پیشانی کو بوسہ دے رہی تھی۔

سامراجیوں کی تھوپی ہوئی جنگ انسانوں سے خراج لے چکی تھی۔ فکر پہ پابندیاں، خیالات اسیر، اور سرحدوں پہ آگ برس رہی تھی، گرانی آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ اور جب کوئی منچلا جوان کھلتے ہوئے شعور سے لیس اپنے سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق کی بات کرتا۔ درِ زنداں کھول دیا جاتا۔ "نظریہ پاکستان" سے ڈرایا جاتا۔ پورا ملک قید خانہ تھا۔ جس کی دیواریں اونچی کر دی گئی تھیں تاکہ پھر کوئی "دوسرا قیدی" بھاگ نہ پائے۔

تضادات در تضادات کے بھنور میں حکومت آ چکی تھی۔ اپنے حقوق کے لئے صحافی، ادیب، دانشور، طلباء، اساتذہ، وکلاء، مزدور سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ حکومت گولیوں کے بل پر آئی تھی اور اسی کا سہارا لے رہی تھی۔ خون بہہ رہا تھا۔ پاکستان کی زمین نوجوانوں کے خون سے رنگین تھی۔ اپنی ہی فوج کے باپ اپنے ہی بیٹوں کے سینے سنگینوں سے چھلنی کر رہے۔ ایک علم گر رہا تھا۔ حق و انصاف کا علم۔ دوسرا نوجوان اسے فضا میں یہ کہہ کر بلند کر رہا

"میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے" کہ فوج انسان کا سینہ چھلنی کر سکتی ہے، سر کو بریدہ کر سکتی ہے۔ اسے نیزہ پر بلند کر سکتی ہے۔ جسم کو مقتل بنا سکتی ہے۔ ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے پاؤں کو زنجیریں و طوق پہنا کر سر بازار پھرا سکتی ہے۔ لیکن سر کو جھکانے پر مجبور نہیں کر سکتی قلب کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ باطل کو حق میں، نفرت کو محبت میں، اور جہل کو علم میں بدل نہیں سکتی تاریخ شاہد ہے، ظلم کی قوتیں آگے بڑھتی ہیں۔ پھر پیچھے ہٹتی ہیں۔ پھر آگے بڑھتی ہیں۔ یہاں تک کہ ختم ہو جاتی ہیں۔ خونِ ناحق سو شکلیں بدل کر ابھرتا ہے۔ لغزہ بنتا ہے، پتھر بنتا ہے۔ عوامی فوج بنتا ہے، حق کی آواز بنتا ہے، قاتلوں کو کمیں گاہوں سے نکال لاتا ہے، انہیں دار پہ چڑھاتا ہے اور ظلم کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اپنے خون سے حق و ناحق کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیتا ہے۔ ایوب خاں نے خون کی ہولی کھیلی، لیکن تابہ کے۔ اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے "گول میز کانفرنس" کا جال بنا، لیکن بے سود۔

عوام کا شعور، انکی حمیت، ان کا ارادہ، ان کا حوصلہ اگر جاگ اٹھے، انہیں اپنے حقوق اور قوت کا جس گھڑی اندازہ ہو جائے تو وہ طوفانوں سے ٹکراتے، سیلاب کو خاطر میں نہ لاتے، کوہ گراں کو پار کرتے اپنے مسلک و نصب العین کو پا لیتے ہیں۔ طلباء، دانشور، ادیب، صحافی، صنعتی مزدوروں کا ہر بچہ جرأت کی کہانی بن چکا تھا آفتاب زمین سے ابھر رہے تھے۔ روشنی بکھر رہی تھی۔ آہنی دمک اور جذبے کی روانی سنگینوں کے سینوں کو چھلنی کر رہی تھی۔ آگ کو فاصلے سے حکومت بھانپ رہی تھی، قدم اکھڑ رہے تھے اقتدار کو بچانے کے لئے منصوبے گڑھے اور سازشیں رچی جا رہی تھیں لیکن عوام کی تیز نگہی سے بچ کر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ سازشی ذہن صرف اتنی ہی چال چل سکتا تھا کہ آئین کو پھر پارہ پارہ کر دے، قائد اعظم کی آئین پسندی کا مذاق اڑائے، سیاست کے رخسار کو لال کر دے عوام کے شعور کی توہین کرے اور اپنے ہی قبیلے کے فرد اور اپنے ہی "طبقے کے محافظ" کو

ملک و قوم کا نگراں مقرر کر دے ۔

کمانڈر انچیف یحییٰ خاں مسند نشین ہوئے ۔ اعلان تھا کہ فوج صرف امن و اماں قائم کرنے آئی ہے ۔ وہ قومی اتحاد کی خاطر انتخابات کرائے گی اور اقتدار قومی نمائندوں کے حوالے کر کے اپنی اصل جگہ یعنی بیرکس میں واپس چلی جائے گی ۔ لیکن فوجی جاگیردار سرمایہ دار اور افسر شاہی اس بات کو سمجھ چکی تھی کہ اگر عوام کا جذبۂ حریت اسی درجے پہ رہا اور اس کی کتر بیونت نہ کی گئی تو وہ ہمیشہ کے لئے آمریت کی کشتی کو ڈبو دے گا ۔ اور خود ملک کا ناخدا بن جائے گا اسی فکر کے تانے بانے میں سیاسی عمل عرصے تک معطل رہا ۔ انتخابات سرد خانوں میں ڈال دیئے گئے ۔ صنعتی مزدور اور طلباء جو شرق تا غرب ہڑتالیں کر چکے تھے ۔ میدان میں سروں پر کفن باندھ کر نکل چکے تھے اب وہ پھر سے جیلوں کے پیچھے تھے لیکن "بڑھتا ہے اور ذوق جنوں" کی منزل تھی ۔ دس جیل کے پیچھے تھے تو ہزاروں میدان میں اترے ، فوجی حکومت کو للکار رہے تھے ۔ تشدد کا نشانہ بن کر بھی سپر ڈالنے کو تیار نہیں بلکہ سپر ڈلوانے کے لئے بے چین تھے ۔ فوجی آمر ، ایوب خان کا تاریخی حشر نگاہوں کے سامنے تھا ۔ "فوجی آمر کاغذی شیر ہوتا ہے جس کے پاؤں مٹی کے ہوتے ہیں" عوام کے تیروں سے زخمی ہو چکا تھا ۔ اب دوسرے کی باری تھی ۔ سیلاب پہ بند باندھنا ضروری ہے ۔ عوامی مطالبات کے سامنے گردن جھک گئی اور یکم جنوری ۱۹۷۰ء میں سیاسی سرگرمیاں بحال کر دی گئیں اور عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا گیا ۔ one unit ٹوٹا صوبے بحال ہوئے لیکن قومی خود مختاری کا مسئلہ الجھایا گیا ۔ انتخابات کے پس پردہ سازشی ذہن مصروف کار تھا ۔ کوشش جاری تھی کہ "اپنی مرضی کے اراکین منتخب ہو کر آئیں" تاکہ بلیک میلنگ کے ذریعے اقتدار میں شرکت کا مقدس دروازہ بند نہ ہونے پائے ۔ صوبائی خود مختاری کا نازک مسئلہ چونکہ مبہم چھوڑ دیا گیا تھا جس سے مشرقی بنگال میں محرومی بڑھی اور بالآخر مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا ۔

پاکستان کے حکمراں طبقے نے قومی مسائل کو حل کرنے کے

بجائے اپنے مفادات کو تحفظ دینے کی پالیسی اپنائی۔ چھوٹے صوبوں کی خود مختاری کے مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے انہیں اپنی منڈی کے طور پر استعمال کیا۔ مشرقی پاکستان کے رہنماؤں اور عوامی نمائندوں نے بارہا حکمرانوں کی توجہ بنیادی مسائل کی طرف مبذول کرائی۔ مولانا بھاشانی نے اس قومی مسئلہ کے حل کے لئے مختلف منصوبے اور تجاویز پیش کیں۔ لیکن ہر قومی رہنما کی آواز یا تو صدا بصحرا ثابت ہوتی یا پھر اسے " غدار " " غیر محب وطن " کا خطاب دیکر آہنی سلاخوں میں بند کر دیا گیا۔ اور لوٹ کھسوٹ کی پالیسی پر صدقِ دل سے عمل ہوتا رہا، عوام کی زندگی مدقوق کی تصویر بن گئی۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں تاریخ نے کروٹ لی، ذروں کا احساس جنوں جاگ اٹھا۔ کتنی سوئی ہوئی لویں جگمگانے لگیں۔ سیاسی، سماجی اور تہذیبی شعور چھلک اٹھا۔ مذہب فروشوں کی دکانیں باوجود حکومت کی سرپرستی کے اجڑ گئیں۔ اوہام پرستی کے بت ٹوٹ گئے۔ اندھیرے کا خوف ٹوٹ گیا۔ " آبلہ پایان شوق " " خار سے گل " اور گل سے گلستاں بنانے کے لئے میدانِ عمل میں اتر آئے۔

مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ سرخرو ہوئی۔ بنگالی عوام کی سیاسی نگاہ پختہ تھی۔ تجربہ گاہ سے تپ کر نکھر آئی تھی۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے بیدار مغز عوام کے بل پر میدان جیت لیا۔ نیشنل عوامی پارٹی نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اکثریت حاصل کی۔ لیکن حکومت مایوسیوں کے بھنور میں ڈوب گئی۔

" جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے " کی منزل تھی۔ مذہبی فتویٰ فروش اور دینی بیوپاریوں کی پارٹی میدان میں ہار چکی تھی۔ مذہبی جماعتوں کے کفن میں عوامی شعور نے کیل ٹھونک دی تھی۔ یہی تو وہ جماعتیں تھیں جنکے جیتنے کی امید پر الیکشن کرانے کا پانسا حکومت نے پھینکا تھا لیکن خود اپنے ہی دام میں صیاد آگیا۔ جمہوری قوتوں کا سر غرور سے دمک اٹھا۔ جمہوری انقلاب کی جے جے کار کی صدا گونجنے لگی۔ فوجی حکمراں اور ان کے ساتھی

اجارہ دار، سرمایہ دار، جاگیردار اور نوکر شاہی کے کیمپ میں دیئے بجھ گئے۔ اگر یہ جمہوری انقلاب اس طرح آگے بڑھا تو آمریت کو اجالا کھا جائے گا۔ "تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانہ کرئے" اسی غزل کو سینے سے لگائے حکمراں طبقہ ٹہل رہا تھا۔

چنانچہ شطرنج کی چالوں کا بازار گرم ہوا۔ ایوب خاں نے اپنا تخت ہلتا دیکھ کر محترمہ فاطمہ جناح کی جیتی ہوئی بازی پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ یہاں دوسرا کھیل رچایا گیا۔ تمام رجعت پسند قوتیں سر جوڑ کر بیٹھیں۔ عوام کے ریلے کو روکنے کے لئے بند تعمیر کئے جانے لگے۔ جیلوں کے دروازے کھلے، زنجیریں کھنکھنائیں، ہتھکڑیاں لائی گئیں۔ ملک قید خانے میں تبدیل ہوا۔ آگ کے شعلوں کو دبانے کے لئے باہر کے آقاؤں سے مدد مانگی گئی آقاؤں کے مفادات کو عوام نے مجروح کر دیا تھا۔ جرم سخت تھا، سزا بھی اتنی ہی سخت۔ فوج حرکت میں لائی گئی۔ اجالوں کو اندھیرے نے ڈسنا شروع کیا۔ پھولوں کی رگیں تار تار کی گئیں زمین پر معصوم ماؤں، بہنوں، بیٹوں اور بچیوں کا خون بہا دیا گیا۔ اسلام کے مقدس رشتے کی شہ رگ کو کاٹ دیا گیا۔ مقدس مریموں کے بند قبا دریدہ کئے گئے۔ "دجلہ و فرات میں بہایا جانے والا خون شرمندہ ہو گیا۔ انہوں ہی نے انہوں کا گلا کاٹ ڈالا" دو قومی نظریے کو آگ دکھا دی، مذہب کے رشتوں کو آگ دکھا دی، محبت کے رشتوں کو آگ دکھا دی، قبریں بنانا اسلام کی رو سے لازمی تھا لیکن قبریں بھی نہیں بنیں، مسلمانوں کی تربتیں نہیں بنیں ہزار ہا مہ و خورشید اگلنے والی زمین اور چراغوں بھرا آسمان جدا ہوا۔ قائد اعظم کی فکر سرنگوں ہوئی فوجیوں نے جوانمردی کا ثبوت فراہم کیا۔ نئی نسل کو سبق دے دیا۔ پوری فوج نے ہتھیار ڈال دیئے پاکستان کا "قومی وقار سربلند" ہو گیا۔ ملکی سالمیت، قومی وحدت، اسلام کا تقدس سب بے معنی اگر اقتدار چراغوں کی زد پہ ہے۔ حکمراں طبقہ گہری سوچ میں تھا۔

پاکستان کی تاریخ نوجوان نسل کو بتا رہی تھی کہ یہاں کے حکمراں یعنی بالائی طبقے نے تین طرف اندھیرے اور ایک طرف اجالے کے نظام کو دوام

بخشنے کے لیے ۵ اصول وضع کیے (۱) پہلا عوام کی قوتِ احساس کو سلب کیا جائے (۲) جرأت اظہار کو چھینا جائے (۳) قوم کو آئین سے محروم رکھا جائے (۴) اسلامی نظریہ کی خاطر جہاد فی سبیل اللہ کیا جائے (۵) قومی و ملکی مفادات کو امریکہ کا پابند بنا دیا جائے۔

(۱) پرانی ریت دہرائی گئی قوتِ احساس کو سلب کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا کہ جو شخص یا گروہ یا طبقہ حکومت سے تعاون کرے اسے امیر کبیر، وزیر بنا دیا جائے عہدہ جتنا بلند ہو گا گردن اس قدر جھک جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ گروہ اور طبقہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ یہ حکمراں اگر اکثریت کے لئے برے ہیں تو ہوا کریں، ظلم اگر کرتے ہیں تو کیا کریں لیکن ہمارے لئے "مفید" اور روح پرور امیر المومنین ہیں۔ ان کی "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں" ہے۔

(۲) جرأت اظہار کو اس طرح چھینا گیا کہ عوام نے جب وقت اپنے معاشی، سیاسی اور تہذیبی حقوق کے لئے آواز بلند کی تو کہہ دیا گیا کہ یہ حکومت اور اسٹیٹ دونوں کا 'غدار' ہے اس پر نان جویں کو حرام کر دو۔ ضمیر کو پابہ زنجیر کر دو۔ لیکن اگر انکار پھر بھی بڑھے تو کہہ دو "نظریہ پاکستان"، کو خطرہ ہے۔ "ملکی سالمیت کو خطرہ" ہے۔ ورنہ دار اور پھانسی کی منزل سامنے ہے۔

(۳) تیسرا اصول یہ اپنایا گیا کہ ملک بے آئین رہے۔ کیونکہ کسی بھی ملک کا آئین وہاں کے رہنے والوں کی خواہشات اور امنگوں کا آئینہ دار اور ان کے حقوق کا محافظ اور نگراں ہوتا ہے اس لئے اسے متبرک اور معتبر سمجھا جاتا ہے اور اسی بنا پر اس پہ ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا جاتا ہے۔ اور اس کی توہین ملک و قوم کی توہین کے مترادف گردانی جاتی ہے

(۴) چوتھا اصول یہ وضع کیا گیا کہ جس وقت عوام اپنے حقوق کی جنگ تیز کریں اور شعلے محلوں کی جانب لپکنے لگیں تو ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر دیا جائے کہ "اسلام کو خطرہ" ہے۔ غازیان دین کا فریضہ "اسلام کے تقدس" کو بچانا ہے تاکہ اپنی

مقدس سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔ حکمرانوں کی فکر "دارالحرب" کی فکر سے جڑی رہی ہے ہندو سے جزیہ نہ لیا تو "ہندوستان سے خطرے" کی گھنٹی بجادی۔

دنیا کی خواہ کوئی بھی ریاست ہو وہ نظریاتی ہوتی ہے۔ یہ نظریہ مذہبی واقتصادی وسیاسی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے جس کا مقصد عوام کے ذہنوں پر غلبہ پانا ہوتا ہے اور یہ بتانا ہوتا ہے کہ عوام اور ریاست کا مفاد مشترک ہے۔ ہر ریاست ایک طبقاتی ادارہ ہے جس کا مقصد طبقاتی حکومت کے مفاد کی نگرانی کرنا ہوتی ہے۔ جو طبقہ برسر اقتدار ہے اس کے مفادات کا تحفظ اسٹیٹ کا فرض قرار پاتا ہے۔ یہ طبقہ اگر استحصالی ہے تو وہ اپنے طبقے کے مفادات کے تحت اس کی نگرانی کرتا ہے اور اگر محنت کشوں کا طبقہ غالب ہے تو وہ اپنے طبقے کے مفادات کی نگرانی کرتا ہے۔ طبقاتی معاشرے میں "نظریہ کی پکار اپنے مفادات پر پردہ ڈالنا ہے۔

(۵) پانچواں اصول یہ قرار پایا کہ ملک کی خارجہ پالیسی امریکہ اور تمام رجعت پرست ممالک کے تابع رہے۔ کیونکہ بالائی طبقے کی راہ نجات اسی میں ہے۔ ملک اگر ان کے ہاتھوں گروی بھی رکھ دیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ مسند کو آنچ نہ آئے امریکہ کے مقدس ہاتھوں "دستار بندی" ہوتی رہے اس کے عوض امریکی مفادات کی نگرانی میں قوم کے مفادات کو قربان کردینا عبادت اور فریضہ اسلامی قرار دیا جائے امریکہ کو "بعد از خدائے بزرگ توئی قصہ مختصر" سمجھا جائے۔ معاشی امداد اور فوجی امداد ناخداؤں سے طلب کی جائے۔ اسلحہ سے مسلح ہو کر عوامی تحریکات کے خلاف جہاد کیا جائے اور عوام اور ملک کو بار بار سنگینوں کے بل پر فتح کیا جائے۔ اس عمل میں ملکی سالمیت کو خطرہ ہو تو "غداران وطن" پر الزام تھوپ کر چین کی بانسری بجائی جائے۔

حکمرانوں کی انہی غلط پالیسیوں کے نتیجے میں ہر جگر فگار ہوا ہر قدم بوجھل ہوا، ہر چہرے کا رنگ اڑا، ہر ذہن وجسم میں لڑائی ٹھنی۔ ہر دل کی دھڑکن "دسم وازجرس"، پر کان لگائے انتظار میں بیٹھی رہی۔ نوے ہزار قیدی جن کے سر تختے میں

میں کروڑوں لالوں کے خون کی لالی مچل رہی ہے وہ سپر ڈال کر سرخرو ہیں۔ پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ کھو چکے ہیں۔ معیشت بے روح ہو چکی ہے۔ سیاست کراہ رہی ہے۔ ایسے وقت میں "کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق ... ؟ کی منزل ہے ؟ کس کے شانوں میں طاقت ہے کہ وہ اس بار گراں کو اٹھالے ؟۔ "قم بہ اذنی" کہہ کر مسیحا نفسی کا حق ادا کرے ؟

"قرعہ فال بنام منِ دیوانہ زدند" عوام کی آواز کو بھٹو نے لبیک کہا یہ وہ شخص تھا جو سندھ کی اس مقدس سرزمین سے اٹھا جس کا پیغام محبت، جس کا مسلک امن وشانتی جس کا نصب العین رنگ ونسل کی قید سے آزاد ہو کر جام مے پلانا تھا۔ جس نے ہر اجنبی کو اپنی محبت سے بوجھل باہنوں میں یوں لے لیا جیسے عاشق معشوقہ کو لیتا ہے۔ بھٹو سندھ کی دھرتی کا لعل بدخشاں تھا۔ انتیویں کا چاندبن کر افق سیاست پر نمودار ہوا اور چودھویں کا چاند بن کر زمین پر اپنی رعنائیاں بکھیر گیا۔ جاگیردار گھرانے کی لعنتوں میں پلا بڑھا ایسا انسان عوام کا درد کیسے سمیٹ سکتا ہے ؟ وہ دھرتی کے سینے سے لگ کر چلا نہیں غم کو پا کیسے سکتا ہے ؟ وہ مٹی کی سوندھی خوشبو میں پلا نہیں تو خوشبو پہچان کیسے سکتا ہے ؟ وہ درد کے رشتوں کا آشنا نہیں تو درد کے ان رشتوں کو جو زمین پر دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں سمجھ کیسے سکتا ہے ؟ پھر وہ اپنے آپ کو عوام کا درد آشنا کیسے کہتا ہے ؟ یہ سوال تھا جو ہر ذہن سے جواب طلب کر رہا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ انسان کی فکر کی شناخت کے لئے اس کے طبقے کے خدوخال پر نگاہ رکھنا لازمی ہے لیکن صرف یہ دیکھنا کافی نہیں ہے کہ انسان کس طبقے میں پیدا ہوا بلکہ اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کس طبقے سے اپنا رشتہ جوڑتا اور اس کے مفادات کو آگے بڑھاتا ہے۔ اور دورانِ جدوجہد، کس طرح عوامی امنگوں کے لئے سپر بنتا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بہاروں کی آغوش کا پلا ہوا سدھارت "گیان" کی منزل پر

آکر عوام کے دل میں اتر جاتا ہے ۔ اور کبھی سکون آشنا زندگی جدو جہد کی خارزار وادیوں سے گذر کر باطل سے ٹکراتی ہے۔ عوام کا در دستک لیتی ہے اور جو اپن لائی بن جاتی ہے ۔ یہاں اختلاف کی گنجائش یقیناً ہے لیکن سوتالیوں بھی ہے ۔

پاکستان کی تاریخ میں اب تک جتنے "انقلابات"

آئے وہ محلات میں اور رات کی تاریکی میں آئے ۔ لیکن آج فکر کا رخ بدلا ہوا تھا ۔ عوامی و جمہوری انقلاب زمین کی کوکھ سے پیدا ہو رہا تھا۔ کھیتوں ، کارخانوں ، دانشکدوں ، اسکولوں اور کالجوں کی زمین پر بھٹو کے قدم نقش ثبت کر رہے تھے۔ کھلیانوں میں کسانوں نے پہلی مرتبہ کسی رہنما کو دیکھا تھا ۔ غش کی حالت میں پڑے ہوئے انسان کو جھٹکوں نے جگا دیا تھا ۔ ،، ظلم آج نہیں تو کل مٹ کر رہے گا ۔ قندیل صفت انسان کی آواز افق در افق گونج رہی تھی ۔ اشتراکیت کے اصولوں پر معشیت کی ترتیب ہوگی . . . .

عوام کے دل کی بات زبان پر تھی ۔ تشنہ لب ، گرسنہ نگاہیں ، تپتے ہوئے ہونٹ ، پڑتالوں میں ٹوٹے ہوئے بازو ، شکستہ کمر ، لوجھل قدم ، تڑپتے ہوئے جسم ، لرزاں آہیں ، میلے چہرے ، کھردرے ہاتھ جن پر علم کے دروازے اب تک کھلے نہیں ۔ معلم جن کے محنت اور افلاس ہیں ۔ یہ جوان شعور ، فولادی عزم ، سینوں میں سیسہ پگھلا ہوا ۔ دھوپ کو چاندنی ذوالفقار کو پانی کی روانی صرصر و سیلاب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آہنی دھمک اور جرائت اظہار سے زمانے کو بتا رہے تھے کہ عوام قوت کا سرچشمہ اور جوان شعور کے مالک ہیں یہ بوڑھے نظام کو ڈھائے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے ۔ عوام کا شعور ان کا فولادی عزم ، آہنی ارادہ جاگ اٹھا تھا ۔ جھونپڑیاں وسعت ارض پر چھانے کو تھیں ۔ سرمائے کے قصر و الیوان کانپ رہے تھے ۔ بڑے بڑے ارادے ٹوٹ کر گر رہے تھے ۔ باہر بینکوں میں سرمایہ بھیجا جا رہا تھا ۔ اوپر سے نیچے تک سازشوں کے جال بُنے جا رہے تھے ۔ وقت اور بہت جلد وقت کا انتظار تھا ۔

(۱) پہلا اصول جمہوری انقلاب کا یہ قرار پایا کہ شعلوں میں جھلسا ہوا ریزہ ریزہ ملک جوڑا جائے تاکہ شکست خوردہ فوج اور مضمحل عوام کا وقار بلند ہو۔

(۲) دوسرا اصول یہ طے پایا کہ نوے ہزار جنگی قیدی واپس لائے جائیں۔ پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ واپس لیا جائے جس کے لئے امن و شانتی کی فضا پیدا کرنا لازمی ہے۔ شعلے سرد ہوئے۔ امن کا پرچم بلند ہوا۔ قیدی واپس آئے۔ زمین واپس ملی۔ بچھڑے ہوئے گلے ملے۔ ٹوٹے دل جڑنے لگے۔ تاریخ ساز شملہ معاہدہ ہو گیا۔

(۳) ملک بے آئین کو آئین دیا جائے۔ صرف جنگل قانون کی عملداری سے آزاد ہے۔ مہذب دنیا نہیں۔ ۱۹۷۳ء کا عہد ساز آئین بنا۔ حقوق کو تحفظ ملا۔ ہر ذی شعور نے لبیک کہا۔ تمام جمہوری سیاسی جماعتوں نے دستخط ثبت کئے۔ عدلیہ کو وقار ملا۔ یہ آئین مقدس دستاویز ہے۔ اس کا احترام سب پر لازم ہے۔ تاریخی پس منظر کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ بھی لکھ دیا گیا۔

مسلح افواج کے فرائض۔ " وفاقی حکومت کی ہدایات کے مطابق مسلح افواج بیرونی جارحیت یا جنگ کے خطرے کے خلاف پاکستان کا دفاع کریں گی۔ جب ان کو حکم دیا جائے گا تو قانون کے تحت سول حکومت کی مدد کریں گی۔

دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان دفعہ ۲۴۵

بدترین غداری۔ جو شخص طاقت کے استعمال کے ذریعے یا طاقت کے اظہار سے یا دوسرے غیر دستوری ذرائع سے دستور کو منسوخ کرے یا منسوخ کرنے کی کوشش یا سازش کرے، یا دستور کو توڑے یا مروڑے وہ بدترین غداری کا مجرم ہوگا۔ شق (۱) میں مندرجہ جرائم کی مدد یا حمایت کرتا ہے وہ بھی بدترین غداری کا مجرم ہوگا۔

بدترین غداری کی سزا۔ دفعہ ۶

موت یا عمر قید (آرڈیننس ۱۱۱ × ۷ بابت ۱۹۷۳ء پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعہ ترمیم

کی جاسکتی ہے۔ دفعہ ۳۳۸۔

سیاست معیشت کا پر تو ہوتی ہے۔ پیداواری رشتوں کے بدلنے سے فکر متاثر ہوئی ہے۔ چنانچہ پیپلز پارٹی نے اس بات کو اپنے پروگرام میں وضاحت سے بیان کیا کہ سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ پیپلز پارٹی کی اس فکر کا سو نا زمین سے اگا تھا محنت کش اپنی جدوجہد آزادی کے دوران اس کا بیج ڈال چکے تھے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کی کرنیں یہاں بھی پہنچی تھیں۔ ان کرنوں کو تاج علامہ اقبال نے یہ کہہ کر پہنا دیا تھا۔ "آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا" اس کے علاوہ انہوں نے سوشلزم کی فکر کے معنی اس طرح اخذ کئے تھے۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

صرف اتنا ہی نہیں اقبال اس "آفتاب تازہ" کو فلسفیانہ انداز میں یوں پیش کرتے ہیں

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم
چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
خرم آں کس کہ دریں گردِ سوارے بیند
جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند

اور غالب کے الفاظ میں شمع کو بجھا کر سورج کو یوں طلوع ہوتا دیکھتے ہیں۔

مژدهٔ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

پیپلز پارٹی کے قائد ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کی فکر کا تانا بانا اسی فکر سے جڑا ہوا تھا، سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ اس کے معنی علامہ اقبال کے قدموں پہ پھول نچھاور کرنا تھا چنانچہ اسی بنا پر یہ کہا گیا

(ONLY SOCIALISM COULD CURE PAKISTAN)

FOUNDATION DOCUMENTS NO. 4

Islam and the principles of Socialism are not mutually repagnat. Islam preaches equality and Socialism is the modern technique of attaining it..... Pak cannot last without the supremacy on the contrary socialism will make the whole population the custodian of Islamic value.

> Zulfiqar Ali Bhutto Political Situation in Pakistan No. 1, Lahore, PP 14-15

I am a believer in such, that-s why leaving my class of Govt. I have come back to worker, Peasants, Students,

and poor people. I am the follower of socialism because I know that only in this economic system lies the salvation, progress, and well being of the people ----- No power on earth can prevent the establishment of this system of truth equality and human dignity in Pakistan.

Zulfiqar ----- Address to the Hyderabad convention, Sep. 21-1968 in "Let my people judge" (Lahore Pakistan Peoples Party 1968)

چنانچہ اسی فکر کے نتیجے میں معیشت میں تبدیلی لائی جانے لگی۔ بھاری صنعت، انشورنش کمپنیاں اور بینک قومی ملکیت میں لئے گئے۔ بھاری صنعت کسی بھی ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ اس لئے روس سے معاہدہ کیا گیا۔ اسٹیل مل لگانے میں مختلف حلقوں کی جانب سے زبردست رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ مغربی ممالک اور ان کے مشیر کار سدراہ بنے۔ کیونکہ مغربی ممالک جو صنعتی ترقی میں بہت آگے ہیں نہیں چاہتے کہ تیسری دنیا کے ممالک صنعتی ترقی کریں۔ کیونکہ ان کی مشینی کھپت کو نقصان ہوگا۔ اگر ہر ملک میں بھاری صنعت لگ جائیں تو وہ ملک ہر قسم کے کل پرزہ میں خود کفیل ہونا شروع ہو جائے گا۔ اور جب صنعتی میدان میں ترقی کرے گا تو لازمی طور پر زراعت پر انحصار کم ہو جائے گا۔ وہ اپنے خام مال کو اپنے ہی کارخانوں میں استعمال کرے گا اور نتیجے میں ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں بازار میں سستی اشیاء کا ڈھیر لگ جائے گا۔ اسٹیل مل لگائی گئی جو زندگی کا رخ بدلنے میں معاون بنی۔ چین کی مدد سے کیمیکل انڈسٹری قائم ہوئی۔ محنت کشوں کا سینہ چوڑا ہوا۔ خود کفیل معیشت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی گئی۔

اٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ۔ پرانے آقا امریکہ کی مخالفت مول لیکر فرانس سے معاہدہ ہوا۔ جس کا مقصد اقتصادی نظام میں خود کفیل ہونے

کی جانب مثبت قدم تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کوشش مدِنظر تھی کہ پاکستان اتنا مضبوط ہو جائے کہ مختلف طریقوں سے فلسطینوں اور تیسری دنیا کے عوام کے جہادِ آزادی میں ممد و معاون ہو سکے استعماری اور صیہونی طاقتیں کمزور ہو سکیں۔

ملک کے حکمرانوں سے جڑی ہوئی سب سے بڑی طاقت افسر شاہی ہے۔ ملک کی کلید اس کے پاس ہے وزیر، سفیر نمائشی مہرے ہیں۔ اجارہ دار سرمایہ دار اور جاگیر دار کے ساتھ ان کا مضبوط سنگھٹن ہے اس لئے یہ لازم ہے کہ انتظامیہ کے اس طاقتور ادارے میں دراڑیں ڈالی جائیں تاکہ سیاست دانوں اور جمہوری عمل میں یہ لوگ رکاوٹ کھڑی نہ کر سکیں۔ اس لئے افسر شاہی کی قہاریت کو کو ختم کرنے کے لئے ان کے اختیاراتِ عرش و فرش میں کتر بیونت کی گئی۔

جمہوری عمل کے آغاز سے حرف آزادی تحریر و تقریر نہیں صرف صحافت و ادب کی ہی آزادی نہیں بلکہ سیاسی نظر بندوں اور سیاسی قیدیوں پہ سے پابندی ہٹانا لازمی ہے۔ محترم ولی خاں صاحب اور غوث بخش بزنجو اور دیگر سیاسی کارکن اور رہنما آزاد ہوئے۔

داخلی امور سے قطع نظر خارجی سطح پہ bi latrali ﺳﻢ کی بنیاد پر آزاد خارجہ پالیسی کی داغ بیل رکھی گئی۔ جمہوری ممالک سے رشتے استوار ہوئے۔ مسلمان ممالک سے دوستی کا دائرہ وسیع ہوا۔ مشرقِ وسطیٰ کے مفادات سے رشتہ جڑا۔ ویت نام، کوریا، فلسطین سے رشتے ہموار ہوئے۔ ہندوستان سے دوستی کا آغاز ہوا۔ امریکہ سے دوستی کی ڈوری مضبوطی سے پکڑے رہنا اقتدار میں رہنے کے لئے لازمی تھی۔ ذرا ہاتھ کپکپایا، مٹھی ڈھیلی ہوئی۔ اُن کے مفادات پہ آنچ آئی تو اقتدار کا تیا پانچا ہونا لازمی، ویت نام میں امریکی شکست، واٹر گیٹ کا تماشا، تیل پیدا کرنے والے ممالک کی قوت میں روز افزوں اضافہ، لاطینی امریکہ میں امریکہ کی گرتی ہوئی ساکھ یہ وہ عوامل تھے جن پہ خارجہ پالیسی ترتیب دیتے ہوئے کڑی نگاہ رکھنا تھا

امریکہ کی عالمگیر سامراجی حکمت عملی میں پاکستان کو ایران کے بعد غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے اب تک خلیج کے علاقے میں امریکی مفادات کے نگراں اور چوکیدار شاہ ہیں کل اگر صورت بدلتی ہے تو یہ کردار پاکستان کے ذمے ہو سکتا ہے۔ یہ سب اس لئے تاکہ روس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکا جا سکے۔ سوشلزم کی "زہریلی" ہوا سے قوم کو بچایا جائے اس فکر کا تانا بانا بہت پہلے بنا جا چکا تھا۔ اس پر عمل پیرا ہونا واجب تھا۔ سوشلزم کے خلاف پیکار کا فریضہ صرف پاکستان ہی ادا کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ بات واضح تھی کہ اس علاقے میں امریکہ کے تین مقاصد ہیں۔

۱۔ جمہوری قوتوں اور عوامی انقلاب کی طاقت کو بڑھنے سے روکنا۔ ۲۔ پاکستان کو روس دشمن سرگرمیوں کے مرکز میں تبدیل کر دینا۔ ۳۔ پاکستان کی معیشت پر چنگل گاڑ کر اسے مستقل کالونی کی شکل دے دینا اور اس طرح خارجی حکمت عملی کو اپنا تابع بنا لینا۔

بھٹو کی نگاہ میں آزاد خارجہ پالیسی کی بنیاد رکھتے ہوئے یہ تمام اسباب و علل اور اس کی کڑیاں واضح تھیں، یہ راستہ پل صراط تھا، بال سے زیادہ باریک ذرا ادھر اُدھر قدم بہکا اور بس۔ بہر حال داخلی اور خارجی سطح پر جمہوری قومی انقلاب لانے کی کوشش کا آغاز ہوا۔

انتخابات کے نتیجے میں صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کامیاب ہوئیں۔ نیشنل عوامی پارٹی کے قائد ولی خان اور غوث بخش بزنجو تھے۔ پاکستان کی سیاست میں یہ دونوں شخصیتیں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ ولی خان صاحب کا نام کچھ بھی ہو حکمرانوں نے ان کی عرفیت "غدار" قرار دی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ باوجود حکمرانوں کی انتہائی کوششوں کے اس "غدار وطن" نے ان کی تمنا پوری نہیں ہونے دی اور ہمیشہ جمہوریت کی لڑائی میں اور پاکستان کے بچانے میں پیش پیش رہا۔ بیٹا تو بادشاہ خان کا ہے جو جمہوریت کی علامت اور حق کی تاریخ ہیں۔ ولی خاں کی فکر پختہ اور ان کے سخن

نیپ کی مرکزی مجلس عاملہ کی رکن ڈاکٹر عالیہ امام کی طرف سے نیپ کے سربراہ عبدالولی خان کے اعزاز میں دیئے گئے ظہرانہ کے شرکا ء رجنگ ٹی

نیپ کی مرکزی مجلس عاملہ کی رکن کی جانب سے نیپ کے سربراہ عبدالولی خان ، سردار غوث بخش بزنجو
سردار عطاءاللہ مینگل محترم اجمل خٹک ، شیخ عزیز ایڈووکیٹ ، سردار نواز کے اعزاز میں دیئے جانے والے
ظہرانے کے موقع پر لیا گیا ایک گروپ فوٹو

دلنواز ہیں۔ پاکستان کی قومی تحریک کو انہوں نے خون جگر سے سینچا ہے۔ ان کی شخصیت کے بناؤ میں ان کی من موہنی بیوی نسیم کا بہت ہاتھ ہے۔ نسیم سے ملنے اور انہیں سننے کو جی چاہتا ہے

سردار غوث بخش بزنجو میدانی درخت ہیں جس کا مقدر جھکڑ اور پتھراؤ ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی کملاتا نہیں شمشاد قد کی طرح اپنے حسن کا خراج وصول کرتا ہے۔ نظریاتی و فکری پختگی ان کا حصہ ہے۔ میدان کی وسعت ظرفی ان کا مسلک ہے

نیشنل عوامی پارٹی مختلف مکتبہ ہائے فکر کے افراد پر مشتمل ہے۔ اگر ایک طرف نیشنلسٹ رہنما سردار خیر بخش مری، عطاء اللہ مینگل اور سردار بارو زئی تھے تو دوسری جانب حبیب جالب قصور گردیزی، سید علی نقوی، نواز بٹ، الطاف آزاد، بی ایم کٹی۔ علی امجد، امجد الطاف، ڈاکٹر نذیر، ڈاکٹر منظور، نبی احمد اور نہ جانے کتنے بے شمار ہیرے موتی جمع تھے جن کی فکر پختہ تھی عمل جاندار تھا۔ سخن سیکھے گلاب تھے۔

کسی بھی انقلابی پارٹی کی روح اس کے سیاسی کارکن ہوا کرتے ہیں۔ یہ سیاسی کارکن عمل کے میدان کے دھنی تھے۔ انہوں نے غیر معمولی قربانیاں دیکر جدوجہد آزادی کو آگے بڑھایا تھا تحریک کو قبولیت عوام کا تحفہ دلایا تھا۔ محنت کشوں سے شعور لے کر انہیں شعور عطا کیا تھا۔ فکر کو جلا اور عمل کو توانائی بخشی تھی۔

پاکستان میں آنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد میں اسی پارٹی کی ایک ادنیٰ کارکن بن گئی تھی، عوامی تحریکوں کے ساتھ رشتہ جڑنے کے سبب فکر و عمل میں گہرائی اور توانائی پیدا ہوئی۔ جدوجہد کی پر خار وادیوں نے جینے کا سلیقہ دیا اور عوامی تحریک کی اجتماعی قوت میں انفرادیت کو ختم کرنے کا حوصلہ بخشا ذہن کے کانٹے صاف ہوئے نئی کونپلیں پھوٹیں، مزدوروں اور محنت کشوں کے شعور سے اپنے شعور کا چراغ روشن کیا کیونکہ مزدور طبقہ ہی دراصل جمہوری لڑائی کا ہراول دستہ ہوتا ہے جو حقیقی انقلاب برپا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ دوسری جمہوری قوتوں سے جڑ کر اقتدار حاصل کرتا ہے۔ پھر پیداوار کے

تمام آلات کو ریاست یعنی حکمراں طبقے کی صورت میں منظم مزدور طبقے کے ہاتھ میں سونپ دیتا ہے۔ زندگی کو مالا مال کر دیتا ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی میں معمولی سیاسی کارکن کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ پھر ایک منزل ایسی آئی کہ مجھے نیشنل عوامی پارٹی کی "سینٹرل کمیٹی" میں جگہ ملی۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو ذی شعور محنت کش اور ان کے قائدین سے مجھے ملا تھا۔ درد کے رشتوں میں گندھ جانے کی بنا پر یہ تھا عوام کا عطا کردہ ہر تحفہ دونوں جہان کی دولت ہے۔ انسان جتنا بھی فخر کرے کم ہے

نیشنل عوامی پارٹی پارلیمانی نظام حیات کی داعی تھی آئین کی بالادستی اور چھوٹے صوبوں کے حقوق کی علمبردار تھی۔ ملک میں سوشلزم کے قیام سے مسائل کا حل ممکن ہے اسے اس بات پر یقین تھا لیکن پہلے قومی جمہوری انقلاب لانا ہی مقصد قرار پایا تھا۔ پاکستان میں اسٹیل مل جیسی بھاری کارخانہ لگوانے میں اس پارٹی کے رہنماؤں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

جس زمانے میں میں نیشنل عوامی پارٹی میں کام کر رہی تھی اسی زمانے میں میر رسول بخش تالپور جو عوامی جد وجہد کے نشان تھے۔ انہوں نے اپنے حیدرآباد کے گھر پر مجھے دعوت دی۔ دعوت میں بھٹو صاحب اور فیض صاحب موجود تھے۔ بھٹو صاحب نے میرے حق میں بہت ہی خوبصورت جملے کہے .... "فیض کا کہنا یہ ہے کہ آپ **طوطی پاکستان** ہیں .... ۲۷ نمبر کی سیٹ ناظم آباد میں ہے اس پر آپ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑیں ...... تھوڑی دیر ٹھہر کر .... آپ کو منظور ہے ...." اس سے قبل کہ میں کچھ جواب دوں میر صاحب نے بہت ہی معصومانہ انداز میں فوراً بات کاٹتے ہوئے کہا اور سائیں "پھر ڈاکٹر صاحب" تو اپنی ہے اسے ہم سندھ میں وزیر بنائیں گے۔ فیض صاحب مسکرانے لگے۔ بھٹو صاحب نے مجھ پر نگاہ ڈالی .... میں خاموش رہی۔

میں نے یہ تجویز پارٹی کے سامنے رکھی۔ فیض صاحب کا

اصرار تھا کہ میں پیپلز پارٹی میں شامل ہو جاؤں۔ انہیں ناراض کرنے کی مجھ میں جرأت نہیں تھی وہ ہر روز مجھے ہر عنوان ہر انداز سمجھانے کی کوشش کرتے لیکن چونکہ میں پارٹی ڈسپلن کی پابند تھی۔ جمال نقوی اور پارٹی کے دوسرے ساتھیوں نے اس کے خلاف فیصلہ دیا تھا۔ اس لئے میں نے بھٹو صاحب، میر صاحب اور فیض صاحب کی ناراضگی مول لے کر اپنا قطعی فیصلہ سنا دیا اور پیپلز پارٹی میں شرکت کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کر دی۔ کچھ عرصے بعد فیض صاحب نے پھر سے مجھے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس وقت طاہر محمد خاں وزیر اطلاعات تھے بھٹو صاحب کا پیغام لیکر آئے۔ وزارت اور انتخاب لڑنے کا پیغام۔ طاہر محمد خاں میرے پرانے دوست اور ساتھی تھے۔ وہ کھیتوں کھلیانوں اور پتھروں کی آغوش میں پلے تھے۔ ان سے زیادہ اس کی خواہش کسے تھی کہ وہ جھکے شانوں کو طاقت دیں۔ افسردہ رخوں کو لالی دیں خاموش نگاہوں کو آب و تاب بخش دیں۔ بہر حال دوسری مرتبہ بھی پارٹی نے وہی فیصلہ جاری کیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ بھٹو صاحب مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہو گئے۔ اسی زمانے میں روس سے میرے لیے امن کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ آیا۔ ویو پوائنٹ کے ایڈیٹر مظہر علی خاں اور ان کی بیگم کو وہاں جانے کی بھٹو صاحب نے اجازت دیدی۔ لیکن میرا نام رد کر دیا گیا۔ میں اس سلسلے میں آغا شاہی سے ملی۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں میری ملاقات ہوئی۔ لیکن آغا شاہی صاحب نے آکر یہی بتایا کہ بھٹو صاحب کا کہنا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر عالیہ اسکالر ہیں، بہت خوبصورت مقرر ہیں۔۔ "لیکن میں انہیں ماسکو جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

اس طرح حکومت کی غلط پالیسیوں کے نتیجے میں جس وقت اردو اور سندھی کا مسئلہ الجھایا گیا۔ اور میں ڈیلیگیشن کے ہمراہ اسلام آباد گئی۔ معراج محمد خاں اس وقت وزیر تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ہمارے رہنما تھے۔ رئیس صاحب، تقی صاحب ہم سب ساتھ تھے میں نے جسوقت تقریر کرنے کی اجازت مانگی۔ بھٹو صاحب غصے سے

اٹھے۔ میرے خلاف بہت سخت تقریر کی۔ اس کے بعد رو ئیداد خاں کو جو اس وقت ہوم سکریٹری تھے انہیں عتاب کا نشانہ بنایا گیا۔ "ڈاکٹر عالیہ کو آنے کی یہاں اجازت کیوں دی گئی؟" مختلف سطح پر یہ سوال کیا گیا۔ شام کو کھانا تھا۔ ہم لوگ مدعو تھے۔ ابراہیم جلیس جو اردو ادب کا صنم خانہ تھا۔ جس کے لہجے میں شیرینی اور قلم میں بے باکی جلوہ گر تھی انہوں نے جس وقت بھٹو صاحب کو یہ سمجھایا کہ نظریاتی اختلاف رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے تو بھٹو صاحب جو شعلہ بنے ہوئے تھے ایکدم شبنم کی طرح پگھل گئے۔ بڑی ہستیاں اکثر شعلہ و شبنم کے امتزاج ہی سے بنتی ہیں۔

کسی بھی طبقاتی معاشرے میں سیاسی پارٹیاں کسی نہ کسی طبقے کے مفادات سے جڑی ہوتی ہیں۔ نیشنل عوامی پارٹی بھی پیپلز پارٹی کی طرح Multi-national پارٹی تھی۔ مختلف مکتبہ فکر کے افراد اس میں شامل تھے۔ نظریاتی کشمکش ہر سطح پر جاری تھی جو پارٹی کے صحت مند ہونے کی علامت ہوتی ہے اس سے تحریک کے خد و خال کو سمجھنے اور اسے آگے بڑھانے میں مدد ملتی ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی میں نظریاتی کشمکش مختلف سطحوں پر ہمیشہ رہتی تھی۔

پیپلز پارٹی نے اقتدار سنبھالتے ہی نیشنل عوامی پارٹی کو مرکز میں ذمہ داریاں سنبھالنے کی پیشکش کی تھی۔ پیپلز پارٹی میں اس وقت حاوی گروپ ترقی پسندوں کا تھا اس لئے ان کا خیال یہ تھا کہ اگر پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد کی پالیسی پر عمل پیرا ہو جائیں تو ملک کی تمام جمہوری قوتوں کے اتحاد سے رجعت پسند طاقتوں کو شکست دینا آسان ہو جائے گا۔ اس پر مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والے افراد میں اختلاف تھا۔ ان کے سامنے بھٹو کی حکومت کو جانچنے کے مختلف پیمانے تھے۔ افسر شاہی جمہوری قوتوں کے اتحاد سے لرزاں و ترساں تھی۔ اس لئے ایسے شاطرانہ حربے استعمال کئے کہ اتحاد نہیں بن سکا۔ پیپلز پارٹی پر دائیں بازو کی قیادت نے غلبہ حاصل کیا دوسری طرف نیشنل عوامی پارٹی میں بھی ایک منزل وہ آئی جب مختلف افکار کا ٹکراؤ ہوا

پشاور اور کوئٹے کے زلزلہ خیز اجلاس ہوئے ۔ یہاں تک کہ کہا گیا کہ "بھٹو کی حکومت سے بہتر ہے کہ فوج کو "دعوت عمل" دی جائے ۔ نیشنل عوامی پارٹی کی اس فکر سے ہمارے بہت سے ساتھیوں کو اختلاف تھا ۔ فوج کے اقتدار میں آنے کی "دعوت" کو ہم نے یکسر رد کیا۔ منتخب حکومت بہر حال فوج سے بہتر ہے ۔ اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی ۔

غلام مصطفےٰ جتوئی اس وقت سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے ۔ ہم نے پریس کانفرنس کی ۔ جتوئی صاحب کی موجودگی میں میں نے اپنا پریس بیان سنایا ممتاز صحافی فرہاد زیدی ، اختر پیامی ، محمود شام ، حضور احمد شاہ صاحب اور دیگر صحافی موجود تھے ، سوالات و جوابات ہوئے اور یوں ہم نے پیپلز پارٹی میں باقاعدہ شمولیت کے بعد کام کرنا شروع کر دیا ۔ اور سیاسی کارکنوں کے کاندھے سے کاندھا ملا کر نئے سفر کا آغاز کیا

جتوئی صاحب بنیادی طور پر وڈیرے ہیں ۔ سیاسی جدوجہد انسانی ذہن کو جلا بخشتی ہے اور شخصیت کے پاٹ کو چوڑا کر دیتی ہے ۔ جتوئی صاحب کی شخصیت اسی وجہ سے سوندھی اور لطیف ہے ۔ انہوں نے تلخی دوراں کا بھی مزہ چکھا ہے اس لئے احساس جاگ اٹھا ہے ، مجروح تمنائیں ، غم زدہ ہونٹ ، ریت کے ان گنت چٹیل ٹیلے ان کی ذات میں بھی اکثر آتشیں رنگ گھولتے ہیں ۔ صرف جتوئی صاحب ہی نہیں شیخ رشید معراج خالد ، صغیر حسین جعفری ، غلام حسین ، امین فہیم ، شیر باز مزاری ، آفتاب شیر پاؤ عبداللہ بلوچ ، کمال اظفر اور این ڈی خان وغیرہ کے ساتھ بھی مجھے کام کرنے کا موقع ملا سیاسی افق پر یہ سب محبت کی علامت ہیں ان حضرات سے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا ۔

اشفاق احمد خاں سابق سفیر وسیت نام جسمانی اور ذہنی اعتبار سے قد آور انسان ہیں ۔ "ہم نے جسے عقل دی اسے خیر کثیر دیا" ، ان کے حصے میں کثیر آئی ہے ۔ تہہ در تہہ رموز حکمت و دانش سے گندھا ہوا یہ انسان حالات کی سخت

گیری سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہے لیکن "غنچہ"، "گل" سے رشتہ استوار ہو۔ انقلابی نظریۂ حیات اور اس کی تکمیل کا جذبہ صادق ہو تو انسان فولاد اور کندن بن کر ابھرتا ہے۔ اشفاق کی شخصیت کے نکھار میں ان کی خوش نظر اور خوش پوش رفیقۂ حیات توقیر کا بہت بڑا ہاتھ ہے جو زخموں کے لئے مرہم اور ٹوٹے دل کے لئے اکسیر ہیں۔ جس وقت پیپلز پارٹی میں انتخابات میں حصہ لینے اور نہ لینے کے نظریات ٹکرا رہے تھے اس وقت آہنی دلائل، فکر کی پختگی اور نظریاتی بالیدگی کی بنا پر انہوں نے انتخاب میں حصہ لینے کے حق میں ووٹ دیا جو صحیح تھا۔ اس لئے کہ پاکستان کا وجود انتخاب کے نتیجے میں عمل میں آیا دوسرے پاکستان کے مخصوص تاریخی سماجی، سیاسی، معاشی پس منظر کی روشنی میں پارلیمانی طرز فکر قومی جمہوری انقلاب لانے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ طبقاتی معاشرے میں جمہوری انقلاب کے دوران جو بھی پارلیمنٹ وجود میں آتی ہے وہ مختلف طبقات کے مفاد کی نگراں اور ترجمان ہوتی ہے اور مختلف طبقوں کے درمیان تضادات کو سمجھوتوں اور رعائتوں کے ذریعہ حل کرتی ہے۔ "لینن کے الفاظ میں "پارلیمنٹ تاریخی ارتقا کی پیداوار ہے . . . . لیکن ہم اس کو ختم نہیں کر سکتے جب تک ہم اتنے طاقت ور نہ ہو جائیں کہ بورژوا جمہوری نظام اور پارلیمنٹ کو تباہ کر سکیں" . . . . . . نظریے کی بیخ کنی پارلیمنٹ کے اندر کام کر کے کی جانی چاہیئے . . . . تاکہ مثالوں کے ذریعے عوام کو سچائی کا پتہ چل سکے صرف نظریہ نہیں . . . عوام کو عملی تجربے کی ضرورت ہے۔ تقریر۔ ۱۲ اگست ۱۹۲۰ء سکنڈ انٹرنیشنل۔

طویل سیاسی تجربے کی روشنی میں ملک میں غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کے لئے صرف انقلابی نظریہ ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لئے انقلابی تنظیم، یعنی انقلابی عمل سے مسلح پارٹی کی ضرورت ہے جو ہراول دستہ بن کر انقلاب کی صحیح سمت رہنمائی کر سکے عوام کو مسلح کرنا لازمی قرار دیا جائے۔ کیونکہ اگر کسی منزل پر منتخب حکومت کو "چلی" کے سے

واقعات کا سامنا ہو تو وہ مسلح فوج سے مقابلہ کر سکے اور اس انقلاب کو بچا سکے جس کے لئے عوام نے خونِ جگر دیا ہے ۔ یہی وہ فکری تانا بانا تھا جس سے میرے یہ ساتھی اور دوست منزین تھے ، فتح یاب خاں ، معراج محمد خاں ، اشفاق احمد خاں ، ڈاکٹر سرور ، نثار عثمانی ، انیس ہاشمی منہاج برنا ، ڈاکٹر ہارون ، شیخ رشید ، علی احمد ایڈووکیٹ ، یہ لوگ خواہ پیپلز پارٹی میں ہوں یا نیشنل عوامی پارٹی میں ان کا کام اپنا خونِ جگر دینا اور زرِ گل لٹانا ہے ۔ تپتے ہوئے تفکر ، لہجے کی آنچ بولتی ہوئی تحریر ، جاگتے ہوئے احساس کو پگھلا کر اندھیری رات میں چراغ جلانا ہے اس طرح کہ پاکستان میں صرف ایک طرف نہیں چاروں جانب اجالا ہی اجالا ہو جائے ۔ کھردرا انسان گلاب و ریحاں کا لباس پہن لے ۔ اس نظامِ حیات کی داغ بیل ہندو یا مسلمان ، عیسائی یا بدھ " سوشلزم " کے ذریعے نہیں صرف سائنسی سوشلزم ہی کے ذریعے ڈالی جائے ۔ ان سب کے ساتھ مختلف انداز سے مجھے سیاسی پلیٹ فارم پر کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے ۔

بہرحال کاروانِ آگہی پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کی قیادت میں مصائب جھیلتا ، طوفانوں سے کھیلتا آگے بڑھتا رہا . . . . . . پاکستانی معاشرے میں پائے جانے والے تضادات میں سب سے اہم تضاد جاگیردارانہ نظام اور عوام کے درمیان ہے ۔ یہی وہ نظام ہے جو " ملا " کو پالتا ہے اور اسے عوام کے مفادات کے خلاف استعمال کرتا ہے ۔ عوام نے اپنے گھر بار سیاسی شعور کی روشنی میں ہر سطح پر اس نظام کے خلاف اپنا فیصلہ دیدیا تھا ۔ اب یہ حکومت کا کام تھا کہ وہ کس طرح اقتصادی ڈھانچے کو بدل کر سائنسی نقطۂ نظر کے مطابق سماجی نظام کو ترتیب دیتی ہے ۔ پیپلز پارٹی کا ڈھانچہ کمزور تھا ۔ نظریاتی اتحاد ، تنظیمی یک جہتی نظم و ضبط ، اور انقلابی عمل میں کمی تھی ۔ پیپلز پارٹی میں ابتدا میں بائیں بازو کی سیاست غالب رہی ۔ لیکن بات زیادہ دیر آگے نہیں چلی ۔ دائیں بازو کی سیاست غالب آنا شروع ہوئی ۔ نیشنل عوامی پارٹی میں شاؤنسٹ عناصر نے جڑ پکڑنا شروع کیا ۔ دونوں پارٹیوں میں بائیں بازو کو کہنی مار کر زخمی کیا جا رہا تھا ۔ غلط فیصلوں سے غلط نتائج سامنے آ رہے تھے ۔ اس میں شک نہیں

کہ پاکستان میں طویل عرصے تک سیاسی عمل جاری نہ رہنے کی وجہ سے ابھی تک بے یقینی کا دور تھا۔ مقصد صاف نہ ہونے کی وجہ سے منزل ہنوز دور تھی۔ لیکن بہت سی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اتنا ضرور ہوا کہ **ملک کو پہلی مرتبہ ایک ایسا آئین ملا** جس پر تمام سیاسی جماعتوں نے اتفاق کیا۔ ایسا آئین جو عوامی امنگوں اور ان کی خواہشات کی دستاویز تھا۔ اسی آئین پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا گیا۔ اس کے تحت ملک کے تمام قوانین نے وقار پایا جمہوری عمل نے صورت پائی۔ اس کا چہرہ کھلا پارلیمنٹ وجود میں آئی۔ پارلیمنٹ قوم کا وقار بنی۔ انسان نے سر بلند کیا۔ عوامی شعور شعلہ بداماں ہوا۔ دیگر جمہوری ادارے وجود میں آئے۔ اقتصادی میدان میں نیا باب کھلا۔ زرعی اصلاحات ہوئیں، لگان کی شرح کم ہوئی بے زمین کسانوں میں زمین تقسیم ہوئی۔ کسان کا بوجھ قدرے ہلکا ہوا ہاری میں **پہلی مرتبہ** اپنی طاقت کا احساس بیدار ہوا۔ تعلیم کی تجارت زندگی کا شکار بن چکی تھی۔ دانشوروں اور اساتذہ کے لئے سرمائے کی چوکھٹ پر سجدہ کرنا ملازمت کی پہلی شرط تھی۔ تعلیم کو قومی ملکیت قرار دیا گیا۔ تعلیمی محکمے قومی ملکیت کا حصہ ہوں یا نہیں یہ علیحدہ بحث ہے۔ بہر حال علم کو اس کا مقام ملا۔ صحافت کو قدرے آزادی ملی، مزدوروں کو یونین سازی کا کسی حد تک حق ملا عوام کے سیاسی و سماجی شعور میں چار چاند لگے۔ ہر شعبۂ زندگی میں "خود کفالت" کے نظریہ کے مطابق کام شروع ہوا۔ تہذیبی سطح پر آرٹ اور کلچر کے فروغ کے لئے مختلف اکیڈمیز قائم ہوئیں۔

خارجہ پالیسی میں امریکہ کی مخالفت مول لے کر ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کی بات شروع ہوئی۔ اسلامی چوٹی کی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ جمہوری اور سوشلسٹ ممالک کی جانب نگاہیں اٹھیں۔ روس سے صاحب سلامت کا ذرا نرم انداز میں گفتگو کا آغاز ہوا۔

پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی حکمران نے داخلی

اور خارجی سطح پر آزاد جمہوری خارجہ پالیسی کا سنگِ بنیاد ڈالنا چاہا **لیکن** اجارہ دار سرمایہ دار ان کے حواری و حاشیہ بردار اور امریکی حکومت اس جمہوری طرزِ فکر اور اس روش کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ بالائی قوتوں کے مفادات پر ضرب پڑ رہی تھی۔ لوٹ کے بازار میں گرمی کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ امریکی مفادات اور سرمایہ داروں کے مفادات کو اب تک ہر حکومت بچاتی اور کلیجے سے لگائے ہوئے تھی۔ روایت سے بغاوت کیسے برداشت کی جاتی۔ چنانچہ باطل حق کی زد پر آکر تلملا اٹھا۔ اندھیرا روشنی کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ کسنجر نے پاکستان کا طوفانی دورہ کیا۔ بھٹو صاحب کو چتاؤنی دے دی گئی۔ " یاد رکھو! قدم آگے مت بڑھاؤ ...... نتائج کی ذمہ داری تمہاری ہے"۔ بالائی سطح پر کسنجر کی آمد " نوید سحر" لائی۔ اداس چہرے، جھکی ہوئی نگاہیں، دل جوڑ کر نہیں سر جوڑ کر اس آواز پر لبیک کہتی ہوئی میدان میں اتر آئیں۔ " ماندگی کا وقفہ" ختم ہوا " آگے چلیں گے دم لیکر"، کی منزل آگئی۔ " انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے" قوالی کا آغاز ہوا۔ بی بی سی نے لے کو تیز کرنے میں حق ادا کیا۔ روایتی شاطرانہ انداز سے عوام اور حکومت کے درمیان credi belity gap قائم کر دیا۔ پیپلز پارٹی کے قائد اور اس کے نمائندوں کی گفتگو صدالصحرا ثابت ہوئی۔ سی آئی اے نے اپنا کام دکھایا۔ جو مکھی لڑائی کا آغاز ہوا۔ محمود غزنوی اور شاہ ولی اللہ کی فکر رنگ لائی " کفر کے فتوی" برسنے لگے، "غازیوں" نے جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز کیا۔ ۲۸ / اپریل ۱۹۷۷ء میں بھٹو صاحب نے کھل کر پارلیمنٹ میں سی آئی اے کی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ اور اس بات کی نشاندہی کی کہ کس طرح ملک میں بیرونی امداد کا سیلاب امنڈ پڑا ہے ...... مذہبی جنون پیدا کیا جا رہا ہے۔ قوم کے ہاتھ سے ہوش و خرد چھینا جا رہا ہے" ۔ لیکن سب بے سود ۱۰/ مارچ ۱۹۷۷ء کی احتجاجی تحریک نظامِ مصطفےٰ کی تحریک بن گئی۔ قوالی کی لے تیز کر دی گئی۔ " ابھی بھٹو کافر ہے" " ابھی آج یوم حساب ہے" " ابھی انتخاب میں ڈنڈی ماری ہے" " ابھی نظام مصطفےٰ خطرے میں ہے"۔ نفاق کے سرکش ناقے، جہل کے بلبلاتے اونٹ، مولویوں کے ناگ، جاگیر کے

اژدہے ، لے پر رقص کرنے لگے ، " ہمارے ملک" میں آقاؤں کی " چوکھٹ " کو آنچ نہ آئے ۔ آزادی گروی رہے کوئی مضائقہ نہیں ۔ اگر خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو جائے بھی کوئی برائی نہیں چنانچہ دیرینہ خواہش پوری ہوئی ، لاہور، کراچی اور حیدر آباد میں نظم و نسق فوج کے حوالے کر دیا گیا ۔ کہا جاتا ہے بھٹو نے فوج کو بلا کر غلطی کی ۔ لیکن یہ نئی بات نہیں تھی کیونکہ دنیا میں کسی بھی جگہ جب کشیدگی ہوتی ہے تو فوج بلائی جاتی ہے ۔ بہر حال قومی اتحاد کے سربراہوں کے سامنے تجویز پیش ہوئی مولانا مفتی محمود ، نوابزادہ نصر اللہ خاں اور پروفیسر غفور نے اتحاد کی نمائندگی کی ۔ اتحاد کے ۳۱ نکات میں سے ۳۰ نکات بھٹو نے تسلیم کر لئے ۔ یوں مارشل لا نافذ ہونے سے قبل بھٹو نے عام انتخابات از سر نو کرانے کا مطالبہ تسلیم کر لیا اور یہ انتخابات ایک قومی حکومت کی زیر نگرانی ہونا طے پائے ۔ چنانچہ اسی بنا پہ ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کی شام کو پاکستان ٹائمز میں خبر تھی ،، نصر اللہ خاں صاحب کے حوالے سے ،، پاکستان قومی اتحاد میں شامل سمجھوتے کو سبوتاژ کرنے والے عناصر کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ۔

لیکن بعد میں یہ پریس کانفرنس مع اپنی سرخی کے دریا برد ہو گئی ۔ ایسے کڑے وقت میں " کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق " کی آواز گونجی ۔ بگل بجا ۔ بھٹو ،، قتل کا ملزم ،، قرار پایا ۔ نواب محمد احمد خاں رضا قصوری کے والد کا قاتل ۔ نواب جس کی نسلیں تاریخ میں انسان کا خون جونک بن کر چوستی رہی تھیں ، جن کے ،، مقدس ،، ہاتھوں نے کروڑوں نارسیدہ امنگوں کے قتل کا بازار لگایا ہے ۔ قتل کی سازش میں ملوث ہونے کے جرم میں بھٹو کو کوٹ لکھپت جیل پہنچا دیا گیا ۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۷ء کو لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس صمدانی نے بھٹو کو ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا ۔ ۱۰ اکتوبر کو بھٹو کی ضمانت منسوخ کی گئی اور دوبارہ گرفتار کر کے کوٹ لکھپت جیل لایا گیا تھا ۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء سے ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء تک مقدمے کی سماعت کے دوران بھٹو کو ہائی کورٹ لایا جاتا رہا ۔ یہاں تک عدالت عالیہ نے بھٹو کو موت کی سزا سنائی ۔ بھٹو کے وکیل یحییٰ بختیار اور مسیحی نے سزائے موت کے خلاف سپریم کورٹ

میں اپیل دائر کی۔ سزائے موت پر عملدرآمد روک دیا گیا۔ بھٹو صاحب سمیت دوسرے اور ملزم، سنٹرل جیل راولپنڈی منتقل کر دیئے۔ سنٹرل جیل جسے انگریزوں نے "کالوں" کے لئے ۱۸۲۸ء میں تعمیر کیا تھا۔ تاکہ کوئی "کالا" گوروں کی گرفت سے آزاد ہو کر بھاگ نہ جائے۔ جس کی اینٹوں اور گارے کے نیچے معصوم مسکراہٹیں دفن اور جوان لہو تڑپ رہا ہے۔ یہ جیل مخصوص اور خونناک ملزموں کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس میں بدبو اور غلاظت مخصوص طریقے پر جمع کر دی گئی تھی۔ وہ اس "مخصوص مجرم" کے حصے میں آئی۔ سال بھر کے دوران بھٹو صاحب ہی کی جیل کے پاس پیپلز پارٹی کے دوسرے کارکن، جہانگیر بدر، ناظم شاہ، میاں منیر اور پنجاب کے نہ جانے کتنے باشعور سیاسی کارکن لائے گئے۔ یہاں سے سزا کے بعد "ذوق جنوں" دو بالا ہی نہیں سہرا آتش بنا۔ پنجاب کی جیالی ماؤں بہنوں، بیٹیوں کا سہاگ مہک اٹھا۔ حنا چمکی، غرور چھلکا۔ زمانے نے جھک کر "ان مجرموں" کو اپنی سوکھی بانہوں میں لے لیا۔ افسردہ شاخ ہری ہو گئی۔ سر ماں سرخرو ہو گئی۔ تاریکی اور بڑھی۔

سپریم کورٹ نے ۶ فروری ۱۹۷۹ء، ۱۱ بجے صبح فیصلہ سنایا۔

سات میں سے چار ججوں نے عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا تین ججوں نے بری کرنے کے حق میں فیصلہ دیا۔ جسٹس دراب پٹیل، جسٹس صفدر اور جسٹس وحید۔ اس سے قبل ۲۲ دسمبر ۱۹۷۸ء عدالت عظمیٰ کے روبرو بھٹو نے طویل بیان ریکارڈ کرایا۔ تاریخ آگے بڑھی، سورج لہو لہو ہوا۔ محمود غزنوی کی روح کو سلام پہنچا۔ بھٹو کے خاندان کے افراد نے اپیل مسترد ہونے کی صورت میں رحم کی اپیل کی یحییٰ بختیار نے کال کوٹھری میں بھٹو صاحب سے ملاقات کرنے کے بعد بتایا کہ بھٹو صاحب خود اپیل کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ بھٹو کو تختہ دار سے بچانے کے لئے رحم کی متعدد اپیلیں غیر ملکی سربراہوں اور عالمی تنظیموں نے کیں۔ لیکن بات چلی نہیں۔ اتنا ضرور ہوا کہ لومبا مسکرا اٹھا۔ الیاندے کے ماتھے پر کرن پھوٹی، تاریخ نے چاند کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ جولیس فیوچک کے یہ جملے میرے ذہن نے دہرا دیئے!

"ہم سب مسرت کے لئے زندہ ہیں . . . . اس کی خاطر ہم موت سے ہمکنار ہو رہے ہیں . . . . . . ہمیں رنج و غم کے الفاظ کے ساتھ یاد نہ کرنا . . . . . یہ تماشہ گاہ نہیں ۔ زندگی ہے ۔ ہم میں سے کوئی بھی شخص تماشائی نہیں . . . . زندگی کے اسٹیج پر ہر شخص ایکٹر ہے . . . ۔ شریف ہیرو یا مکروہ ولین،" "پھانسی کے سائے،" . . ۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں ۔ محنت کشو محتاط رہو . . یہ تماشا نہیں۔ زندگی ہے پھانسی کے سائے میں (ترجمہ محمد مہدی) ۔ مغانی کے پروردگار کی یوں آواز گونجی۔

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

بالائی فضا مطمئن ہوئی ۔ لیکن زمین کنمنانے لگی ۔ بیج کو اگر ایک جگہ دفنا دیا جائے تو دوسری جگہ پودے نکل آتے ہیں ۔ ایک شاخ پر کلہاڑا چلا دیا جائے تو دوسری شاخ پر کونپلیں پھوٹ نکلتی ہیں ۔ دریا پر اگر ایک طرف بند باندھ دیا جائے تو دوسری جانب پانی بہہ نکلتا ہے ۔ سچائی کو کسی ایک نقطہ پر ختم نہیں کیا جا سکتا ۔ لہو نے رنگ دکھایا ۔ قرمزی ، بنفقشی لال رنگ ڈاکٹر ظفر عارف رسول بخش بلیجو ، ایاز سموں ، جام ساقی ، فاضل راہو ، ناصر بلوچ ، رضا کاظم جیسے کروڑوں سر دتند چراغ جلنے لگے ۔ پھول کڑی دھوپ میں مرجھا گئے ، بانہیں ٹوٹ گئیں ، مریم کی پاکیزگی سنگسار ہوئی ۔ کھڑی فصل چٹیل میدان بنی ، صحافت بدن دریدہ ہوئی ، عدلیہ سرنگوں ہوئی ، علم شرمندہ ہوا ، محنت کے پیراہن میں آگ لگی ، جگمگاتے جوان بدن لہو لہو ہوئے ۔ قوتِ احساس سلب ہوئی ۔ جرأت اظہار کند ہوئی ، جمہوریت مذاق بنی ، کلیوں کے پیروں تلے خار دار جھاڑیاں بچھا دی گئیں ۔ اسلام کا مقدس چہرہ معبدوں کی گھان میں چھپ گیا ۔ ۹۰ ر دن میں الیکشن کرانے کا خواب "شرمندہ تعبیر" نہ ہو سکا ۔ یہ سب ہوا اور خوب ہوا ۔ ہمیا باجی مسکراتی

رہیں ۔ قافلۂ عزم منزلوں کو گردِ سفر بنائے آگے بڑھتا رہا ....

اس قافلے میں بیگم بھٹو بھی شامل تھیں ...... جنہوں نے تحریک بحالی جمہوریت میں پنجاب ، سرحد ، سندھ اور بلوچستان میں درد کے رشتوں سے رشتہ جوڑ کر نہایت اہم گراں قدر کردار ادا کیا ہے ۔ بیگم بھٹو دیکھنے میں خاموش ہیں لیکن گہرائی گہرائی میں محبت کا آبشار ہیں جو ذروں کو دامن میں لے لینے کی سکت رکھتا ہے ۔ انہوں نے ایک غم سے دوسرے غم کو تسلی دی ہے وہ میر انیس کے ان اشعار کی بولتی ہوئی تصویر ہیں ۔

تم جب سے چھوٹے سا عدو بازو میں درد ہے ۔ دل میں جگر میں سینے میں پہلو میں درد ہے

رگ رگ میں کیا سر ایک بن مو میں درد ہے ۔

انہوں نے تنہائی میں آنسو پوچھے ہیں لیکن کاروان حق و صداقت کی رہنمائی کے فریضے پھر بھی انجام دیئے ہیں ۔ پاکستان کے سونا بدن اور اجالا ذہن عوام نے ہر سطح پر اس ہستی کو نذرانۂ محبت نذر کیا ہے ۔

قافلۂ صبح بہاراں میں بے نظیر بھی شامل ہے ۔ سیاست کی دنیا میں بے نظیر نوخیز کلی ہے ۔ لیکن "بزرگی بہ عقل است نہ بسال"، اس کے قد میں بھٹو کا قد شامل ہے ۔ بے نظیر کی ذات میں سندھ کی خوشبو ، آکسفورڈ کا علم و تجربہ اور ان عوام کے شعور کی نغمگی شامل ہے ۔ جنہوں نے تاریخ میں ہر سختی کو یہ کہہ کر جھٹک دیا ہے ۔

" قید کیا چیز ہے ۔ زنداں کی حقیقت کیا ہے ؟

قبر کی گود میں سوئے ہوئے سال

تیری سونی کھٹری ہوئی پہ چھائیں پر

جیل کے بھونکتے کتوں کی صدا روتی ہے

میں حقارت سے نظر ڈال کے ہنس دیتا ہوں

....

شعلے آواز کے اس شان سے ہوتے ہیں بلند
آگ لگ جاتی ہے زنداں کے سیہ خانے میں
میرے احساس و تصور کو ہزاروں سورج
لاکھوں چاند اور کروڑوں تارے
رنگ اور نور کی بارش میں بھگو دیتے ہیں
ہم سفر یہ ہوں تو پھر عزم سفر کیا کہنا
رنگ شب یہ ہو تو پھر رنگِ سحر کیا کہنا

پیپلز پارٹی کے قائد اس بات سے واقف ہیں کہ یہ عہد دو متضاد نظریات اور دو متصادم نظام حیات کے ٹکراؤ کا عہد ہے ۔ جس میں ایک طرف سامراج اور اس کے حاشیہ بردار ہیں اور دوسری جانب اشتراکیت ، قومی آزادی اور قومی جمہوری انقلاب کا کارواں ہے ۔ یہ عہد اشتراکیت کی فتح و کامرانی کا عہد ہے ۔ قومی آزادی کے انقلابات کی فہرست طویل ہے ۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک تقریباً ۱۰۰ ممالک نے استعماریت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے بعد سیاسی آزادی حاصل کرلی ہے ۔ بعض ملکوں میں آزادی ادھوری ہے اس لئے کہ استعماری طاقتوں نے نو استعماریت کا روپ دھار کر معاشی امداد کا پُھندا ، کھول کر عوام کی سیاسی آزادی کو شکنجے میں اسیر کر دیا ہے ۔ لیکن جمہوریہ شام ، عوامی جمہوریہ کانگو ، عوامی جمہوریہ موزمبیق ، جمہوریہ گنی بساؤ وغیرہ وغیرہ نے نوآبادیاتی جوا اتار کر حقیقی آزادی حاصل کرلی ہے ایشیا ، افریقہ ، اور لاطینی امریکہ کی طرح پاکستان کو ورثے میں برطانوی سامراج نے پسماندگی ، زرعی ناگفتہ بہہ صورتحال ، ناخواندگی ، بیماریاں ، قبائلی اور جاگیری سماجی رشتے دیئے ہیں ۔ آج برطانوی سامراج کی جگہ امریکی سامراج نے لے لی ہے اور اس نے پاکستان کو " جغرافیائی صورتحال " کے تحت اسے اپنی نوآبادی قرار دینا طے کیا ہے چنانچہ آج پاکستان کی معیشت ، سیاست ، تہذیب امریکی سامراج کے شکنجے میں جکڑی ہوئی

گزارہ رہی ہے۔

پاکستان اس وقت تاریخ کے نازک ترین دور سے گذر رہا ہے۔ عوامی سطح پر وہ تمام قوتیں جو جواں قدروں کی خالق ہیں۔ جن کی جدت فکر و نظر اور انقلابی عمل انقلابات کو جنم دیتی ہیں۔ جو گنگ کو جرأت اظہار بخشتی اور اعلیٰ اقدارِ حیات کو عملی جامہ پہناتی ہیں۔ وہ سامراج کے خلاف صف بستہ ہیں۔ ایسے وقت میں نظریاتی پختگی سے مسلح پارٹی کی ضرورت ہے جو تمام سامراج دشمن قوتوں کو ایک لڑی میں پرو لے اور ملک میں قومی جمہوری انقلاب کے لئے راہ ہموار کرے۔ اس جدوجہد میں صرف محنت کش، مزدور، کسان، طلبا دانشور صحافی، اساتذہ ہی نہیں بلکہ قومی بورژوازی، اور رجعت مخالف تمام طبقوں کی حمایت حاصل کی جائے۔ اس طرح ایک ایسے نظامِ حیات کی داغ بیل ڈالی جائے جہاں مزدوروں کو ان کے کارخانے، کسانوں کو ان کی زمینیں، طلباء کو ان کے اسکول اور کالج، اساتذہ کو وقار، صحافیوں کو آزادئ صحافت، وکلا کو پیشے کی آزادی، عدالت کو اس کا حقیقی منصب عورتوں کو مساوی حقوق ملیں۔ چاروں طرف اجالے کا نظام ہو۔ ہر ماں کے آنگن میں چاندنی چھلکے، بچے مسکرا اٹھیں۔

پاکستان میں گھمسان کا رن پڑنے کو ہے۔ ایران کے انقلاب نے آمر کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ پاکستان کے عوام انقلاب کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔ "نوید سحر" کے منتظر ہیں۔ طوق و زنجیر کی گراں باری نے عوام کے حوصلے بلند اور بلند کر دیئے ہیں۔ ایسا حوصلہ، ایسا عزم، ایسا یقین، جواں طاقتوں سے جڑ کر پیدا ہوتا ہے جو طوفانوں کو بادِ صبا اور دھوپ کو چاندنی میں بدل کر تمام کرۂ ارض پر چھا چکی ہیں جواں نگاہیں پیپلز پارٹی کے جوان شعور و عمل کی جانب نگراں ہیں۔ پیپلز پارٹی کی منزل اس وقت پل صراط سے گذرنے کی ہے۔ اس لئے کہ جماعت کے اندر جاگیردار، سرمایہ دار، متوسط طبقے، محنت کشوں اور نشلسٹ عناصر کے مفادات میں ٹکراؤ ہے۔ تعجیل کی کھسلن ہے۔ غیر عقلی

والبستگیاں ہیں ۔ مرغوب عام سطحی دلیلیں ہیں ۔ بڑے دھرسیاں اور انا کے مسائل ہیں ۔ ایسے عاشق ہیں جو معشوق کو لباس کی طرح بدلنے کو تیار ہیں ۔ منطق استدلال نا آشنا ہیں ذہنی تربیت سے نابلد ہیں ۔ دیہروں فقیروں ، کے جذباتی طوفان ہیں ۔ مضبوط ارادہ شدت چاہتا ہے اعلیٰ مسلک حیات شدت و حدت کا طالب ہے ۔ دوسری جانب گہری گھاٹیاں ہیں ، تعصبات کے جھاڑ جھنکار ہیں ۔ عہدوں کی کھلبلی ہے ہر موڑ پر چند آنکھیں گراں سرِراہ پر اک لائسنس طلب کی منزل ہے ۔ بہت سے ایسے ہیں جو پست صبحوں اور معرکوں بری عادتوں اور خواہشوں کے غلام ہیں ۔ غلط افکار اور خیالات کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں ۔ ایسے وقت میں پارٹی کو از سرِ نو ترتیب دینا ، جمہوری انداز فکر اختیار کرنا اور فرد کی انا کو ہر سطح پر جماعت کے نقطۂ نظر کا پابند بنانا ضروری ہے ۔ ساتھ ہی پرانی غلطیوں پر نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے ۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پیپلز پارٹی نے بعض ایسی غلطیاں کیں جن کا ازالہ ممکن نہیں مثلاً

۱ ۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح صاف ہے کہ کھیتوں کھیت اور کھلیان کے سینے سے رگ کر چلا ۔ چاند بن کر قلوب انسانی میں اترا ۔ ہر کلی اور ہر بوٹے پر حکمرانی کی ۔ ایسے وقت میں لازم تھا کہ حقیقی جمہوریت کی مضبوط داغ بیل ڈالی جاتی ۔ صحافت کو آزادی ملتی ، عدلیہ کا وقار قائم ہوتا ۔ نقد و نظر کو آزادی ملتی ۔ مزدور کسان ، دانشور کو اس کا صحیح حق ملتا ۔ ہر سطح پر آزادی ملتی تاکہ تنقید کے ذریعے مسائل واضح ہوتے اور عمل آسان ہوتا ۔

۲ ۔ پارٹی کی جمہوری خطوط پر تنظیم کی جاتی cadres تیار کیا جاتا تاکہ قومی ملکیت میں لی گئیں صنعتیں بیوروکریسی کے ہاتھ میں جانے کے بجائے پارٹی لیڈر کے حوالے کی جاسکتیں ۔

۳ ۔ عوامی فوج تیار کی جاتی اور اس کی سربراہی نظریاتی پختگی

سے منزتین پارٹی کے ذمہ دار افراد کو سونپی جاتی۔ "جو نازک وقت" پہ سربراہ مملکت کی مدد کو آسکتا۔

۴۔ مشرقی بنگال کے روح فرسا واقعات کے بعد کسی بھی فوجی ادارے کو blood transfusion کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ فوج ملک و قوم کا وقار ہوتی ہے جس طرح اس کی دیکھ ریکھ کرنا حکومت کا فرض ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کا فرض ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت ہوتی ہے۔ یہی وہ فریضہ ہے جو ہماری فوج کو انجام دینا چاہیئے تھا۔ لیکن "چند نادانوں" نے بلا وجہ اسے سیاست میں ملوث کر کے اس کے وقار کو مجروح کیا۔

۵۔ اقتصادی رشتوں میں بنیادی تبدیلی لائی جاتی۔ جاگیرداروں کی گرفت سے معشیت کو نکال کر صنعتی انقلاب لانے کے لئے فضا ہموار کی جاتی اس کے لئے دستکاروں اور صنعتوں کو بڑھاوا دیا جاتا۔ زرعی شعبے میں صرف ۵ مرلے زمین کسانوں کو دینے کی بات کی گئی جاگیرداروں کی سازشوں کے نتیجے میں وہ عملی جامہ نہیں پہن سکی۔ جاگیردار جس وقت ہاری کو بے دخل کرتا تو صرف کھیت نہیں بلکہ اسے گھر سے بھی نکالا جاتا اس لئے اسے ۵ مرلہ زمین کی ضرورت تھی تاکہ وہ گھر بنا سکے۔ اس کے علاوہ عوام نے الیکشن میں مذہبی جماعتوں کو رد کیا اور پارٹی کے معاشی پروگرام پر اپنے جھلملاتے شعور کی مہر ثبت کی۔ لیکن رجعت کی قوتوں کے دباؤ میں آکر بھٹو نے ایسے مذہبی اقدامات کیے جس سے پارٹی کے سیکولر مزاج کو دھکا پہنچا۔

۶۔ طلباء، دانشور، مزدور، سیاسی کارکن اور دیگر ذی شعور عناصر سے رشتے کو مضبوط بنایا جاتا۔ لیکن یہاں بیوروکریسی نے خاموشی کے ساتھ انتہائی چالاکی اور Conecaled form انداز میں ایسے ہتھکنڈے چلائے کہ بھٹو اور عوام کا رشتہ آہستہ آہستہ کٹنے لگا۔ اور وہ سیاسی کارکن جنہوں نے پارٹی کی نیو میں اپنا خون دیا تھا پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے جوان ذہن جنہوں نے بھٹو کو اپنا سب کچھ دیا تھا انہیں

دور کر دیا گیا۔ وقت سے پہلے الیکشن کا جال پھینکنا،، "وزراء اعلیٰ کو کامیاب کرانا" "بغیر دھاندلی" کا منصوبہ بنانا سب ایک ہی سازش کی کڑیاں تھیں۔ جو عوام سے رشتہ نہ ہونے کے سبب رچی گئیں۔

۷۔ خارجی سطح پر ان اہم کارناموں کے باوجود کہ تیسری دنیا کے عوام کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر ایک نئے اقتصادی نظام دینے کی کوشش کی۔ ویت نام، شمالی کوریا اور پی ایل او کو باقاعدہ تسلیم کیا گیا۔ جمہوری طرز فکر کو فروغ ملا۔ لیکن سامراجیوں سے رشتہ کاٹنے اور غیر وابستگی کی پالیسی اپنانے میں جو رول بعد میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی وہ اس وقت کی جانی چاہئے تھی جب پتے پتے پر بھٹو کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس لئے کہ دیرینہ تجربے کی روشنی میں یہ بات واضح تھی کہ امریکی سامراج پاکستان کا کسی بھی عنوان دوست نہیں ہے وہ صرف اپنے "مخصوص مفادات" کا دوست ہے۔ vested interests پر کڑی ضرب لگانے کی ضرورت بہت پہلے تھی۔ عوام آج کی طرح اس وقت بھی امریکی سامراج کے خلاف غم و غصہ کا اعلان کر چکے تھے لیکن ان کا غصہ انقلاب کا پرچم نہ بن سکا

۸۔ پیپلز پارٹی کے قائد نے بعض جذباتی فیصلے کیے۔ ایسے وزیروں، سفیروں، امیروں اور مذہب فروشوں کو اپنے گرد حلقہ بنا کر بھنگڑا ڈالنے اور پھر اسے رکشی کرنے کی اجازت دی جن کے مقدس ہاتھوں نے "کارہائے نمایاں انجام دیکر عوام کو لہو لہان کیا۔

۹۔ پاکستانی بلوچستان پر شاہ کی خاص نظر عنایت تھی۔ بلوچستان میں جمہوری قوتوں کی موجودگی اس کے لئے دردسر تھی۔ شاہ کو خوش کرنا پاکستانی سیاست کا دیرینہ مزاج تھا شاہ پرستی" پڑنے کی وجہ سے بھٹو پر دباؤ ڈالا گیا۔ بیوروکریسی نے حق نمک ادا کیا فوجی کارروائی کی گئی اور وہاں کی منتخب حکومت کو توڑ دیا گیا۔ یہ عمل انتہائی غیر جمہوری تھا۔ اس کارروائی میں شاہ کی خوشنودی، بیوروکریسی کے علاوہ وہاں کی مینگل حکومت

کی غلط پالیسیوں کو بھی دخل تھا ۔ اس میں شک نہیں کہ پنجاب کی سول اور فوجی بیوروکریسی نے ہمیشہ جاگیردار، سرمایہ دار اور اجارہ دار سرمایہ داروں نے سامراج سے مل کر چھوٹے صوبوں کی حق تلفی کی ہے ۔ ہر سطح پر احساس محرومی کو جنم دیا ہے ۔ چھوٹے صوبوں کو کالونی بنا کر ان کا استحصال واجب جان کر کیا ہے ۔ لیکن چھوٹے صوبوں کی حق خود اختیاری کی بات جس وقت شروع ہو تو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ پنجاب کے عوام بھی وہاں کا کسان اور مزدور بھی اتنا ہی محروم ہے جتنا کہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کا ہاری اور مزدور ۔ وڈیرا اور سرمایہ دار خواہ پنجاب کا ہو یا بلوچستان و سرحد و سندھ کا سب کا طبقاتی مفاد یکساں ہے ۔ مفادات پر ضرب پڑنے کے نتیجے میں جس وقت حکومت کی گولی چلتی ہے تو پنجاب کا کسان اور سندھ کے ہاری میں تمیز نہیں کی جاتی ۔ اس لیئے کہ پنجاب کے کسان و مزدور، سندھ کے ہاری ، بلوچستان کے کسان اور سرحد کے مزدوروں کے مفادات یکساں ہیں ۔ یہ سب مظلوم طبقے ہیں ۔ بعض " نشنلسٹ قائدین " چھوٹے صوبوں کی بات کرتے وقت "شاؤنسٹ" کردار ادا کرتے ہیں جو انتہائی خطرناک رجحان ہے جس کا سرا فاشزم سے ملتا ہے Natenalist ہونے کے ساتھ International ہونا ضروری ہے ۔ " دنیا کے مزدور ایک ہیں " یہ نعرہ اسی کی دین ہے ۔ چلی میں جب الیاندے کی منتخب حکومت کا تختہ الٹا جاتا ہے ۔ تو یہاں کے محنت کشوں کے مفادات پر بھی ضرب پڑتی ہے ۔ جمہوری تحریک کا بین بین الاقوامی رشتہ ہے جو قومی حدود کو توڑ دیتا ہے ۔ جب نیویارک میں سونے کا بھاؤ بدلتا ہے تو تیسری دنیا کے دور دراز علاقوں میں غلہ مہنگا ہو جاتا ہے ۔ نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت کا بلوچستان کے عوام کے حق میں آواز بلند کرنا اور انہیں محرومیت سے ہر سطح پر نجات دلانا ضروری تھا لیکن معصوم پنجابیوں کو بہ یک جنبش قلم نکالنا ، اور انہیں گھر سے بے گھر کرنا جو صدیوں سے وہاں بس گئے تھے اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غم کے درمیان زندگی گذار رہے تھے غلط پالیسی کا نتیجہ تھی ۔ بلوچستان کا مسئلہ بہر حال افہام و تفہیم سے حل ہونا چاہیئے تھا ۔ کیونکہ " سنگین " مسئلہ کو اور سنگین بناتی

ہے ۔ حل نہیں کر سکتی ۔

پیپلز پارٹی کی قائدین کے سامنے پیپلز پارٹی اور پاکستان کی تاریخ ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اس پارٹی سے غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پیپلز پارٹی کے ذریعے محلاتی سازش کا کم و بیش خاتمہ ہوا ۔ ایوب و سکندر کی سازشی سیاست کا باب وقتی بند ہوا ۔ کھیتوں ، کھلیانوں ، کارخانوں ، اسکولوں ، دانش گاہوں اور میدانوں سے سیاست کا سورج طلوع ہوا ۔ عوام سے سیاسی شعور لے کر انہیں روشن اور صاف سیاسی شعور دیا گیا ، چمن کی مختلف طریقے سے شیرازہ بندی کی گئی ۔ یہی " بات تھی جو انہیں بہت ناگوار گذری " تاریکی نے دامن پھیلا دیا ۔ دلداران چمن کے لبوں پہ مہر رکھی گئی ۔ چمن لہو لہان ہوا ۔ سورج شاخوں پہ چمکنے لگے ۔ کلیوں کی آنکھوں میں آنسو ہی آنسو تھے ۔ آنسو پھر گہر بننے لگے ۔ یہ کیوں ہوا ؟ یہ کس لئے ہوا ؟ ہر ذہن کے دریچے وا ہوئے ۔ حق والوں نے سوالات کی بوچھار کر دی ۔ تاریخ نے جواب دیا کہ برطانوی سامراج نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے تین قوتوں کو باقاعدگی سے تربیت اور تعلیم دی ۔ ۱ ۔ بیوروکریسی ۲ ۔ زمیندار ۳ ۔ ان مل فوج ۔ تینوں نے مل کر ہر نوآبادی میں " جلیان والا باغ " بنایا ۔ بھگت سنگھ کو پھانسی پر چڑھایا ۔ برطانوی سامراج عوام کی طاقت سے گھبرا گیا ۔ نہ ڈوبنے والا سورج ہر طرف غروب ہوا ۔ تو اس کی جگہ عالمی سامراج امریکہ نے لی ۔ براہ راست قبضہ کرنے کی پالیسی کے بجائے ورلڈ بنک ، آئی ایم ایف یعنی استحصال کی عالمی منڈیوں نے جنم لیا ۔ اور فوجی معاہدوں اور معاشی قرضوں کے بندھن میں سیاسی آزادی کو جکڑ کر اپنا نوآبادی استعماری نظام قائم کر دیا ۔

دوسری عالمگیر جنگ نے ایک طرف ، عالمی سامراج ، کو نئی طاقت ، بخشی دوسری جانب اس نے " تیسری دنیا " نو آزاد ممالک ، انقلابی جمہوریت ، اور اشتراکی جمہوریت اور ترقی پذیر جیسے مصطلحات کو جنم دیا ۔ حق خود اختیاری کی تحریک عام ہوئی ۔ سینکڑوں ممالک نے معاشی اور سیاسی آزادی حاصل کی ۔ اشتراکی نظام حیات اپنایا

ملک کو صنعتی اور سیاسی استحکام دیا۔ غربت و افلاس دور کر کے ملک کو جنت نظیر بنانے کی سعی کی۔ اور دنیا کو دو واضح نظام حیات میں تقسیم کر دیا۔ ایک طرف حقیقی جمہوریت دوسری طرف سامراجی استحصالی نظام۔

ہمارا مقدس ملک پاکستان "خشت اول چوں نہد معمار کج" کی منزل پر ہے۔ برطانوی سامراج کی باقیات سے اس کا خمیر اٹھا ہے۔ فوجی معاہدے، معاشی قرضے اس میں شامل ہیں سیاسی و معاشی محکومی اس کا مقدر ہے۔ صنعتی ترقی کی رکاوٹ جاگیردار ہیں جاگیردار کے ہمدرد پیر صاحبان ہیں جو اژدھے کی طرح عوام کو نگل رہے ہیں۔ "قبائلی سردار" ترقی کے دشمن موجود ہیں۔ بڑی زمینداریاں زمین کا سونا نگل رہی ہیں یوں تہہ در تہہ طبقات در طبقات موجود ہیں صرف سرمایہ اور مزدور نہیں۔ امریکی سامراج کی گرفت جن ممالک میں کمزور پڑی ہے وہاں صنعتی ترقی ہوئی اور صنعتی مزدور یعنی پرولتاریہ نے سامراج کے استحصال سے ٹکر لی ہے۔ پاکستان میں پرولتاریہ نے ملک میں غیر استحصالی نظام حیات کے لئے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن یہاں دو باتیں ہیں اول تو یہ کہ اس ملک میں بڑے کارخانے جاگیردار صاحبان کے کرم کے نیچے میں لگنے نہیں پاتے۔ اس لئے صنعتی مزدور کی تعداد جتنی بڑھنی چاہیئے تھی وہ نہیں ہو سکی اس کے علاوہ یہاں اوسط درجے کے کارخانے ہیں جن میں مزدوروں کی تعداد ظاہر ہے زیادہ نہیں ہے۔ چھوٹی صنعتوں میں کام کرنے کی وجہ سے مزدور کا طبقاتی اتحاد جس طرح سرمایہ دار کے خلاف منظم و مستحکم ہونا چاہیئے وہ نہیں ہے۔

یہی صورتحال زراعت کی ہے۔ ترقی پسندانہ اصلاحات کا فقدان ہے۔ زمینداروں کا طبقہ جو حکومت میں شریک ہے وہ سیاسی و معاشی طور پر مضبوط ہے ان کے مفادات سامراجی ممالک کی اجارہ داریوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جس وقت بھی جمہوریت کی لے تیز ہوتی ہے۔ تمام اجارہ داریاں سر جوڑ کر سامراج دشمن عوام کی سیاست میں جمہوری طرز اپنانے سے روکنے کے لئے متحد ہو جاتی ہیں۔ ان زمینداریوں سے نوکرشاہی کے

رشتے مضبوط ہیں ، وہ زمین کی بھی مالک ہے اور حکومت میں بھی برابر کی حصہ دار ہے ۔ مجموعی طور یوں تمام بالائی طاقتوں کا مفاد یکساں ہے اور اس کی حفاظت کے لئے وہ عالمی سامراج سے جڑا ہوا ہے ۔ اس عہد میں اعلیٰ اقدار حیات کو یوں انڈیل دیا ہے جیسے دیگ سے باسی کھانا الٹ دیا جاتا ہے یا جس طرح ایک بوڑھا انسان نوجوان عورت سے زنا بالجبر کرتا ہے اور نتیجے میں اسے سوائے بیماری ، افلاس اور گندگی کے اور کچھ نہیں دے سکتا ۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کی تمام جمہوریت نواز ، ترقی پسند سامراج دشمن قوتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر بدی کو یوں نیکی سے جدا کر دیں جیسے درزی پرانے کپڑے کی سلائی ادھیڑتا ہے ۔ صرف سامراج نہیں بلکہ سامراج نواز طبقوں کے خلاف صف آرا ہوں ۔ جوں جوں سامراج دشمن ترقی پسند قوتیں اپنی مضبوط اور مستحکم جدوجہد کے ذریعے تحریک کو آگے بڑھائیں گی ویسے ہی قومی جمہوری انقلاب کی باگ ڈور انقلابی جمہوریت پسندوں اور محنت کش طبقوں کے ہاتھ میں ہوگی ۔ اس کے لئے مزدور اور انقلابی قوتوں کا اتحاد لازمی شرط ہے تاکہ انقلابی قوت 'متحدہ محاذ' میں تاریخی کردار ادا کر سکے ۔ اور "موت پرور دہ نظام" کو ڈھا کر حیات پرور نظام کی داغ بیل ڈالی جا سکے ۔ سیاہی کے پیچھے سورج ہے ۔ برف کے آنچل میں آبدار پانی ہے ۔ صدف کی آغوش میں موتی ہے ۔

پیپلز پارٹی اپنی بے بہا قربانیوں اور جانفشانیوں اور سرفروشیوں کے سبب ہر ذرے کے سینے میں اپنی جگہ بنا چکی ہے ۔ وہ مکمل تحریک ہے ۔ استحصالی نظام سے نجات دلانے کی ۔ سمندر ہے ہر لہر کو اپنی آغوش میں لے لینے کی ۔ یہ سب کچھ ہے لیکن پانی کبھی ادھر ادھر کبھی ادھر بہہ سکتا ہے ۔ قربانیاں رائیگاں ہو سکتی ہیں ۔ ترسی ہوئی نگاہیں اور جھلس سکتی ہیں ۔ عوامی تحریک کو ڈیم بننے کی ضرورت ہے سمت متعین ، رخ متعین ، اس کے لئے مضبوط ، پائیدار تنظیم کی ضرورت ہے ۔ حقیقی جمہوری تنظیم بنانا پہاڑ کا سینہ کاٹ کر جوئے شیر لانا ہے ۔ نہ کوہکن نئے پیکر شیریں تراشنا ہے ۔ پارٹی تنظیم عمل کی جانفشانی اور فکر

کی پختگی کی طالب ہے ۔ جمہوری طرزِ فکر کی طالب ہے ، صحت مند تنقید کی طالب ہے تاکہ کسی بھی سطح پر شخصیت پرستی یعنی personality cult کا تشویشناک رجحان جڑ نہ پکڑ سکے ۔ کیونکہ یہ بات نتائج کے اعتبار سے کبھی بھی خوش آئند نہیں ہو سکتی کیونکہ اس نہج سے سیاسی کارکن آزادانہ غور و فکر سے عملاً محروم ہو جاتے ہیں ۔ تقلید ذہنوں کی تازگی چھین لیتی ہے ۔ اجتماعی فکر سے بلند کوئی بھی فرد نہیں ہو سکتا ۔ دوسری بات یہ کہ جمہوری طرزِ فکر اور تنقید کے صحت مند پہلو پر سدِباب سے اختلاف رائے کی گنجائش یکسر ختم ہو جاتی ہے ۔ اختلاف کرنے والے کے خلوص ، فکری بالیدگی اور وفاداری پر شک در شک کی داستان امیر حمزہ ، کھول دی جاتی ہے اور فکر پر قدغن کے سبب بہت سے مخلص سیاسی کارکن یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔

ع پڑ رہوں شکوے میں یوں راگ ہے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے ۔

پیپلز پارٹی نظریاتی اعتبار سے سوشلسٹ معشیت کی قائل ہے ۔ پارٹی کے اندر سیاسی کارکنوں کی تربیت ضروری ہے ۔ سوشلسٹ معشیت کیا ہے ؟ اس کے خدوخال کیا ہیں ۔ کسانوں میں انفرادی طور پر زمینیں بانٹنے کے بجائے collective farming یا اجتماعی کھیتی باڑی کے اصول کیا ہیں ؟ کارخانے قومی ملکیت میں لینے کی پالیسی اور اس پر عمل پیرا ہونے کے طریقے کیا ہیں ؟ داخلی اور خارجی سطح پر ہر سیاسی کارکن کی سیاسی تربیت ضروری ہے تاکہ صحیح کاڈر تیار ہو جو اسلحے سے مزین ہو جس کی فکر میں پختگی ہو تاکہ ہر crisis میں وہ ڈھال بن جائے

آج قومی اور بین الاقوامی نگاہیں تحریک بحالی جمہوریت کے قائدین ، پیپلز پارٹی کی جانب نگراں ہیں ۔ تمام سیاسی جماعتوں کو یہ اہم تاریخی کردار ادا کرنا ہے ۔ امام آیات و اذکار حضرت جوش ملیح آبادی کی آواز فضا میں ترانہ بند گونج رہی ہے ۔

ع لہلائے آپ ورنگ کا ڈیرا قریب ہے ۔
تارے لرز رہے ہیں سویرا قریب ہے ۔

"عروج" اور "زوال" یہ الفاظ ہیں تو بہت مختصر۔۔ لیکن ان کے بطن میں دنیا لئے معنی پنہاں ہے۔ ترقی و تنزل، شکست و ریخت کی داستان، کائنات کی ہر شے میں نقطۂ عروج سے نقطۂ زوال کی کہانی رقم ہے۔ "عروج مہر" میں "دوپہر" کا عمل کار فرما ہے پھول کے تبسم میں پنکھڑیوں کے بکھرنے کا سامان موجود ہے۔ معاشی و سیاسی حقائق تبدیلی کے اس مزاج سے خارج نہیں۔ تصورات کا مقدر بھی تغیر ہے غرضیکہ کائنات کی ہر حقیقت میں عروج و زوال کا یہ فطری عمل جاری و ساری ہے۔۔۔ جدلیاتی اور تاریخی مادیت کے اصولوں ہی کے تحت معاشرے نے ہمیشہ رنگت بدلی۔ معاشی رشتوں نے کروٹ لی غلامی نے جاگیرداری کے لئے جگہ بنائی۔ جاگیرداری نے اپنی سند سرمایہ کے حوالے کی۔ سرمایہ داری نے معاشرتی نظام کی باگ ڈور اشتراکیت کے حوالے کی۔ تمام تبدیلیاں خواہ مادی سطح پر ہوں یا فکری اسی فطری عمل کی رہین منت ہیں۔

سامراج سرمایہ دارانہ نظام حیات کا نقطۂ عروج ہے۔۔۔

جس کی نو استعماری حکمت عملی نے آج ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ کے لاتعداد خطوں پر قائم کردہ اعلیٰ طبقاتی فوجی جنتا کے ذریعے اپنا چنگل گاڑ دیا ہے۔ یہ تمام حکومتیں کٹھ پتلی کا تماشہ ہیں، جن کی چھپی ہوئی ڈوریاں سامراج کی مٹھیوں میں ہیں۔ "تماشہ گاہ میں تماشہ" ہوتا رہتا ہے۔۔۔۔ مداری بتیسی نکالے تماشہ دکھلاتے رہتے ہیں۔ لیکن جس وقت کٹھ پتلیاں "صحیح خدمات" انجام دینے سے قاصر رہتی ہیں تو انہیں کسی خاص "ضرورت" کے تحت "ناگہانی" اور "فوری انقلاب" کے ذریعے ہٹا بھی دیا جاتا ہے تاکہ فوجی آمریت کا کاروبار کسی اور کٹھ پتلی کے حوالے کر دیا جائے جن کے "کپڑے تو عوامی ہوں وضع قطع بھی عوامی ہو۔۔۔ لیکن احکام کی بجاآوری عوام کیلئے نہیں بلکہ آقا کے مفادات کی تابع ہو"۔۔۔۔

تمام ترقی پذیر اور پس ماندہ ممالک کی اقتصادی غلامی سامراجی

حکمت عملی اور نو استعماریت کی شرط اولین ہے۔ سامراجی سمندر پار اپنے توسیع پسندی کے عزائم کی تکمیل کے لئے "پس ماندہ ممالک کی مشترکہ ترقی" کے پُرفریب ورکشاپ کے نعرے کے تحت "عالمی نام نہاد امداد کے اداروں" کے ذریعے جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے اپنی جارحیت کے استحکام کے لئے ملک کے اجارہ دار سرمایہ دار اور اعلیٰ طبقاتی فوجی جنتا کے ذریعے راہ ہموار کرتے ہیں تاکہ صرف معاشی اور سیاسی ہی نہیں بلکہ نظریاتی اور ثقافتی نفوذ کے ذریعے اس ملک کی قومی آزادی کے خدوخال چھین لیں۔ اس کا قومی تشخص مجروح کریں۔ اس کی خوداعتمادی وخودنگری کا جوہر بہا کر لا دیں۔ کاسۂ گدائی کی خو رگ رگ میں سرایت کر دیں۔ احساس کمتری میں مبتلا کر کے قوم، نسل اور زندگی کے ہر گوشے کو مفلوج اور بے چہرہ بنا دیں۔ ۔ ۔ گانا ہو تو ایلوس پریسلی کا ۔ ۔ ۔ ۔ کپڑا ہو تو امریکی طرز کا ۔ ۔ ۔ رقص ہو تو رمبا سمبا اور بریک ۔ ۔ ۔ چہرے نقلی ہوں، علم، سائنس، ترقی، جو مغربی دنیا کا کارنامہ ہے۔ اس دنیا کی نسل بے بہرہ اور نابلد رہے ۔ ۔ ۔ صرف کھوکھلا قہقہہ صرف کھوکھلی ہنسی ۔ ۔ ۔

سامراجیت کے اس جارحانہ نظام فکر نے عالمی سطح پر دو مخالف قوتوں اور تحریکوں کو جنم دیا ۔ ۔ ۔ اول قومی سطح پر محنت کشوں کی تحریک کو ۔ ۔ ۔ جس نے اپنے قومی تشخص اور معاشی برابری کے نظام کے لئے تمام محروم طبقوں کے ساتھ جڑ کر سامراج دشمن انقلاب برپا کیا، کیونکہ سامراج اور اس کے حواریوں کو مٹائے بغیر انقلاب بے معنی ہے۔ بے چہرہ ملک سامراج کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے بعد ہی حقیقی چہرہ پاتا ہے۔ تشخص کے معنی سمجھتا ہے اس سے پہلے نہیں۔ ۔ ۔ دوسرے سامراجیت کے اس جارحانہ انداز فکر نے بین الاقوامی سطح پر حق خودارادیت کے تصور کو جنم دیا۔ جس کے نتیجے میں تمام غلام ممالک میں سامراج دشمن تحریکوں کا آتش فشاں پھٹ گیا۔ حریت، آزادی، امن، اشتراکیت کا لاوا چاروں طرف بہہ نکلا۔ جسے سنگینوں سے روکنے، امداد سے توڑنے

سازشوں سے جوڑنے کی کوشش کی جانے لگیں ۔ لیکن آج سامراج اپنے اندرونی تضادات کے بھنور میں پھنس چکا ہے ۔ " زار کا تخت ہوا ہے جسے تناطیں کھینچ کر ، اور سائبان ڈال کر روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ ۔ ۔ جنگ کا بگل بجانا ، عوامی رہنماؤں پر شب خوں مارنا ، انقلابی حکومتوں کا تختہ الٹنا ، انقلابی تحریکوں کو خون میں نہلانا ، قریہ ، قریہ ، گلی گلی رحلئے بنانا ۔ ۔ ۔ سامراج کا اور اس کی کٹھ پتلی حکومتوں کا " دل پسند" کھیل تماشہ ہے ۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ عہد عظیم الشان عوامی جدوجہد اور انقلابی جوش و عمل کا ہے ۔ آج عالمی سطح پر انقلابات رونما ہو چکے ہیں ۔ ویت نام ، کوریا ، ایران ، مثالیں پیش کر چکے ہیں ۔ زمین کو رنگت بخش چکے ہیں ۔ " آج سامراج دشمن قوتیں ، سامراجی قلعے ، کھیر چکی ہیں ۔ پس ماندہ قوتوں نے آزادی کا راستہ دیکھ لیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایشیا ، افریقہ لاطینی امریکہ میں محنت کش عوام کا پرچم بلند ہو چکا ہے ۔ انقلاب کا سیل رواں بڑھ رہا ہے ۔ بادبان مخالف ہوا کے دوش پر بلند ہو رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اس لئے ہے کہ عوام عروج و زوال کے عمل کے رمز آشنا ہیں ۔ یہ عہد ساز ہیں تاریخ ساز ہیں ۔ تضاد آشنا ہیں ۔ ۔ ۔ یہ فیصلہ کہ اولی الامر کون ہے انہیں کی ذات سے صادر ہوتا ہے ۔ اس لیے کائنات میں مقتدرِ اعلیٰ یہی ہیں ۔ یہ زندگی کی سچائی ہیں ۔ حقائق کے سونے کی کان ہیں ۔ ۔ ۔ یہی پہاڑ میں بارود کا فیتہ لگاتے ہیں ۔ چٹان کو ڈائنامائٹ سے اڑاتے ہیں ۔ پتھروں کو کاٹ کر تاج محل بناتے ہیں ۔ چاند و سورج پر کمند ڈالتے ہیں تجلیے خانوں کو زندگی کا تقدس عطا کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ یہ جانتے ہیں کہ سامراج اور اس کے حواری اجارہ دار سرمایہ دار ، سول اور فوجی بیوروکریسی اور اعلیٰ طبقاتی جنتا ان سب کے چہرے بشرے ہیں ۔ ۔ ۔ سنگینوں کے نشے پر منہ میں دبائے ہوئے ہیں لیکن پاؤں مٹی کے ہیں ۔ ریت میں دھنسے ہوئے دلدل میں پھنسے ہوئے سازش میں بندھے ہوئے ۔ ایسی مٹی پاؤں جنہیں ایران کے جیالوں نے توڑ دیا اور سنگینوں پر رکھے ہوئے تخت و تاج کو گرا دیا ۔ سامراجی طاقت کو ریزہ ریزہ کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔

ہمارا ملک ایک عرصے سے سیاسی و اقتصادی بحرانوں کی نذر رہے
ہے جس کے نتیجے میں عوام کی اکثریت کا اعتماد سیاست پر سے اٹھتا جا رہا ہے۔ لوگ یہ
کہنے پر مجبور ہیں کہ اقتدار میں آنے سے قبل ہر لیڈر عوام کی بات کرتا ہے لیکن اقتدار میں
پہنچتے ہی " اپنوں کو ریوڑیاں بانٹ " کر چلا جاتا ہے۔ . . . نتھو میاں پھر کھڑے
لکڑی کاٹتے رہتے ہیں۔ فکری سطح پر عوام میں اس سوچ کو بدلنا، نظریاتی سطح پر ان کی
تطہیر کیلئے "مطالعاتی ادارہ کی تشکیل" لازمی امر ہے تاکہ عوام کو یہ باور کرایا جا سکے کہ سیاست
دو طرح کی ہوتی ہے ایک بالائی طبقے کی دوسری محروم طبقوں کی . . . اگر بالائی طبقے کے
افراد مسند نشین ہیں۔ ٹاٹا، برلا، ڈالمیا، سہگل، ولیکا اور آدم جی اگر اپنے کارندوں
کے ذریعے حکومت میں موجود ہیں تو وہ اپنے ہی طبقوں کے مفاد میں قوانین وضع کرائیں گے۔
اپنے ہی طبقے کے پرمٹ اور لائسنس اور پلاٹ کی بات کریں گے . . . بالائی سطح کے
سندھی، بلوچی، پٹھان، پنجابی، مہاجر سب ایک رنگ کے سیار ہیں۔ نظروں میں دھول،
جھونکنے کے لئے سندھی عوام اور پنجابی عوام کی بات کرتے ہیں۔ تاکہ طبقات کا تضاد واضح
نہ ہو سکے۔ سندھی، بلوچی، پنجابی، مہاجر، پٹھان عوام اپنا اتحاد مضبوط نہ کر سکیں۔ اپنے
حقوق کی جنگ تیز نہ کر سکیں۔ بالائی طبقے سندھی، بلوچی اور پنجابی نیشنلزم کی بات کرتے ہیں
لیکن ان کا نیشنلزم صرف ان کے ہی طبقے کی نمائندگی کرتا ہے وہ نیشنلسٹ نہیں بلکہ شاؤنسٹ
ہیں جو ایک صوبے کے عوام کے رشتے دوسرے صوبے کے عوام سے جڑنے نہیں دیتا اور وہ تحریک
کا پاٹ چوڑا ہونے سے روکتا ہے۔ سندھ سندھیوں کا ہے اور پنجاب پنجابیوں کا ہے اس
نعرے کے ذریعے وہ عوام کی شفاف نظروں کو گدلا کرنا چاہتے ہیں، سندھی جاگیردار، سندھی
ہاری اور سندھی مزدور کا دوست نہیں ہو سکتا کیونکہ دونوں کے مفادات میں زمین آسمان کا
بیر ہے۔ کوئی سندھی یا پنجابی وڈیرا، پنجابی اور سندھی عوام کی محبت میں اپنی زمین اور جائیداد
سے کیا دست بردار ہونے کو تیار ہے . . . . ؟ . . . . .

اگر ایسا ہے تو یقینی طور پہ اسے محروم طبقے میں شامل کرنے پہ غور کیا جا سکتا ہے . . .
یہاں ضرورت نظریاتی تطہیر کی ہے ۔ سیاست سے بددل ہونے کے بجائے یہ سمجھنا لازمی ہے کہ حکومت کا طبقاتی کردار کیا ہے وہ کونسے طبقات کی نمائندہ ہے ۔ ان سب کا طبقاتی مفاد کیا ہے . . . ان باتوں کی نشاندہی کرنا انقلابی رہنماؤں کا فرض ہے۔

ہمارا نظامِ حیات اندرونی تضادات کا شکار ہے ، اس پہ نزع کی کیفیت طاری ہے ۔ "ہذیان کا ورد ہو رہا ہے" لیکن اس ہذیان کا خاتمہ موت کی طرح یقینی ہے ۔ کیونکہ عروج و زوال کے فطری عمل سے کائنات کا کوئی گوشہ ، زمین کا کوئی خطہ باہر نہیں . . . خزاں رسیدہ پتوں کا ایندھن میں تبدیل ہونا . . . شاخ پہ نئی کونپلوں کا پھوٹنا ، پیلے پھولوں کا قرمزی رنگت بدلنا لازم ہے ۔ اس عمل کا نزول ہماری مقدس زمین پاکستان کا بھی مقدر ہے . . . یہ عمل فطری ہے . . . اس لئے ضرورت ہے کہ تمام جمہوری قوتیں ، ترقی کی طاقتیں عوامی پارٹیاں اپنے مفادات ، اپنی انائے کے خول سے یوں باہر آ جائیں جیسے کلی سخت ڈنٹھل سے باہر سر نکالتی ہے ۔ اس عمل کے بعد ہی دیکھا جا سکتا ہے کہ ہوا کتنی تازہ ، پانی کتنا شفاف اور عوام روحانی غسل کا کتنا بڑا انعام ہیں . . . اور ان کے مفادات کو حقیقی معنی میں آگے بڑھانا ، کتنی بڑی سعادت ہے۔

آج نہیں تو کل اس ملک کی تاریخ میں محنت کش عوام کو اہم کردار ادا کرنا ہے . . . انقلاب کا ہراول دستہ بننا ہے . . . اس کے لئے انقلابی تنظیم انقلابی منشور ، انقلابی نظریۂ حیات کا ہونا لازم ہے . . . ہوسکتا ہے پڑھنے میں یہ باتیں . صرف باتیں نظر آئیں لیکن عروج و زوال کا عمل اس کہانی کو بار بار لکھ چکا ہے غنچہ غنچہ کی جبیں پہ تاج باندھنے کا عمل حق ہے اور حق کا لفظ مٹ مٹ کر ابھرتا ہے دہمن کو جھکا کر خراج وصول کرتا ہے ۔ تخت کا گرنا ، ذروں کا مسند نشین ہونا ، عروج و زوال فطری عمل میں مضمر ہے ۔ اس کی بشارت حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے

پیغمبرانہ انداز میں یوں کی تھی۔

داغِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل

عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

اور اسی فطری عمل کی تعبیر و تعبیر، بطن گیتی سے "نئے آفتاب" کو طلوع ہوتے
دیکھ کر اس طرح کی بیا کہ تازہ نواحی تراود از رگ ساز

مے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم

مغان و دیر مغان را نظام تازہ دہیم

بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم

ز رہزنان چمن انتقام لالہ کشیم

بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم

پاکستانی تہذیب

پاکستان میں سیاست کے پہلو بہ پہلو ہیں نے تہذیبی سطح پر بھی کچھ سیکھنے اور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کلچر کے میدان میں اترنے سے قبل یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ کلچر اور ریاست کا آپس میں تعلق کیا ہے۔

ریاست جغرافیائی اور سیاسی وحدت کا نام ہے ریاست کبھی بنتی ہے اور سنورتی ہے۔ کبھی بگڑتی ہے اور ٹوٹتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ریاست کے وجود میں آنے سے اچانک کوئی قوم تشکیل پا جائے یا قوم ختم ہو جائے مثلاً فارموسا، جرمنی، کوریا، ریاست کے ڈھانچے میں فرق ضرور آگیا لیکن قوم موجود ہے اس طرح National State مثلاً جاپان، فرانسیسی یا اطالوی یا Multi national ریاست مثلاً روس، چین، ہندوستان ریاست ایک ہے لیکن کئی قومیں آباد ہیں۔ جس وقت ہم پاکستانی تہذیب یا کلچر کی بات کرتے ہیں تو پھر پاکستانی قوم کی بھی بات پیدا ہوتی ہے اور اگر قوم ہے تو پھر اس قوم کی تاریخ بھی ہوگی پاکستان کی قومی تہذیبی تاریخ موہن جو دارو اور ہڑپہ سے شروع ہوتی ہے جو عمر کے اعتبار سے پانچ ہزار سال سے بھی اوپر ہے۔ جس میں مختلف تہذیبوں کے دھارے آکر گرتے ہیں ویدک، برہمنی اور بدھ مت۔ ان معاشروں نے جو تہذیبیں پیدا کیں اور جس کلچر کو جنم دیا وہ بھی ہمارا ورثہ ہے۔ ہمارے فنی و تہذیبی تخیل میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ڈنڈی مارنے اور ترمیم کرنے کی بات الگ ہے۔

پاکستانی تہذیب کے سلسلے میں تین نظریات ہمارے یہاں کارفرما ہیں۔ پہلا یہ کہ پاکستان اسلامی ریاست ہے۔ اس کی اساس محض دینِ متین اسلام پر ہے۔ اس طرح یہاں کی تاریخ "مجاہدِ اعظم" محمد بن قاسم سے شروع ہوتی ہے جس نے سندھ کے راجہ داہر کو شکست دے کر اسلامی پرچم بلند کیا اور سندھ کے عوام کو اسلام کی تیغ

ذوالجلال والاکرام سے فتح کیا۔ اس فکر کے رشتے زمین میں بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ غوری، غزنوی جن کا بیان ابتدا میں ہو چکا ہے ان سے یہ تہذیب گذرتی ہوئی شاہ ولی اللہ سے رشتہ جوڑتی، جمال الدین سے سرا ملاتی علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن ایک بات سمجھنا ضروری ہے کہ کسی بھی تہذیب و کلچر کی اساس محض مذہب نہیں ہوتا۔ مذہب تہذیب کا جزو ہے کل نہیں۔

سوال یہ ہے کہ پھر اسلامی تہذیب سے مراد کیا ہے؟

تہذیب کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک باطنی جس میں عقیدے امنگیں شامل ہیں دوسرے رہن سہن طور طریقے، جہاں تک عقائد کا تعلق ہے وہ تمام اسلامی ممالک میں مشترک ہیں افغانی، سوڈانی، ملائشیا، انڈونیشی، اگر تہذیب میں صرف مذہب ہی کو بنیاد بنایا گیا تو پھر علامہ اقبال کے الفاظ میں بات یہاں تک پہنچے گی۔

ع چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

جس پر ثقلین نقوی (جرنلسٹ لکھنو) نے یہ گرہ لگائی تھی۔

رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا

تہذیبیں جغرافیائی حدود کی پابند ہوتی ہیں چنانچہ اس بنا پر پاکستانی تہذیب عربی نہیں ہے کیونکہ اس طرح وہ جبا پہنے اونٹ پر سوار آنکھوں میں سرمہ لگائے۔ دانتوں میں مسواک دبائے ریگستان میں خاک بہ سر ہوتی۔ عرب تہذیب میں یوں بہت رچاؤ ہے وہ امرا القیس پر بھی فدا ہے اور اسلام کی زریں فکر کا بھی شیدائی ہے۔ ساتھ ہی شہنشاہیت کے سامنے سجدہ ریز بھی ہے مکی مدنی موسیقی، مصوری، رقص رہن سہن سب جدا ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ہم اپنی تہذیبی تاریخ کی ابتدا برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے کریں۔ اس میں شک نہیں کہ برصغیر میں مسلمانوں سے ایک نئے

خوبصورت اور حسین باب کی ابتدا ہوتی ہے۔ لیکن قوم اور وطن کے اعتبار سے ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق ایک قوم اور زمین سے نہیں تھا۔ ان میں عرب بھی تھے اور ایرانی بھی، افغانی بھی تھے اور تورانی بھی ۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف ہوتے ہوئے بھی ان تہذیبوں میں مشابہت ہے۔ لیکن ان میں سے ہر قوم اپنا تشخص رکھتی ہے، "ایرانی جام جم پر نازاں ہیں" اور مصری "فراعنہ مصر پہ" ہے۔ اس عنوان سے ہماری تہذیب کا مسکن اسی زمین پر اور اس کی آب و ہوا میں ہونا چاہیئے۔

تیسرا نظریہ پاکستانی تہذیب کو دیکھنے کا یہ ہے کہ پاکستان ریاست کے اعتبار سے فیڈرل فارم آف گورنمنٹ ہے۔ یہاں چار nationalities یا چار علاقائی تہذیبیں ہیں۔ ہر تہذیب کا رہن سہن طور طریقے، لباس، وضع قطع، پھر خطاطی، نقاشی، مصوری، شاعری سب کا اپنا منفرد انداز ہے۔ کچھ اقدار سب مشترک ہیں۔ عقائد رسم و رواج جسے way of life کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ کلچر میں اختلاف بھی ہے جو ہونا چاہیئے۔ جو کلچر میں حسن پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اختلاف کو تضاد نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اور اگر تضاد بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ کیونکہ کسی بھی طبقاتی معاشرے میں "ایک قومی کلچر کا تصور پیدا نہیں ہو سکتا"۔ ایسے معاشرے میں ہر قوم میں دو قومیں اور ہر کلچر میں دو قومی کلچر ہیں۔ ایک معاشرے کو انحطاط کی طرف لے جاتا ہے دوسرا ترقی خوشحالی امن و محبت کی ضمانت دیتا ہے۔ دونوں میں موت و زیست کی لڑائی ہے۔ ایک قوم اور کلچر کا تصور تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ معاشی رشتوں اور پیداواری قوتوں میں بنیادی تبدیلی واقع ہو۔ ایسا کلچر جس کی ہیت قومی اور مواد اشتراکی ہو۔

کسی بھی ملک کی تہذیب کے مظاہر خواہ مصوری ہو یا شاعری سنگتراشی ہو یا موسیقی سب آپس میں پیوست ہوتے ہیں۔ ایک ہی جسم کا حصہ ہوتے ہیں۔ انہیں علیحدگی میں دیکھنا صحیح نہیں ہے کوئی کلچر بنا بنایا نہیں ہوتا وہ ارتقا پذیر ہوتا ہے

وہ بدنظمی سے ترتیب، ناشائستگی سے شائستگی کی جانب رواں ہے معاشرتی نظام اور کلچر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی سے کلچر بنتا بھی ہے اور بگڑتا بھی ہے۔

پاکستان میں تہذیبی سطح پر جس عنوان کام ہونا چاہئیے تھا وہ نہیں ہوا۔ اسباب وعلل کے رشتے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر فن آزادی کا طالب ہے اگر ہمہ وقت سنگین سر پر لٹک رہی ہوں تو یا تو خاموشی یا بغاوت کی شکل رونما ہوتی ہے۔ کلچر کی گہرائی اور گیرائی کے سبب اس کی حد بندی ممکن نہیں۔ وہ سمندر کی طرح ماضی، حال اور مستقبل میں بہتا ہے۔ اس کی طنابیں کھینچ تان کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھالی تو جاسکتی ہیں لیکن اس کے شعور کے بہاؤ کو یکسر روک دینا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

تہذیب کے جتنے شعبے ہیں ان میں فلم تمدن کی اہم ترین قدروں کی عکاس ہے۔ وہ زندگی کے بھید کو کھولتی ہے۔ رخ حیات کے بہاؤ کا پتہ دیتی ہے۔ داخلیت اور خارجیت کی آمیزش، زمان ومکان کا احساس، انسانی فطرت کی ہمہ جہتی کی تشریح مقصد حیات کی وضاحت سب اس کے دائرے اختیار میں ہیں۔ وہ زندگی کے اس تسلسل کو بھی پیش کرتی ہے جو تاریخ کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے میں معاون اور مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا خوبصورت ہتھیار ہے جس سے انسانی ذہنوں کی تربیت با آسانی کی جاسکتی ہے۔

ہمارے یہاں بدنصیبی سے جہاں تمام " سوغات باہر والوں کی نذر عنایت کا نتیجہ ہیں اس طرح فلم بھی غیر ملکی لباس میں ملبوس ہے۔ امریکن کلچر کی زد میں جہاں ہر خوبصورت شے ہے وہاں فلمیں بھی ہیں۔ قتل وغارت گری، دھینگا مشتی چوری ڈکیتی وغیرہ بھی وہ موضوعات ہیں جو ہر پھر کر فلم کا مقدر بنی ہوئی ہیں اور ایسا ہونا لازمی ہے کیونکہ " فلم " فنون لطیفہ کے زمرے میں ہمارے یہاں ہے ہی نہیں " گھی انڈسٹری کے ہم پلہ فلم انڈسٹری " ہے اور جب انڈسٹری ہے تو ظاہر ہے کہ " کٹوتی ضروری ہے "۔ چھانٹی ضروری ہے۔ اگر کسی کہانی کار یا فنکار نے کسی اعلیٰ کہانی کی بات کی وہیں زبان پر بجلی گری آشیانہ جلا ـــــ

امریکی طرز فکر کی " لاش " " انسان مرگیا " اور " جنسی انڈسٹری " وغیرہ قسم کی فلمیں ہمارے عوام کی زندگی کا اصل خزینہ قرار دی گئی ہیں۔ دن بھر کی تھکن دور کرنے کے لئے " افیون " اور " حشیش " دے کر ان کے شعور کو سلانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔

مختلف ادوار میں تہذیبی سطح پر تھوڑا بہت کام ہوا۔ اس میں N.F.D.C کا قیام تھا جس کا مقصد قومی اور بین الاقوامی سطح پر خوبصورت فلمیں بنانا اور باہر سے مرابط قائم کر کے اچھی اور پر مذاق فلمیں درآمد کرنا تھا۔ تاکہ عوام کے ذوق کی صرف تسکین نہیں بلکہ تربیت بھی کی جا سکے۔ پارلیمنٹ کے ممبر حاکم علی زرداری نے اس سلسلے میں کافی اہم کام سرانجام دیا تھا " Bambino " میں دنیا کی بہترین فلمیں نہ صرف منگوائی گئیں بلکہ عوام پر بغیر ٹکٹ کے اس کے دروازے بھی کھول دیئے گئے۔ نوجوانوں کی بہت بڑی اکثریت نے اس سے فیض حاصل کیا۔ یہ سلسلہ اگر جاری رہتا تو عوام کے مذاق کو بدلنے، اسے نکھارنے اور سنوارنے میں مدد ملتی۔ ذہن کے لیے در تیچے کھلتے۔ " چلی " اور " ویت نام " پر دو بہت خوبصورت فلمیں دکھائی گئیں۔ جن میں مقصدیت تھی۔ Sunflower انتہائی حسین فلم تھی۔ ہیمنگ دے کی فلمیں " The sun also rises " old man & the sea اس قسم کی فلمیں دکھانا ہمارے ملک کے حالات کے پس منظر میں نہایت کارآمد تھیں۔ نوجوانوں کے ذوق کی سیرابی ہوتی، عوام کا مذاق بدلتا۔ لیکن عوام کی قسمت " چار آنے "۔

ریڈیو اور ٹی وی رائے عامہ ہموار کرنے اور مزاج کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہاں محدود آزادی کے جال میں جکڑے ہونے کے باوجود بعض معتبر اور بصیرت افروز شخصیتوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں مایہ ناز ریڈیو سے ڈائریکٹر اسلم اظہر ہیں جن کی ذات سائنسی فکر سے مزین ہے۔ انھوں نے اپنے اردگرد بہت سی نمایاں شخصیتیں جمع کیں جن میں سرفہرست عبیداللہ بیگ اور افتخار عارف ہیں۔ افتخار

اردو ادب کا سرمایہ ہیں جنکا تخیل بلند اور ہمہ گیر ہے۔ ان کے علاوہ روحی بانو ، ممتاز مرزا ، قاضی واجد اور "نیلام گھر" کے خالق طارق عزیز۔ امجد اسلام امجد ، شوکت صدیقی اور حسینہ معین کے ڈراموں نے عوام کی ذہنی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔

ٹی وی اور ریڈیو کے سلسلے میں دو تین نام بہت اہم ہیں

جن میں سرِ فہرست ذوالفقار علی بخاری کا ہے جو پطرس بخاری کی بہترین اقدار کو اپنی ذات میں سمیٹے "دادا شجاع ، باپ جوانمرد خود دلیر" کی منزل پہ تھے۔ طلماتی انداز ، اونچی پیشانی ، تیز چمکیلی آنکھیں ، خلاق ذہن ۔ ریڈیو اور ٹی وی تمام ذرائع ابلاغ عامہ کسی فرد کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ انہیں علم وآگہی کی مکمل تحریک بننا چاہیئے۔ بخاری صاحب نے ان دونوں اداروں کو مکتب کی طرح بنانا چاہا جس سے ہر کس وناکس اکتسابِ نور کرے۔ ریڈیو کی دنیا جس وقت ابتدائی منازل سے گذر رہی تھی۔ اس کی گذرگاہ سونی تھی۔ موسیقی کی دنیا بے رنگ تھی۔ ادب کے کوچے بے رنگ تھے اس وقت ظفر حسین صاحب کے ایماء پر میر انیس پر پروگرام شروع ہوئے۔ بخاری صاحب کی آواز بجلی کی طرح کوندی اور آن کے آن میں میر انیس کا ایک "دبستان کھل گیا"۔ انہوں نے میر انیس کو تحت اللفظ پڑھنے کا مخصوص باب کھولا۔ ان کے اس مکتب میں حضرت علامہ رشید ترابی کے صاحبزادے نصیر ترابی ، حمایت علی شاعر شہر یار ۔ عون محمد رضوی ، زاہد نقوی اور ناصر جہاں تھے۔ ناصر جہاں بخاری صاحب کے بہت قریب تھے شاید اس لئے کہ وہ طن داؤدی کی تہ لبوں کے آشنا ہیں۔ ان کے طن میں ان کی ماں کی آواز کا بھی رس گھلا ہوا ہے

بخاری صاحب صرف سخن فہم ہی نہیں سخن ور بھی ہیں

اردو زبان کو عصری مسائل سے روشناس کرانے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان کے قلم نے بصیرتوں کی شفق کو سنوارا اور روایتوں میں نئے تجربوں کا گداز بھرا۔ منصور بخاری کی تنا ور اور عظیم شخصیت ہارون بخاری کے شعلہ صفت انداز میں پطرس بخاری اور ذوالفقار علی بخاری کو

دیکھا جا سکتا ہے۔ سمٹی یعنی بیگم حاکم علی زرداری کی ذکاوت اور علمیت بھی انہی حضرات کی گل ریزی کا پرتو ہے۔ غرضیکہ بخاری صاحب " بسیار شیوہ است بتاں را کہ نام نیست "، کی منزل پر تھے۔ جنہوں نے ہر پہلو سے ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے زمانے کے کھردرے مزاج پر رندا چلا کر اس کے کانٹے نکالنے کی کوشش کی۔

بخاری صاحب کی باتوں میں پھولوں کی مہکار ستی آوازیں گھنگھرو بجتے۔ زبان کی صحت پر ان نظر رکھتے۔ قدیم عقائد کے دشمن، نئی اقدار کے رسیا ان کی پوری شخصیت نئے خیالات اور نئے تجربات کا مرکب تھی۔ فنکاروں سے وہ ہمیشہ کہا کرتے "دیکھو ڈرامہ ہو یا موسیقی یا مصوری اسے اظہار بیان کے سانچے خود ہی تلاش کرنے ہوں گے۔ ۔ ۔ ۔ جدید فکر پر پرانا لباس چڑھایا جا سکتا ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مصنوعی ماحول، مصنوعی زندگی میں سے حقائق کے موتی فنکار کو ہتوں میں ڈوب کر نکالنا ہوں گے ۔ ۔ ۔ یکسر انوکھا ہونا بے معنی بات ہے۔ صرف نئی چیز کا نام ڈرامہ، موسیقی، مصوری، یا خطاطی نہیں ہے اسے تحریک بننا چاہیئے فرسودہ رسموں کو سلیقے کے ساتھ دکھانا بھی چاہیئے ۔ ۔ ۔ تمام عمر تجربہ ہی نہیں کیا جانا چاہیئے بلکہ تجربات کی کسوٹی پر کس کر اسے تجربات کی دنیا میں قدم رکھنا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کالج میں جس وقت مجھ پر " ۔۔۔۔۔ " لگایا گیا تھا اس کے بعد میں نے ریڈیو کی طرف رخ کیا اور مختلف پروگراموں میں حصہ لینا شروع کیا اسی زمانے میں مجھے بخاری صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بخاری صاحب کی ہمہ جہت اور طلسماتی شخصیت کے سب اسیر تھے سو میں بھی ہوئی۔

انہوں نے ایک دن گفتگو کے دوران پروگرام کے ختم ہونے کے بعد ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ سنایا۔ وہ بات یوں ہوئی کہ محترم احتشام الحق تھانوی اور سارنگی نواز امراؤ بندو خاں صاحب کو ایک ہی گاڑی میں ان کے گھر بھجوا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ احتشام الحق صاحب نے میری شکایت اوپر چڑھ دی ۔ " جناب میری سخت توہین کی

گئی۔ ایک گویے کو میرے پہلو میں بٹھا دیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ "، جواب دیجئے ایسا کیوں ہوا؟ ان کی طلبی ہوئی۔ جواب میں بخاری صاحب نے اتنا ہی کہا "حضور میں نے بندو خاں سے معافی مانگ لی ہے ۔"

مہمان نوازی بخاری صاحب پر ختم تھی ۔ پُرتکلف، سلیقے سے چنا ہوا دسترخوان تھا ۔ جوش صاحب، فیض صاحب، کاظم اور ساتھ ہی حسن مصطفےٰ بھی مدعو تھے جو اردو زبان کے سرمایہ افتخار اور قوت گویائی کے مہتاب مصطفےٰ زیدی کے ماموں اور دوست ہیں۔ حسن مصطفےٰ اپنی جوہر شناسی، ذہانت اور انسان دوستی کے اعتبار سے بھی بڑے ہیں۔ اسٹیٹ بنک میں ڈائرکٹر ہوں یا ڈپٹی گورنر انداز ہمیشہ فقیرانہ ہی رہتا ہے بخاری صاحب کی ہر محفل میں ان کی موجودگی ضروری تھی ۔ کھانے کے بعد خوش گپیاں ہو رہی تھیں جوش صاحب کا وجود محفل پر چھایا ہوا تھا کہ اچانک بخاری صاحب نے نوکر کو آواز دی: "بھئی میری چیک بک لے کر آؤ۔ چیک بک آئی ۔ جوش صاحب کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے بولے سنیئے ہم یہ روزانہ "آپ کی دولت" کی روداد نہیں سنیں گے کہ ہندوستان میں ۱۰ لاکھ کے باغات چھوڑ کر آئے ہیں۔ یہاں کی مقدس سرزمین کے لئے جائیداد قربان کر کے آئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لیجئے چیک اب مستقل یہ باب بند ہونا چاہیئے ۔ جوش صاحب نے انتہائی معصومیت کے ساتھ چیک لے لیا شاید یہ سمجھ کر کہ حاتم طائی کا در کھل گیا ہے ۔ چیک میں رقم درج تھی صرف ڈیڑھ سو روپیہ یہ لیجئے حساب بے باق ۔ سمجھ گئے ۔ جناب اس سے زیادہ آپ کا احسان ہے اس بات پر ہمارے حکمراں اور ہمارے ملک کو قطعی یقین نہیں ۔"

ظفر حسین صاحب نے بھی ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کی حیثیت سے ریڈیو کی زبان کو سنوارنے، موسیقی کو نکھارنے اور فنکاروں کی سرپرستی کرنے میں ریکارڈ قائم کیا تھا۔ ظفر صاحب موسیقی کے عالم ہیں۔ ان کا تخیل بلند، اور سخن دلنواز ہیں ۔ میں نے ایک معمولی سی نوکری کے لیے ریڈیو میں درخواست دی۔ ظفر صاحب انٹرویو

بورڈ میں تھے۔ میرا امتحاں ہوا۔ پاس ہوئی۔ سب نے مبارکباد دی ۔ ۔ ۔ ظفر صاحب باہر آئے ۔ ۔ ۔ "ڈاکٹر اتنی معمولی جگہ پہ آپ کا کام کرنا وہ بھی" اناؤنسر کی حیثیت سے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے فہرست سے میرا نام کاٹ دیا ۔ ۔ ۔ یہ واقعہ کچھ اسلامیہ کالج کے واقعہ سے ملتا جلتا تھا۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل قریشی تھے اور ہر طرف ان کا شہرہ تھا۔ انہیں کے عہد میں اردو ڈیپارٹمنٹ میں جگہ خالی ہوئی۔ میں ابھی اپنی درخواست لے کر کالج میں داخل ہی ہوئی تھی کہ اچانک مایہ ناز نقاد ممتاز حسین صاحب سے میری مڈبھیڑ ہوگئی۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے "بھئی یہ تم یہاں کہاں ۔ ۔ ۔ یہ کالج تمہارے لئے مناسب نہیں ۔ ۔ ۔ یہ تمہیں کس نے رائے دی۔ ان کا ہر لفظ میرے لئے قابل احترام تھا چنانچہ میں خاموشی کے ساتھ درخواست ہاتھ میں لئے گھر واپس چلی گئی ۔

ریڈیو ٹی وی کے سلسلے میں ضیا محی الدین کا نام اہم ہے ضیاء بہت پختہ فنکار ہیں۔ انہوں نے ٹی وی سے جس طرح کے پروگرام مرتب کئے وہ فن کی تاریخ کا خوبصورت حصہ ہیں۔ ان کے فن کی چھوٹ محترم طارق عزیز، خوش بخت عالیہ اور سندھی اور پشتو کے پروگرام کے پروڈیوسروں میں بھی نظر آتی ہے۔ ضیاء نے اپنے پروگراموں کے ذریعے عوام کے ذوق کی تربیت کرنے کی بھی کوشش کی ۔ ۔ ۔ لیکن "فنکار کی قیمت چار آنے" محتسبوں کی زد پہ آئے اور جلاوطنی نصیب بنی ۔ ۔ ۔ ۔

"الن اور ننھا" کمال احمد رضوی کے زرخیز تخیل کا خوبصورت نمونہ تھا جس میں مشاہدہ، تجربہ، درد، خلوص، طنز اور مزاح کے پیرائے میں سب کچھ تھا ۔ ۔ ۔ اس میں چھوٹے اخلاق کے ملمع کے بہت سے خول کھرچے گئے۔ حقائق کو آئینہ دکھایا گیا ۔ ۔ ۔ یہی بات اوپر والوں کو گراں گزری اور یہ پروگرام نذرِ آتش ہوا۔ اور اس طرح آزادی فن کا حق ادا کیا گیا۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ معاشی بنیادیں بدلنے سے تہذیب اثر انداز ہوتی ہے

لیکن اسے یکسر تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ تہذیبی دھارا بہر حال ہر سطح پہ بہتا رہا، مختلف راستوں سے گذرتا۔ ایک وقت ایسا ضرور آیا جس وقت تہذیبی سطح پر بڑے پیمانے پہ کام کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر عنوان فنکاروں کی سرپرستی کی گئی۔ ملک سے باہر ان کے وفود بھیجے گئے۔ کلاسیکی موسیقی کو فروغ حاصل ہوا۔ ڈانس اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ کلاسیکی رقص کو مقبولِ عام بنانے کی کوشش کی گئی۔ "نیشنل کاؤنسل آف آرٹس" قائم ہوئی۔ فیض صاحب کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ خالد سعید بٹ اس کے نگراں مقرر ہوئے۔ جوش صاحب ادبی بورڈ کے سربراہ بنے۔ دوسری اہم ادبی شخصیتوں کو ان کی خدمات زریں کے صلے میں نوازا گیا۔

تمام فنونِ لطیفہ کی طرح مصوری بھی "تہی دامن" ہے۔ اوپر والوں نے کبھی اس کی "سرپرستی" کرنا تو درکنار اسے دوگز زمین دینا گوارا نہیں کیا۔ موتی گاجر کی طرح خود ہی بڑھتی پھیلتی اور جڑ پکڑتی رہی۔ فن کا ہر ادارہ فن کار کے "شعلۂ عشق" کی تڑپ کا آئینہ دار ہے۔ شاکر علی، بگاچی، آذر زوبی، حسین امام، ناگی، جمیل نقش یہ وہ فنکار ہیں جنہوں نے رنگوں کی چلمن سے تیرگی کو کاٹا ہے۔ نوید سحر کی بشارت دی ہے۔ صادقین درویش مسلک ہیں دل آئینہ خانہ ہے گرد کا نام ونشان نہیں۔ گھنے درخت کے نیچے کائی نہیں جمتی۔ بس "ستیہ خونچکاں" "انگلیاں فگار" "زرد پتوں کے بن" میں بہار آجائے۔ ایسی بہار جو زنجیروں کی گراں باری سے انسان کو نجات دیدے۔ ان کے رنگ سیاہ بھی ہیں سفید بھی۔ شوخ بھی ہیں اور مدہم بھی۔ . . . رنگوں کی کہکشاں اُس کے حسن کے ذریعے وہ قوم پرستی مذہب پرستی، دولت پرستی، نفاق پرستی، شہرت پرستی، غرضیکہ تمام نظریات کے روپ میں چھپی ہوئی تنگ ذہنیت کے فتوؤں سے انسان کو آزادی دلانے کا جانفزا پیغام دیتا ہے جھوٹ، مجبتوں، منافقتوں سے آزادی، آمریت کی بیڑیوں سے آزادی، - - - قوتِ اظہار کی آزادی، یہ سب فنکار انسان کی بصیرت و بصارت پر فتوے تو صادر نہیں کرتے لیکن فن کی علامتوں میں نئی صبح کی نوید ضرور دیتے ہیں۔ آگ کو فاصلے سے بھانپ لینے کا ہنر ضرور جانتے ہیں۔ سچی محبت کی صبح،

سچے انسان کی صبح ۔ پاکستان کی تہذیبی دنیا میں ان فنکاروں کا وجود کنوئیں میں چاند کی طرح اترا ہوا ہے۔ گرفتار، مقید، اسے کھلی ہوا، روشنی، اور اچھی فضا درکار ہے تاکہ وہ ان صحنوں میں بھی چھپکے جہاں دیئے ٹمٹماتے ہیں اور ذہن جاگتے ہیں جو بغاوت کی تاریخ ترتیب دیتے ہیں برف کے آنچل میں شفاف پانی مچل رہا ہے۔ ان علامتوں کے پردے میں ان فنکاروں کی یاقوتی رنگت جھلک رہی ہے۔

پاکستان نے مجھے کیا دیا اور کیا نہیں یہ الگ داستان ہے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ مجھے صادقین، گل جی، آذر ذوبی جیسے فنکاروں کو دیکھنے ان سے سیکھنے اور اپنے ذہن کی تربیت کرنے میں مدد ضرور ملی۔ " خوبی قسمت پر اگر ناز" کروں تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ وہ عظیم لوگ ہیں جو قطرہ، میں 'گہر' دیکھ لیتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو پر ایک بین الاقوامی سمینار تہذیبی سطح پر اہم کام تھا۔ انگلستان، جرمنی، عراق، ایران، روس، امریکہ، ہندوستان اور دیگر ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ حضرت امیر خسرو کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے فن کے مختلف پہلو سامنے لائے گئے۔ زمین پر کہکشاں نکلی، فیضی صاحب نے فکر انگیز تقریر کی، پروفیسر کرار حسین نے سامعین کو مسحور کیا۔ ممتاز حسین نے تحقیق کے جوہر دکھائے۔ محسن احسان نے اپنی شخصیت کے گداز اور پختگی فکر کا لوہا منوایا میں نے بھی مقالہ پڑھا۔ عنوان تھا

Contribution of Hazrat Ameer Khusro to the music of the Sub continent

اسی کانفرنس میں اڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر اور عراق و ایران کے پروفیسر اور دیگر حضرات نے بہت فکر انگیز اور تحقیقی مقالے پڑھے۔ اور ہماری تہی دامنی کو دور کرنے میں مدد دی۔

دوسری بین الاقوامی کانفرنس سندھ کی تہذیب پر ہوئی جس کا عنوان یہ تھا کہ "Sind through the century"

۱۴۸ ممالک کے اسکالرز نے اس میں شرکت کی۔ سندھ کی سیاسی، سماجی، تہذیبی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ نت نئے پہلو زیرِ بحث آئے۔ قومی اور بین الاقوامی شہرت یافتہ عالموں نے تخلیق کا دریا بہایا۔ قوم نے سچے موتیوں کو آنکھوں سے لگایا۔ پیر حسام الدین راشدی نے علم و فضل کے موتی لٹائے۔ ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو، ممتاز راشدی، جی الانا، غلام مصطفےٰ شاہ پیر علی محمد راشدی، غلام علی الانا سندھی ادب کا قابلِ فخر سرمایہ ناز شاعر شیخ ایاز نے اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کے جوہر بکھیرے۔ میں نے بھی ایک مختصر سا مقالہ "شاہ صاحب کا فکری اثاثہ" کے عنوان سے پڑھا کانفرنس تین دن جاری رہی۔ تہذیبی، معاشی، سیاسی ہر پہلو پر بحث و مباحثے ہوئے۔ ہر کمرہ دانشکدہ بنا ہوا تھا۔ عجب روح پرور سماں تھا۔ اس کانفرنس کے روحِ رواں پیار علی الانا تھے۔ جی اللہ نا جیسے عالم و فاضل کے فرزند بلند اقبال۔ جی الانا کی شخصیت علم ہی علم، محبت ہی محبت اور اجالا ہی اجالا تھی۔ ان کی ذات کتب خانہ ہی نہیں نگار خانہ تھی۔ جس میں قہقہے بھی تھے اور آنسو بھی سیاست بھی تھی اور موسیقی بھی۔ پیر حسام الدین راشدی کی طرح وہ بھی "چھوٹے انسانوں" کے عاشق تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ حیات کے معنی سمجھتے تھے۔

تنظیمی اعتبار سے بھی کانفرنس بہت کامیاب تھی۔ روس کے ممتاز عالم پروفیسر گنکاؤسکی نے اس کانفرنس کو بہت خوبصورت الفاظ سے نوازا۔ پیار علی صرف سیاست داں ہی نہیں موسیقی کے عالم بھی ہیں۔ موسیقی کی تاریخ پر ان کی گہری نگاہ ہے غالباً یہی وجہ تھی کہ کانفرنس کے اختتام پر سندھ کی موسیقی کی تاریخ اور اس کے مختلف پہلو سامنے آئے جس میں ان باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ دی گئی۔ وادیٔ سندھ تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور مرکزِ علوم و فنون ہے۔ سندھ نے فنونِ لطیفہ میں حیرت انگیز ترقی کی۔ یہاں تک کہ راگ راگنی میں اشعار کی دھنیں ترتیب دی گئیں جیسا کہ شاہ صاحب کے کلام میں نظر آتی ہیں۔

ساخت کے اعتبار سے آلاتِ موسیقی کی چار قسمیں ہیں۔ گھن، تت، سکھر

اور تیت۔ جلترنگ کی ایجاد سے پانچویں قسم کا اضافہ ہوا۔ گھن کی قبیل کے پانچ مقبول ساز یہ ہیں ۱۔ دہل سندھی ڈھول ۲۔ ڈھولک اور دف۔ عموماً اسے عورتیں بجاتی ہیں اور جو سب سے مقبول تال بجائی جاتی ہے اسے پنج سند کہا جاتا ہے۔ ۳۔ موگرمان۔ یہ ایک قسم کا عمومی ڈھول ہے۔ جو کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں اور ضرب سے بجایا جاتا ہے۔ یہ دراصل ان افریقی نسل کے مسلمانوں کا روایتی ڈھول ہے جو صدیوں سے سندھ میں آباد ہیں اور جنہیں مقامی لوگ شیدی کہتے ہیں۔ . . موگرمان لوک ناچ کے ساتھ بھی بجایا جاتا ہے۔ لوک ناچ میں دو ناچ یعنی کیٹ و درد وو اور لسبیلہ، زیادہ مقبول ہیں۔ . نغارہ۔ یہ اصل میں عربی لفظ "نقارہ" کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ پرانے زمانے میں نغارہ شاہی محل کے پھاٹک پر استقبال اور سلامی کے لیے بجایا جاتا تھا۔ اب یہ محرم کے زمانے میں بجایا جاتا ہے۔ اور اس طرح محرم کے متبرک مہینے کا استقبال کیا جاتا ہے۔ محرم کے موقع پر جو موسیقی کی دُھن بجائی جاتی ہے اسے دکھدھ، یا ماتم کہا جاتا ہے ۵۔ بھیر۔ یہ ساز نقارہ سے ملتا جلتا ہے۔ اسے بھی کھڑے ہو کر بجایا جاتا ہے۔ اسے عموماً استقبال اور جنگ کے موقع پر بجایا جاتا ہے۔ صوفیائے کرام نے بھی اسے اپنایا ہے۔

سَت کی قسم کے چار لوک ساز ہیں۔

۱۔ یکتارو:۔ اس میں ایک تار ہوتا ہے کبھی دو تارہ بھی استعمال ہوتے ہیں اس کے تاروں کو خفیف سا چھیڑ کر مختلف تال مثلاً تین تارہ، کلوارد دکھاد ہرو وغیرہ نکالتے ہیں۔

۲۔ دانبورو:۔ یہ لسبیلہ کے علاقوں کا بہت ہی خوبصورت اور روایتی ساز ہے ان میں تین فولادی تار ہوتے ہیں جنہیں لکڑی کے ایک ٹکڑے سے بجایا جاتا ہے۔ دانبورہ کو مقبول لوک گیت 'مورد' کے ساتھ گایا جاتا ہے۔

۳۔ شا لطیف تنبورو:۔ حضرت امیر خسرو کی طرح شاہ صاحب کو بھی موسیقی سے گہرا لگاؤ اور عقیدت تھی۔ یہ ساز شاہ صاحب کی ایجاد ہے۔ مصریوں نے جو تنبورا ایجاد کیا تھا اس میں چار تار ہوتے تھے شاہ صاحب نے اس میں ترمیم کی اور اسے پانچ تاروں والا ساز بنایا۔

۴۔ سرانڈیو:۔ یہ کئی تاروں کا ساز ہے۔ اسے کلہوڑہ حکمرانوں کی غیر معمولی سرپرستی حاصل ہوئی۔ اسے گزی سے بجایا جاتا ہے۔

سندھ کی طرح پنجاب ، بلوچستان اور سرحد کی گلیاں و کوچے "اوراق مصور ہیں - ہر شکل میں ایک نئی تصویر ابھرتی ہے - ذہن کے کرکروں شیلوں سے مالا مال ، ضرورت اس امر کی ہے کہ اس حقیقی دولت کو کان سے یوں نکالا جائے جیسے سونا نکالا جاتا ہے - پھر وہ بازار میں سجایا جائے ، اس کی تراش خراش ہو ، نت نئے تجربے کیے جائیں اور یوں اس عوامی ورثے ، موتیوں کے اس خزینے کو عوام کے ذہنوں کی آب وتاب بڑھانے اور اس کے مواد میں تبدیلی کرکے خوش آیند مستقبل کے لیے استعمال کیا جائے جو عوام میں اپنے خوبصورت تہذیبی ورثے سے لگاؤ اور تہذیبی عزور پیدا کر سکے اور انہیں حقیقی تشخص بخشا جائے -

کانفرنس کی اختتامی تقریب کے روح رواں حکیم سعید تھے برصغیر میں دو لفظ بری طرح مطعون ہوئے ایک منشی دوسرا حکیم - لیکن حکیم سعید حقیقی معنی میں حکیم ہیں - نفسیاتِ انسانی کے شناور ، درد والوں کے لیے پیغامِ روح افزا ، اور جھلسے ہوئے ہونٹوں کے لیے آبِ حیات -

بہر حال حکیم سعید صاحب نے انٹر کانٹیننٹل میں مغلیہ شان کا دستر خوان چنوایا - عجیب و غریب منظر تھا - انواع و اقسام کے خوان سجائے گئے سب سے دلچسپ پہلو اس محفل میں پان کا اہتمام تھا -

البیرونی نے جہاں ہندوستانی رسموں کا ذکر کیا ہے وہاں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ " لوگ پان چونے کے ساتھ کھا کر دانت سرخ کرتے ہیں " امیر خسرو نے بھی پان کی توصیف بیان کی ہے - ابوالفضل نے لکھا ہے کہ دو عورتوں کے سولہ سنگاروں میں پان بھی شامل تھا - سجان رائے بھنڈاری نے بھی پان کا قصیدہ لکھا - ملا محمد محسن فانی کشمیری کی مثنوی میں پان پر اکثر شعر ملتے ہیں -

لب گلرخاں سرخ از پان شود ؎
گہرہائے دنداں چو مرجانے شود

چوں وقت لب نازنیناں کنم
زبانی دگر دام انسیان کنم

بہر حال ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے پوری مغلیہ تہذیب گرفت میں آ گئی غیر ملکی مہمان غیر معمولی حد تک متاثر ہوئے۔

پاکستان کی تاریخ میں سندھ نے پہلی مرتبہ اپنا جگمگاتا چہرہ دکھانے کی کوشش کی۔ ذی شعور عوام نے محبت کے پھول نچھاور کئے لیکن یہی بات "انہیں ناگوار گذری" اندھیر روشنی کے آگے تلملا اٹھا، "ہلال پاکستان" بند، مساوات بند "معیار" بند، پرنٹنگ پریس بند۔ ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو نے ان حسین مقالات کو کتابی شکل دینے کی کوشش کی

I S A S کے مالک محترم شریف نے اس دستاویز کو "حفظ و امان" دیا۔ غرضیکہ اس کے بعد اب تک اسلام کی روشنی سے محروم علاقوں سے حقیقی تہذیبی سرمایہ کو منظر عام پر لانے پر پہرا لگا ہوا ہے۔ "پس چہ باید کرد" کی منزل ہے۔ مہذب دنیا میں جہاں کھردری تہذیب اور دبی ہوئی زبانیں ہیں جنہیں جلا بخشی جاتی ہے۔ ان کے کلچر کو فروغ ملتا ہے۔ زبان کو اعلیٰ زبان اور ادب کو اعلیٰ ادب کی سطح پر لایا جاتا ہے۔

تہذیبی سطح پر دو ایک کام اور بھی ہوئے۔ میر انیس اردو زبان کا زندہ و تابندہ چراغ ہے۔ جس کے حسن کو تعصب نے ہر سطح پر کچلانے کی کوشش کی لیکن وہ اور لو دیتا رہا۔

برصغیر کے اسی عظیم المرتبت شاعر میر انیس کی صد سالہ تقریبات ہندوستان و پاکستان کے ہر گوشے میں منعقد کی گئیں۔ پشاور، پنڈی، کوئٹہ اور پنجاب میں بھی ادیبوں نے انیس کی قدر دانی کا ثبوت فراہم کیا۔ کراچی میں میر صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے دو روزہ کانفرنس منعقد کی گئی۔ "ادارہ یادگار میر انیس" نے اس کی ذمہ داری قبول کی۔ جس کی میں صدر اور سکریٹری ممتاز شاعر و نقاد سحر انصاری تھے لیکن کانفرنس کے لئے پیسہ درکار تھا۔ اقبال رضوی یوں تو بی سی سی آئی بنک میں ڈائریکٹر ہیں

ڈائریکٹر ہیں لیکن حقیقتاً عالم ہیں انہوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی اس کے علاوہ علی اکبر سیٹھ نے جن کے نام پر سیٹھ کا لفظ دھبہ ہے اس لئے کہ وہ مزاج کے اعتبار سے "خالصتاً مولائی" ہیں انہوں نے ہمیں نوازا۔ حاتم علوی صاحب مکمل حسنِ عمل کا نشان تھے۔ انہوں نے تھیوسوفیکل ہال میں جلسہ کرانے کی ذمہ داری لی — اظہر سجاد ہر طور شریک ہوئے۔ کانفرنس میں مختلف مکاتبِ فکر کے افراد نے شرکت کی۔ مایۂ ناز شخصیت سلیمان و بیگم اختر سلیمان، نواب عسکری، بریگیڈیئر اقبال مہدی شاہ، ایس ایس جعفری، صغیر حسین جعفری، اشتیاق، بیگم اکرام اللہ محترم حبیب اللہ، پروفیسر منظر کاظمی، خواجہ ارشد، اطہر سعید خان، محسن بھوپالی، نصیر ترابی، عبید اللہ علیم، عبدالمالک، اظہر نفیس، اکرام مہدی، قمر عباس جعفری، علی حیدر کاظمی پروفیسر نصیر نقوی مایہ ناز شاعر امیر امام، پنڈی، پشاور اور پنجاب کے آئے ہوئے مہمان نوجوان طلبا و طالبات بھی بھرپور انداز میں شریک ہوئے۔

جلسے کے آغاز میں مختلف اسکولوں اور کالجوں کی طالبات نے جن میں خوبصورت گلوکارہ عذرا زیدی (روشن آرا) بھی راگ المین کلیاں میں میر انیس کی یہ مناجات چراغ ہاتھوں میں لے کر پیش کی۔

یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر — تو فیض کا مبدء ہے توجہ کوئی دم کر
اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر — گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اس کے فوراً بعد فیض صاحب نے گوتمی مسکراہٹ کے ساتھ میر انیس کی تصویر کی نقاب کشائی کی۔ اسٹیج سکریٹری کے فرائض ضمیر اختر نے انجام دیئے

میرانیس کی صدسالہ تقریب میں صدر جلسہ فیض احمد فیض، ممتاز نقاد سحر انصاری، مایہ ناز نقاد مجتبیٰ حسین، ممتاز عالم جی الانا۔ پیچھے حیدری اسکاؤٹس کے نونہال کھڑے ہیں۔

میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں خطبۂ استقبالیہ پیش کیا ۔ میر انیس کی مرثیہ گوئی ان کی تاریخی اہمیت اور فنکارانہ عظمت ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے اس اجتماع کا مقصد عظمت کی اس تصویر کو مجموعی حیثیت سے نگاہِ تہذیب کے سامنے پیش کرنا ہے جو ایک صدی کے دوران جزوی طور پر اپنا جلوہ دکھاتی رہی ہے ۔

میر انیسؔ اور اُن سے قبل بعض دوسرے اکابر شعرائے یوم منا کر ایک بات ہم نے ضرور ثابت کر دی ہے کہ ہمارا قومی شعور بیدار ہو رہا ہے ۔ اور تجارتی شہروں میں زندگی بسر کرنے اور سود و زیاں کی کشمکش کا شکار ہونے کے باوجود ہم نے اپنے ذوقِ ادب ، احساسِ جمال اور آدابِ آدمیت کو فراموش نہیں کیا ہے ۔

میر انیس کی عظمت اس امر کی متقاضی تھی کہ ہر سال ان کا جشن اسی اہتمام سے منایا جاتا لیکن معاملہ کچھ یوں ہے کہ ایک طرف تو میر انیس مزاجاً خود دار اور غیور واقع ہوئے تھے اور فرماتے تھے ۔

کریم جو تجھے دینا ہو بے طلب دے دے

فقیر ہوں پہ نہیں عادتِ سوال مجھے

اور دوسری طرف ہم بھی اکابر شناسی کے باب میں ذرا تاخیر ہی سے بیدار ہوئے ۔ دراصل اس موقع پر میں اس حقیقت کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ میر انیس کو مبدٔ فیاض سے جو کچھ ودیعت ہوا تھا اس کے بعد انہیں اپنی شہرت و عظمت کے لیے ہمارے جلسے جلوسوں کی ضرورت نہیں البتہ میر انیس کی عظمت کا اعتراف کرکے اور انہیں نسل در نسل متعارف و روشناس کرا کے دراصل ہم اپنی ہی تہذیبی بقا کی بابت میں میر انیسؔ سے تعاون کے طالب ہو رہے ہیں ۔

قدیم یونانی شعراء کی یہ عام روش تھی کہ وہ کوئی رزمیہ یا کوئی بڑی نظم لکھنے کی نیت کرتے تو شعر کی دیوی یا MUSE سے طالب کرم و توجہ ہوتے

تھے۔ میر انیس نے بھی انہی اکابر رزمیہ شعرا کی روش کا اردو زبان میں یوں آغاز کیا

یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر

اور ہم نے دیکھا کہ میر انیس کی یہ دعا اور تمنا قبول ہوئی اور ان کی یہ نیک خواہش لفظ بہ لفظ بلکہ حرف بحرف پوری ہوئی

؎ جب تک کہ چمک مہر کے پر تو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میری قلمرو سے نہ جائے

میر انیس نے فخر یہ کہا تھا کہ . . . پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں . .
انہیں غمِ حسینؑ کو سرمایۂ حیات اور ارمغانِ نجات بنانے کا سلیقہ ورثے میں ملا تھا۔ انہوں نے نہ صرف انسانیت کے ایک عظیم موضوع کو تربیتِ انسانیت کا ذریعہ بنایا بلکہ خود مرثیہ کو ایک ایسی صنفِ سخن میں ڈھال دیا جس کی مثال دنیا کے کسی ادب اور زبان میں ملنی محال ہے معرکہ حق و باطل یا چراغِ مصطفوی اور شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری تاریخِ انسانی کا کوئی نیا واقعہ نہیں لیکن اسے میر انیس نے جس انداز سے انسانی جذبوں کی تہذیب و تطہیر کے لیے استعمال کیا ہے وہ ان کا ایک لازوال کارنامہ ہے۔

ارسطو نے المیہ کے ذریعے تزکیۂ جذبات یا catharsis کا جو تصور پیش کیا ہے اس پہ مرثیہ کے سوا کوئی اور صنفِ سخن پوری نہیں اتر سکتی اور مرثیہ میں بھی جو کمال میر انیس نے پیدا کیا وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہو سکا۔ ایک زوال آمادہ تہذیب میں حوصلہ، علو ہمتی اور اقدارِ انسانیت کی طرف مائل کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میر انیس نے جس ماحول میں مرثیے کے ذریعے ادب و شعر فکر و حکمت اور تہذیب و صداقت کا علم بلند کیا اور ان کے اس دعوے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

؎ سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

تنقید کی دنیا میں سحر انصاری پاکیزگی، فکر کا نشان اور تحقیق کا مکمل باب ہیں انہوں نے گلفشانی کی۔ اسٹیج پر علم کی روشنی بکھر رہی تھی۔ ہر طرف نور برس رہا تھا۔ ڈاکٹر محمود حسین، جی الانا، سید محمد تقی، رئیس امروہوی، شان الحق حقی، پروفیسر انجم اعظمی، پروفیسر ممتاز حسین، حمایت علی شاعر۔ پیار علی الانہ نے میر انیس کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کے فکر و فن کا جائزہ لیا۔ ممتاز نقاد مجتبیٰ حسین نے انتہائی مدلل اور عالمانہ انداز میں میر انیس کے فن کے حوالے سے بحث کی۔ فنکار کے خلوص پر نگاہ ڈالی۔ میر انیس کے زر خالص کو پرکھنے کے لئے مغرب کے پرانے ترازو نہیں بلکہ اپنے میزان وضع کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ممتاز نقاد فلسفی سید محمد تقی نے انتہائی مدلل، سنجیدہ، تعمیری اور سائنٹفک تنقید کے ذریعے میر صاحب کی شاعری پر نگاہ ڈالی۔ تقی صاحب حقیقی معنی میں عالم ہیں۔ تعصب، نفرت اور سازشوں سے ان کا دامن پاک ہے۔ ان کے یہاں زندگی اپنے اصلی روپ میں سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ روشن، صاف، اور اجلی، عہد جدید کی مدنی اور تنقیدی بصیرت کے صحیح خدوخال کا اندازہ ان کی مشعل صفات تحریریں دیتی ہیں۔ ان کی نظر ہر موضوع پر بیدار ہے۔ میر انیس کے فن پر ان کے مقالے نے داد تحسین وصول کی۔

ڈاکٹر محمود حسین وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے انتہائی جامع اور بلیغ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا۔ "انیس کی شاعری، ان کی مرثیہ گوئی اور ادبی حیثیت مسلم ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو بلند مرتبہ بخشا، ان کے کلام سے ادبی میدان میں نئی تحریک کی بنیاد پڑی، مرثیہ نگاری کو انہوں نے اپنے کمال فن سے اردو ادب کا ایک اہم اور لازمی جزو بنا دیا — یہ سب باتیں بالکل بجا ہیں اور اس پر اردو ادب کے عالموں اور تنقید نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے اور ابھی اور بھی لکھا جائے گا۔"

لیکن میں اس وقت انیس کے سلسلہ میں صرف ایک بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ ہے انیس کی حیثیت ایک معلم اخلاق کے طور پر۔ میرا خیال ہے انیس نے کردار کی بلندی، اخلاق کی عظمت، ایثار و قربانی کے جذبہ کو

حق کی حمایت اور باطل کے خلاف جدوجہد کرنے کو جس خوبی سے پیش کیا ہے وہ صرف ادبی شہ پارہ ہی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے ایمان کا ایک حصہ ہے، تعلیمی حیثیت سے درس و تدریس میں آج تک جس چیز کی کمی رہی ہے اور آج جس چیز کی شدت سے زیادہ کمی محسوس کی جا رہی ہے وہ بچوں اور بالغوں کی تعلیم میں کردار سازی اور ذہنی نشوونما میں اسلامی زندگی کے اس حصہ کی کمی ہے جس سے انفرادی اور اجتماعی کردار بنتا ہے۔ ایک سادہ مگر غیر موثر طریقہ اخلاقی تعلیم کا یہ ہے کہ جسے انگریزی میں code of conduct کہتے ہیں وہ بتا دیئے جائیں۔ "ایسا کرو اور یوں نہ کرو" اپنے اثر کے اعتبار سے اس طرح چیزوں کو پیش کرنے سے کامیابی مشکل ہوتی ہے۔ انیس نے یہ نہیں کیا۔ انیس نے اعلیٰ اخلاق کا ایک مثالی کردار لیا اور حضرت امام حسین کی زندگی کے ہر پہلو کو ایسے الفاظ میں پیش کیا کہ وہ زندگی جن اقدار کا بہترین نمونہ تھی وہ اقدار انیس کے طفیل لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو گئیں۔ اس اعتبار سے میں انیس کو نہ صرف اعلیٰ درجہ کا شاعر بلکہ نہایت کامیاب معلم سمجھتا ہوں۔ ایک پوری قوم کے ذہن پر وہ اثر انداز ہوئے اور وہ اثر اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اردو زبان زندہ ہے۔

ہم جب قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسی قوم نے مجموعی حیثیت سے زیادہ ترقی کی ہے جس نے اپنی ذہنی ترقی میں کردار کی بلندی کا خیال رکھا ہے۔

قوموں کی ترقی سے صرف صنعت و حرفت اور ٹیکنالوجی کی ترقی مراد نہیں ہوتی ہے۔ نہ ایک خاص زمانہ میں کسی خاص ملک یا قوم کی ترقی کو پیمانہ بنایا جا سکتا ہے، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان کی ترقی میں اس قوم کا کتنا حصہ ہے، اور کتنے عرصہ تک اس کے اثرات جاری رہے۔

یہی وہ بنیادی بات ہے جس کو ہم اسلامی اقدار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس حیثیت سے اگر انیس کے کلام کا تجزیہ کیا جائے اور اسے نصاب

کا حصہ بنایا جائے تو یہ اردو ادب ، اور پاکستانی قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

انیس پر میرا مطالعہ بہت محدود ہے ممکن ہے اس حیثیت سے بھی انیس پر لکھا گیا ہو اور کچھ کام ہوا ہو لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر واقعی ہم اس عظیم شاعر اور مفکر سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو تعلیمی طبقہ کو اس طرف خاص طور سے توجہ کرنا چاہیئے۔

میں جب کبھی انیس کا کلام پڑھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں۔ ان کے کلام میں ایک ایسی تاثیر، دلنشینی اور حلاوت ہے جو خود بخود دل و دماغ پر قبضہ جمالیتی ہے، یہ بات بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔ جو مرثیے اور رباعیاں نصاب میں داخل ہیں انہیں طلبا جلد یاد کر لیتے ہیں ۔ اس جگہ میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میری مراد صرف یہ نہیں ہے کہ ان کا کلام ہر جگہ نصاب میں داخل کر کے اس خیال کی تکمیل کر دی جائے بلکہ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ملک کے دانشور اور ماہرین تعلیم باقاعدہ غور کریں کہ ان کے کلام سے کردار سازی میں کس طرح صحیح طور کام لیا جا سکتا ہے۔ ''

جلسے کی صدارت فیض صاحب نے کی۔ اس جلسے میں شرکت کے لیے وہ لاہور سے تشریف لائے تھے۔ جلسے میں پہنچنے سے قبل "چند دوستوں" نے ان سے جا کر یہ بات جڑ دی کہ کانفرنس ملتوی ہوگئی ہے۔ انہیں کسی اور پروگرام میں لے جانے کے لئے آمادہ کر لیا۔ جلسہ میں ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ مجھے بر وقت اس واقعہ کا علم ہوا ۔ اور وہ تشریف لائے۔ " من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم'' فیض صاحب نے آہنی دلائل اور انتہائی سلجھے ہوئے انداز میں خطبۂ صدارت عطا فرمایا۔ " میر انیس نے کربلا کے عالمگیر موضوع کو فن کے پیکر میں ڈھالا . . . . انہوں نے قصیدے سے شکوہ الفاظ، مثنوی سے سادگی بیان، غزل سے سوز و گداز اور نظم سے تصورات کا تسلسل لے کر مرثیہ کا تاج محل ترتیب دیا . . . . .

فیض صاحب کے مقالے کے سلسلے میں ایک واقعہ یاد آگیا . . . جلسے کے خاتمے کے بعد انہوں

نے اپنا مقالہ میرے حوالے کیا ۔ ۔ ۔ پھر رک کر کہا ڈر ہے کہیں اس ہنگامہ آرائی میں بھول نہ جانا ۔ ۔ ۔ میں تمہاری حسب خواہش اضافہ کر کے خدیجہ بیگم کے سپرد کر دوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر تم ان سے لے لینا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں وہاں گئی لیکن باوجود کوشش کے وہ مقالہ نہیں مل سکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل اسی طرح ایک واقعہ اور بھی ہوا ۔ فیض صاحب کے کہنے پر میں نے ایک تھیسس بعنوان " اردو ادب میں سماجی شعور کا ارتقا " لکھا ۔ فیض صاحب نے نہ صرف دیباچہ لکھا بلکہ ہر باب پر باقاعدگی کے ساتھ نوٹس بھی تیار کیے ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے واپس کیا ۔ ۔ ۔ ۔ پھر سوچ کر کہا ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری زبان میں ایک کنک باقی رہ گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم ساتھ لے کر جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں سے تمہیں لا کر دیدینگے ۔ ۔ ۔ ۔ " لیکن وہ تھیسس کہیں گم ہوگیا ۔ ۔ ہر جگہ تلاش کیا ۔ ۔ ۔ ۔ آمنہ باجی سے بھی دریافت کیا لیکن بے سود ۔ ۔ ۔ ۔

حقائق فروشی اور محبت بیزاری کی کربناک فضا میں " جشن مجنوں " بھی تہذیب کے دامن میں خوشنما فوارہ تھا ۔ ممتاز شاعر شبنم رومانی اور صہبا لکھنوی مدیر افکار نے جشن کا اہتمام کیا تھا ۔ مجنوں صاحب کے اعتراف کمال میں دل والوں نے عقیدت کے پھول نچھاور کیے ۔ ممتاز ادیب و نقاد سید محمد تقی ، شان الحق حقی سید ہاشم رضا ، حمید الدین شاہد ، سید محمد جعفری ، قمر ہاشمی نے گلستان آباد کیا ۔ ڈاکٹر احسان رشید نے روایتی ادب نوازی کے ساتھ خراج پیش کیا ۔ ممتاز و مایہ ناز نقاد و ادیب ڈاکٹر سید عبداللہ ، احمد ندیم قاسمی ، اور پروفیسر مجتبیٰ حسین کے پیغامات سنائے گئے " دانائی کا آفتاب " کے خالق قمر ہاشمی جن کی فکر جوان اور لہجہ مترنم ہے محبت کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر مجنوں صاحب کو نذرانہ پیش کیا ۔ انجم اعظمی نے مجنوں صاحب کی شخصیت اور فن پر نگاہ ڈالی ۔ ممتاز ادیبہ حاجرہ مسرور کے قلم نے موتی بکھیرے ۔

مشہور صحافی مختار زمن نے یوں گلفشانی کی ۔ ۔ ۔

" اک حشت استخواں کہ مجنوں کہیں جسے " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذہن کے سیپ سے جو موتی نکلتا

ہے وہ ہمیشہ باقی رہتا ہے ۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی سائنس کے شناور اور دریائے ادب کے مشاق تیراک ہیں ۔ جنہوں نے چٹانوں سے دودھ دوہا ہے یوں خراج پیش کر رہے تھے ۔ " صحیح معنی میں نقاد وہی ہو سکتا ہے جس کے دماغ میں ہزاروں دماغوں کی صلاحیتیں موجود ہوں . . . . مجنوں حال نہیں مستقبل کے بھی چراغ ہیں

ممتاز نقاد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ، جشن مجنوں کے صدر تھے ۔ ڈاکٹر صاحب اور مجنوں صاحب غالباً ایک ہی باٹ سے تلے ہیں . . . . دونوں ایک ساتھ بیٹھے ہوئے یوں لگ رہے تھے جیسے کامنی اور جوہی کے پھول گلدان میں ایک ساتھ مہک رہے ہوں ۔ ادب کی دنیا میں ڈاکٹر صاحب کا قلم ہمیشہ گھٹا بردوش رہا ۔ انہوں نے اپنے ذہن کی تند و تیز روشنی سے اسرار حیات کو فاش کیا تاکہ پیکار حیات آسان ہو جائے . . . .

" جشن مجنوں " جدید عہد کی آواز تھا ۔ یہ پاکستان کی تہذیبی قبا میں کرن ٹانکنے کی خوبصورت کاوش تھی . . . تاکہ نئی نسل اپنے خزینوں سے واقف ہو ، سچے موتیوں سے آب و تاب لیکر مستقبل کے آنچل کو لالہ رخ بنا دے . . . . . . یہ جشن اس سرزمین پہ ہوا جو شاہ بھٹائی ، سچل سرمست ، شیخ ایاز ، سائیں پلیجو ، حیدر بخش جتوئی ، فاضل راہو ، جام ساقی اور جی ایم سید کی سرزمین ہے ۔ محبت کی خوشبو سے بوجھل ۔ ہر آنے والے کو گلے کا ہار بنانے والی زمین یہ وہ زمین ہے جس کا ہر بوٹا دوسروں کے لئے سوزن ہے لیکن خود عریاں ہے ۔ بیوہ کی ننگی کلائی کی طرح . . . . اس زمین کی گردن میں باہنیں انہوں نے بھی ڈالیں جو گجرے انہوں نے بھی پہنائے جو اودھ کی لطافتیں ، کاشی کا ترنم ، گوتم کا لیکتا ہوا پیار ، آزادی کے بے نام غیور شہیدوں کے سلام کا سچا عزم اپنے ساتھ لائے تھے ۔ جنہوں نے قدم تھم تھم کر اٹھائے . . . محبت کے بولوں سے زمین کو سمن زار بنایا تو . . . لیکن ذرا دیر سے ۔

انہوں نے اس زمین میں میر کی سحر کاری ، انیس کی " اعجاز بیانی" نظیر کے چٹکیلے بول، خسرو کا تغزل ، غالب کا تفکر زمین کی نس نس میں پیوست کیا ... کڑی دھوپ میں چاندنی کھلائی .... مجنوں صاحب انہیں نقرئی کڑیوں کا ہار ہیں - انہیں ہاروں سے لاد دینا تو عبادت تھا ..... ان کے عہد میں سانس لینا بھی تو عبادت ہے کتنے بڑے اور کتنے چھوٹے انسانوں سے قریب — ان کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت مجھے بھی حاصل ہوئی ہے۔ کاظم کی ماں نے شادی کے موقع پر مجھے نولکھا ہار دیا تھا۔ میں نے اس سے قبل ایسا ہار دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے اس کی قدر معلوم نہیں تھی - مجنوں صاحب کو دیکھ کر یقین آگیا ...... نولکھا ہار کتنا خوبصورت اور کتنا قیمتی ہوتا ہے ..... عزم کی پختگی ، عشق کی سچائی ، عقل کی شعلگی ، شبنم کی نرمی ، اور دریا کی روانی کو سمیٹ لینے کی اگر قدرت پیدا ہو جائے تو مجنوں صاحب کو انسان پالیگا ورنہ نہیں ....

مجنوں کے آہنی دلائل سے مسلح یہ الفاظ زمانے سے خراج وصول کرنے کے لئے کافی ہیں - جو فلسفۂ تغیر سے آشنا ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ " ادب ترک یا پتیا کی پیداوار نہیں ..... شاعر اندرونی اپج سے مجبور ہو کر جو کچھ کہتا ہے وہ بظاہر انفرادی بات نظر آتی ہے لیکن وہ خارجی حالات و اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے ...

لینن نے کلدزارٹکن سے انتہائی خوبصورت یہ بات کہی تھی " خوبصورت چیزوں کو چاہے وہ کتنی پرانی کیوں نہ ہوں ہمیں محفوظ رکھنا چاہئیے ... ... لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قدیم محض قدیم ہونے کے سبب بقا پائے گا ... بلکہ چھان پھٹک کر اس میں سے موتی نکالنا ہے .... "

مجنوں صاحب نے ایک مقام پر ایسی ہی بلیغ فکر کی نشاندہی کی۔

" ماضی سے نہ انسان کی زندگی انکار کر سکتی ہے نا ادب ... انسان

جو کچھ ہے ماضی کا بنایا ہوا ہے ... آئندہ جو ہوگا ماضی اور حال کی بدولت ہوگا ...
... جو جماعت مستقبل کے جنون میں ماضی کی اہمیت بھول گئی ہے اور بغیر تاریخ اور ارتقا کو سمجھے پکار رہی ہے۔ اسے صرف یہ کہنا ہے کہ وہ ادب ترقی نہیں کرسکتا جس میں روح عصر کے ساتھ ماضی کی روح بھی موجود نہ ہو ...."

سندھ کی زرخیز سرزمین پر "جشن رئیس امروہوی" نے بھی تہذیبی زندگی کی قبا میں گل بوٹے کھلائے۔ رئیس صاحب فرد نہیں انجمن ہیں۔ محبت بیزار دنیا میں وہ سراپا محبت، سراپا خلوص ہیں۔ پورے وجود میں مٹی کی سوندھی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ ان کی شاعری دھرتی کے سینے سے لگ کر چلتی ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ شاعر خلق اللہ سے بیگانگی برتے اسے اس کا حق نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ اس کا نفس مجبور کا نفس ہوتا ہے۔ مایہ ناز نقاد، ادیب سحر انصاری نے جشن رئیس میں موتی لگائے۔ ممتاز صحافی اور شاعر انعام درانی نے رئیس امروہوی کے فکر وفن پر تحقیقی مقالہ پڑھا۔ انعام درانی، شمع انجمن بھی ہیں اور علم و دانش کا چراغ بھی، بیکیہ وہ نابھی ہیں اور ترقی پسندی کی مکمل تحریک بھی ...
رئیس صاحب کی شخصیت پر ان کے مقالے نے جی بھر کر داد وصول کی ...... " اردو ادب میں رئیس امروہوی عظمت و بزرگی کی علامت ہیں۔ انہوں نے خون جگر سے صرف ہندوستان میں نہیں پاکستان کی مقدس زمین میں بھی گلکاری کی ہے۔ قلم سے تیرگی کو کاٹا ہے اور جہالت کی ٹڈیوں کو ایندھن بنایا ہے ..... جہاں بھی اس وقت تاریکی کے خلاف جہاد ہے۔ رئیس امروہوی کا لہو اس میں شامل ہے۔ ان کا پیغام محبت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

کسی بھی مہذب معاشرے میں صحافت اجالوں کی نوید گنگناتی سحر کا مژدہ اور تہذیب و سیاست کی رزاق ہوتی ہے۔ وہ اپنی نگاہ بصیرت سے حکمرانی کی قبا کی تراش خراش کرتی ہے سماج کے اعلیٰ اقدار کو آگے بڑھاتی ہے۔ صحافت کے وجود میں تابندگی آزادی فکر و نظر و اظہار سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں بحمدللہ

کبھی یہ صورتحال پیدا ہی نہیں ہوئی۔ ہر عہد میں پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈی نینس کی تلوار لٹکتی رہی۔ پریس اینڈ دالش کی حکمرانی رہی۔ مقدس نظام میں یہ تلوار دو دھاری ہوگئی ہے۔ رپورٹر، فوٹوگرافر ہر گلی اور ہر موڑ پر بسوں کی ٹکریں کھاتے، موٹر سائیکلوں سے گرتے پڑتے خاک بہ سر، لہو لہان، بس ایک ہی کام پر متعین ہیں۔ دندان مبارک کا قصیدہ لکھیں۔ چشم و ابرو کی تصویر کشی کریں، مقدس نظام کے لئے لہو کی پیش کش کریں۔ مدقوق چہرے لے کر گھر واپس جائیں . . . . انکار کیا تو پشت نیلی، زبان بریدہ، بدن دریدہ . . . . اور بس۔ صحافت کو زمین کا درد سمیٹنے کی اجازت نہیں۔ خونِ سحر پینے والوں کو عذاب جہنم کی بشارت دینے کی اجازت نہیں۔ فرمان الٰہی یہی ہے۔ فرض ہے . . . صحافی کی قیمت چار آنے — حسرتیں نادیدہ ہیں تو کیا۔ سرمایہ تو پھل پھول رہا ہے۔ ٹھنڈے ممالک تو آباد ہیں . . . .

لیکن تمام پابندیوں کے باوجود صحافت صبر آزما منازل طے کرتی رہی۔ حکمت و دانش، شعور و آگہی کی نت نئی مشعلیں روشن کرتی رہی۔ اس لئے کہ اس کی روایت روشن خیالی ہے اس نے ہر عہد میں کہنہ روایات اور استحصالی سیاست کے خلاف آزادی، عدل و انصاف کا نعرۂ مستانہ لگایا، صلیبوں کو لبیک کہا لیکن سر کو بلند رکھا — "چند" کو چھوڑ کر بیشتر نے پُر آشوب دور میں بھی قلم کو زنگ آلود نہ ہونے دیا۔ تخلیق ادب و تہذیب کا فریضہ انجام دیتے رہے — "ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے۔" پر عمل کرتے ہوئے کہیں مظہر علی خاں فرہاد زیدی، احمد علی خاں، اے ٹی چودھری، اے آئی رحمان، صفدر برلاس، اشتیاق اظہر واجد شمس الحسن، حسین نقی، محمود احمد مدنی، ایم بی نقوی، ارشاد راؤ، محمود شام، منہاج برنا، غازی صلاح الدین، نفیر حیدر جیسے کروڑوں سورج تاریکی کو کاٹتے، حریت فکر اور قلم کے تقدس کے لئے فکر و خیال کی نئی قندیلیں روشن کرتے تہذیب کے دامن کو گل و گلزار بناتے آگے بڑھتے رہے اس قافلۂ دلبراں میں لیل و نہار، نقوش، فنون، افکار، معیار، ادب لطیف

Prof. SHARIB RUDAULVI COLLECTION

نہ جانے کتنے خوبصورت جریدوں، اخبارات کے سرفروشوں " کا بھی لہو شامل ہے۔ اس عزم کے ساتھ کہ سیاسی، معاشی اور تہذیبی سطح پر بدصورتی کا داغ دھوکر تہذیب کو خوبصورت بنانے کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ میں نے صحافت کی دنیا میں باقاعدگی کے ساتھ کام تو نہیں کیا لیکن ان حضرات کی جدوجہد میں شریک ہونے کا شرف یقیناً حاصل ہوا۔ جو میرے ذہن کی تربیت میں معاون و مددگار ثابت ہوئی۔

نقش و نگار کو بڑھانے میں لوک ورثے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جس وقت سماج میں طبقات وجود میں آئے اور آقا و غلام، زمیندار و ہاری کی تعلیم شروع ہوئی اس وقت ایک تقسیم اور بھی عمل میں آئی وہ تھی ذہن اور ہاتھ کی تقسیم۔ قوت کے حوالے ہاتھ ہو گئے اور اقلیت ذہن کی وارث بن بیٹھی۔

ہاتھ اور دماغ کی تقسیم کے سلسلے میں گورکی نے بہت خوبصورت بات کہی وہ لکھتا ہے کہ " انسان کا تہذیبی اور سماجی ارتقا صرف اسی صورت میں صحت مند رہ سکتا ہے جب ہاتھ دماغ کی تربیت کریں اور یہ تربیت یافتہ دماغ ہاتھوں کی تربیت کرے اور یہ اور زیادہ تربیت یافتہ ہاتھ زیادہ اچھی طرح دماغ کی تربیت اور ترقی کا سامان کریں . . . . محنت کش انسان کی تہذیبی ترقی کا یہ صحت مند اور جاندار عمل زمانۂ قدیم میں رُک گیا . . . . دماغ ہاتھوں سے جدا ہو گیا اور فکر ٹھوس زمین سے الگ ہو گئی۔ پھر کام کرنے والوں کے درمیان سوچ بچار کرنے والے انسان نمودار ہوئے اور دنیا اور فکر کے ارتقا کے اصول مجرد اور ہوائی طریقے سے سمجھانے لگے۔"

" تب سے آرٹ اور فن میں دو متوازی دھارے بہہ رہے ہیں . . . ایک اعلیٰ سطح پر بہہ رہا ہے جو ارسطو، شیکسپیئر، ٹیگور، غالب، کالی داس سے فیضیاب ہوتا ہے۔" گو یہ دھارا سماج کی بالائی سطح پر بہتا ہے لیکن دوسرے دھارے یعنی عوامی سطح سے اس کے رشتے کسی نہ کسی شکل میں جڑے ضرور رہتے ہیں۔

عوامی دھارا زمین کے سینے پر بہتا ہے اور یہ انسانی ارتقا
کی طرح ناپید اکنار ہے ۔ اس میں عوامی حکایات، گیت، گانے، کہانیاں، داستانیں سب کچھ ہیں ۔ یہ عوام کے صدیوں کے تجربات کا نچوڑ ہیں ۔ ان میں سلگتی کہانیاں بھی ہیں بدن کے نگر کے گیت بھی ہیں ۔ لوجھل ظلمتیں بھی ہیں ۔ ذہن کی گنگناتی شہنائیاں بھی ہیں ۔ سوگوار رباعیاں بھی ہیں، نغمہ بار بدن کی برکھا بھی ہے ۔ رات کا ڈھلکتا ہوا آنچل بھی ہے، امید کی پسپائی بھی ہے رفعتوں پر لپکتی سورج کی کرنیں بھی ہیں ۔

پاکستان کی سرزمین کو اور اس کی تہذیب میں
ستاروں کی کرن ٹانکنے میں لوک کہانیوں، گیتوں اور قصوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے ۔ سندھ ہو یا بلوچستان سرحد ہو یا پنجاب "اعلیٰ کلچر" کے ساتھ عوامی کلچر کا دھارا بہہ رہا ہے ۔ اس عوامی کلچر کے خالق وہ بے چین شرارے، اور سورج ہیں جن پر علم و حکمت کے سمندر نے فیضیاب ہونے پر منفی جبر کا پہرہ لگا ہوا ہے ۔ جن کی عورتیں فاقوں کی چتا میں جلتی ہیں جن کی مستقبل کی کرنیں وقت سے پہلے جھلس جاتی ہیں ۔ لیکن پھر بھی یہ "خونِ جگر" سے فن کو تابانی بخشتے رہیں ۔ سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب کی سرزمین پر لوک ورثے نے جو نقش نگاری کی ہے اور تہذیب کو جس طرح آگے بڑھایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن "لوک ورثہ" ادارہ کو چھوڑ کر افسوس ہے کہ حکومت کی سرپرستی میں اس عظیم خزینے کو کھنگالنے کی کوشش نہیں کی گئی ۔ ہر فن ہمت افزائی کا طالب ہے لیکن جس وقت فن غلامی کی زنجیر گراں پہنے ہوئے ہو ۔ وہاں ہر شجر خشک ہو جاتا ہے، ہر ڈال مرجھا جاتی ہے ۔ ہر پھول نڈھال ہو جاتا ہے ۔

"لوک ورثے" کو چھوڑ کر یہاں دور دور تک سناٹا ہے ـــــ کہیں کہیں نخلستان نظر آتے ہیں لطف اللہ صاحب کی لائبریری عجوبۂ روزگار ہے جس میں موسیقی کے ہر پہلو پر مواد دستیاب ہے اس لائبریری کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسان اگر اپنی تمام صلاحیتوں کو کسی اعلیٰ مقصد کے لئے وقف کر دے تو کتنی روایتوں کے تسلسل کو مقید کر سکتا ہے اور کتنے نت نئے افق جگا سکتا ہے ـــــ اسے حکومت کی سرپرستی نصیب نہیں یہ تو بس ایک ہی شخص کا عظیم کارنامہ ہے

امن

پاکستانی سیاست کا باطن پیچ در پیچ ہے ـــــ لیکن
اگر زمینی رشتوں کی پہچان ہے تو بات اتنی دشوار بھی نہیں ـــــ ظاہر ہے درخت بیج سے اگتا ہے ۔ بیج ڈالنے سے قبل زمین گوڑی جاتی ہے، ہل چلایا جاتا ہے ـــــ زمین کروٹ لیتی ہے ـــــ بیج کو دھرتی کی گرمی ملتی ہے ـــــ اکھوے پھوٹتے ہیں، کونپلیں نکلتی ہیں شاخیں پھیلتی ہیں، درخت قد نکالتا ہے ۔ پھول کھلتے ہیں، پھل آتے ہیں ـــــ پھل میٹھا ہے یا کڑوا یہ کھاد، پانی اور بیج کی اچھائی برائی پر منحصر ہے ۔

ہندوستان و پاکستان نے انگریز سے آزادی حاصل کی ۔ دو خودمختار مملکتیں وجود میں آئیں ۔ پرچم جدا، جینے کا ڈھنگ جدا ۔ لیکن شک، شبہات بدگمانی، نفرت، کشیدگی دونوں جانب یکساں، برطانوی سامراج کا عطا کردہ تحفہ،

دونوں ممالک میں کشیدگی کے اسباب و علل کے رشتے بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس میں بنیادی حیثیت کشمیر کو حاصل ہے ۔ ۱۹۴۷ء سے آج تک کشمیر مسئلہ لاینحل بنا ہوا ہے ۔ پاکستان اور ہندوستان میں کشیدگی کا پہلا سبب یہ ہوا کہ پاکستان اپنی دفاعی ضروریات کے تحت سیٹو اور سنیٹو کا ممبر بنا ۔

دوسرا ۔ ہندوستان اور سوویت یونین کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوئے ۔ ۱۹۵۲ء میں روسی ڈیلیگیٹ یعقوب ملک نے یو ۔ این ۔ او ۔ میں تقریر کرتے ہوئے اس بات کی جانب توجہ دلائی کہ امریکہ پاکستان کو فوجی معاہدوں میں شامل کر کے کشمیر میں de sea base بنانا چاہتا ہے ......"

P.N. Bazaz, Kashmir in crucible New Delhi - 1967 - P117.

تیسرا ۔ اسی زمانے میں روس چین تعلقات میں دراڑیں پڑنی شروع ہوئیں ۔ لیکن ہندوستان اور چین کے تعلقات بہتر تھے ۔ چنانچہ اس دوران جب چو این لائی نے پاکستان کا دورہ کیا تو یہی کہا کہ ہند پاک تعلقات مفاہمت کے ذریعے طے ہونا چاہیئے ۔

چوتھا ۔ ۱۹۵۹ء میں ایوب خاں نے "No war pact' کی پیشکش کی لیکن

پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ پنڈت جی کا خیال تھا کہ یہ ایک قسم کا فوجی معاہدہ ہو گا جو ہندوستان کی جمہوری طرز فکر کے منافی ہے۔ چنانچہ پاکستان اس رویے سے بددل ہوا۔ اور اس نے چین سے اپنا رشتہ مضبوط کرنا شروع کر دیا۔

پانچواں ۔ ۱۹۶۲ء میں ہند چین جنگ ہوئی۔ جس کے دوررس اثرات پاک ہند تعلقات پر مرتب ہوئے۔ پاکستان نے ہندوستان پر کڑی نکتہ چینی اس حوالے سے کی کہ اس نے چین پر حملہ کیا۔

"China is teaching them how foolish the dreams of conquest can proue." Oct-24 - 1962

چھٹا۔ ابتدا میں چین اور پاکستان کے تعلقات فرضی سے تھے۔ لیکن جس وقت پاکستان سیٹو کا ممبر بنا۔ چین خوش ہوا۔ کیونکہ اس کے خیال میں یہ معاہدہ ہندوستان کے خلاف تھا۔

The Chinese Correctly asserted that PAK's membership of SEATO war only to increase her military strength against India

Russel Brines The Indo - PAK Confliet Bombay - 1970 - P-182

ساتواں ۔ کچھ کے حادثے نے بھی دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی بڑھانے میں مدد دی

آٹھواں ۔ دونوں جانب نفرت کا دھواں اٹھتا رہا۔ سرمایہ داری کا مقدر تضادات ہیں اس کا حل جنگ ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں جنگ کے شعلوں نے دونوں جانب زمین کو دوزخ بنا دیا۔ بچوں نے ہاتھوں پر دم توڑ دیا۔ وقت سے پہلے ماؤں کے بال پک گئے۔

امریکہ روس اور برطانیہ نے جنگ ختم کرانے کی کوشش کیں ceasefire ہوا۔ معاہدہ تاشقند، ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان میں مختلف قسم کا ردعمل ہوا — ہندوستان کی پارلیمنٹ میں لال بہادر شاستری پر کڑی نکتہ چینی کی گئی۔ جن سنگھ کے لیڈر نے اسے "Betrayal of assuranees" کہا۔

پاکستان میں سردار شوکت حیات نے کہا "اس معاہدے میں عوامی امنگوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا"۔ نظام مصطفیٰ کے قائد چوہدری محمد علی، جماعت اسلامی

کے قائد مولانا مودودی اور عوامی لیگ کے قائد نواب زادہ نصر اللہ خاں اس معاہدے کو "Meaning less" قرار دیا ۔ نیشنل عوامی پارٹی کے قائد جناب محمود الحق عثمانی اس معاہدہ کو

Trumph of Sanity reason & forces of peace. DAWN - 13-Jan -1966

ذی شعور اور بیدار مغز انسانوں نے اس معاہدہ کا خیر مقدم کیا ، پیڑوں پر بیلیں چڑھنے لگیں ۔ اونچی شاخیں لہرانے لگیں ۔ ماؤں کی بانہیں جھولنے لگیں ۔ " آگ میں پھول" کراچی میں بھی کھلے ۔ " پاک ہند دوستی کی انجمن" کی داغ بیل ڈالی گئی ۔ مجھے صدر کے فرائض سپرد ہوئے ۔ رئیس امروہوی نائب صدر، سیکریٹری جنرل محمود فریدوں منتخب ہوئے ورکنگ کمیٹی میں پروفیسر رئیس احمد (سراج الدولہ کالج) ممتاز صحافی اور مزاح نگار ابراہیم جلیس، گوہر نایاب، حمایت علی شاعر، نغمہ بار ادیب سرور بارہ بنکوی، مزدور رہنما نبی احمد ممتاز صحافی اکرام مہدی، ممتاز رہنما اسد اللہ خان اور سرفراز احمد خان اور ہمارے دیرینہ کرم فرما اور مایہ ناز محقق، بلند پایہ، ادیب، شاعر، عالم جون ایلیا تھے ۔ انجمن کا پہلا جلسہ ہم نے اپنے گھر پر کیا ۔ گلباری کی جگہ سنگ باری نے ہمارا خیر مقدم کیا ۔ قصور کسی کا بھی نہیں تھا ۔ انسانی ذہن کو اگر تواتر کے ساتھ نفرت کے پانی سے سینچا جائے تو اس سے زہر ہی نکلے گا امرت نہیں ۔ انجمن کے اعلانیہ میں کہا گیا کہ . . .

امن انسان کی طرح ناپیدا کنار ہے ۔ یہ جہل کے جنگل میں رنگوں کی معطر وادی ہے ۔ انسانوں سے عشق پنہاں کی گاگریں چھلکانے کا دوسرا نام ہے ۔ جسموں کے رقص و رنگ کے جھولنے کی ادا ہے ۔

امن کا لفظ مجرد نہیں ۔ یہ مانجھیوں کے گیتوں کا زیر و بم ہے

ہتھیاروں کی ریشمی دلائی ہے ۔ اوزاروں کی چوٹ کھایا ہوا کندن ہے ۔ اس کی بنیاد معاشرتی عدل و انصاف پر ہے ۔ یہ ہر انسان کے کلیجے کی پکار ہے ۔ کنوارے ہونٹوں کی خوشبو ہے محبت کا مدہم راز ہے ۔ ہر ماں کے آنگن کی چاندنی ہے ۔ یہ ذہنی پختگی کی علامت ہے ۔ امن کی بناوٹ کا تانا بانا سفید ریشم کے لچھوں سے تیار ہوتا ہے ۔

لیکن بازار میں اس سے ملتا جلتا نقلی مال بھی بہت ملتا ہے ۔

ایٹمی اسلحے کے دوڑ کے حامی ۔ اسٹار وارز کے پرجوش داعی کھربوں ڈالر کے بیرونی قرضے کا بوجھ برِاعظموں کو اپنے دام میں گرفتار کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں جو اسلحہ کی دوڑ کا براہ راست نتیجہ ہے یہ قوتیں انسان کو دھان اور تیل کی طرح بکاؤ مال سمجھ کر اپنے مفادات بچانے کے لئے جنگ کا ایندھن بناتی ہیں ۔ یہ دکان لگاتے ہیں ۔" لوگ دام دیتے ہیں ۔ یہ اسلحہ بیچتے ہیں اور جھوٹے مال پر جھوٹے " امن " کا نام لکھتے ہیں ۔ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں ۔

چھوٹے اور بڑے ہر ملک کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی معیشت کو سامراج کے بیرونی قرضے کے بوجھ سے آزاد رکھے ۔ فوجی اخراجات کم کرکے جنگ کا آغاز ، جہالت مفلسی اور تاریکی کے خلاف کرے ۔ جنگی تیاریوں اور طاقت کی سیاست کا پردہ چاک کرے ۔ اس لئے کہ امن کے تحفظ کے سوال میں انسانیت اور حیوانیت ، جمہوریت اور آمریت کی آزمائش ہے

پاکستان کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ حکمرانوں نے تیغ طرف اندھیرے اور ایک طرف اجالے کے نظام کو دوام بخشنے کے لئے کئی اصول وضع کیے اس میں ایک یہ بھی تھا کہ عوام کی توجہ بنیادی مسائل سے ہٹانے کے لئے " سرحد " پر کسی طور شعلے ، بھڑکائے رکھنا لازمی قرار دیا جائے ۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے " اسلام کو خطرے " میں ڈالا گیا ۔ اور " ہندوستان سے جنگ کی گھنٹی " بجانے کا فریضہ انجام دیا گیا . . . .

افہام و تفہیم کے ذریعے ہر مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے ۔ بارود اور سنگین مسئلہ کا حل نہیں ۔ . . . مسئلہ کو الجھانے کی سازش ہیں ۔

بہرحال وقت گذرتا رہا ۔ انجمن کام کرتی رہی ۔ یہاں تک کہ نفرت سے سینچی ہوئی زمین پر محبت کے اکھوے پھوٹنے لگے ۔ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زمین پر فصلِ بہاراں کے نقیب گنگا جل لے کر آنے لگے ۔ تکرار یہی تھی کہ سیاسی مسائل گولہ بارود سے نہیں افہام و تفہیم کے ذریعے طے ہونا چاہیئے ۔ سیاسی مسائل سیاسی اندازِ فکر کے طالب ہیں ۔ جڑوں میں اتری ہوئی محبت کے رشتے نوکِ خنجر اور سنگینوں سے کاٹے نہیں جا سکتے ۔ محبت کی بات چل نکلی تھی ۔ "یہی بات ان کو بہت ناگوار گذری" ۔ انجمن پر پابندی عائد کی گئی ۔ انجمن کے تحت نکلنے والا رسالہ "نیا سویرا" بحق سرکار ضبط ہوا ۔ بات واضح تھی اگر دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی نہیں تو اتنی بڑی فوج رکھنے کا جواز نہیں بنتا ۔ اگر ایک محاذ پر تعطل ہو تو دوسرا محاذ اس فکری نقطۂ نگاہ کے تحت کھلا رکھنا لازمی ہے جیسا کہ "آج افغانی" محاذ ہے ۔ غرضیکہ حکمراں طبقہ کو کشیدگی کی فضا راس آتی ہے ۔ امریکی سامراج سے بندھی ہوئی معیشت ہتھیاروں کی ترسیل سے بندھنے پر مجبور ہے ۔ جس دن اور جس گھڑی سامراج سے ہماری زمین آزاد ہوئی اس خطہ میں حقیقی امن قائم ہو سکے گا اس سے پہلے نہیں ۔

انجمن پر سے پابندی اٹھانے کے لئے میری اور محمود فریدوں کی دوڑ دھوپ جاری رہی ۔ اس زمانے میں ممتاز شاعر آل رضا صاحب کے داماد مہدی مسعود امورِ خارجہ کے ڈائریکٹر تھے ۔ کاظم کے دوست ہونے کی وجہ سے ہماری بھی ان سے اچھی خاصی ملاقات تھی ۔ مہدی مسعود کا سراپا نکھری ہوئی صبح اور ذہن براق صفت ہے ۔ ہم نے ان کے سامنے اپنی کہانی بیان کی ۔ لیکن بات بنی نہیں ۔ مدد کے لئے اپنے انتہائی پر معزز استاد احسن علی خاں کا سفارش نامہ لیا ۔ لیکن بے سود ۔

آغا شاہی کی بہن زارا ، اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں میری دوست رضیہ غلام علی کے گھر پر ان سے ملاقات ہوئی ۔ زارا کی میراث ذکاوت ، ذہانت اور علم دوستی ہے ۔ میں نے ان کی دوستی سے فائدہ اٹھایا ۔ نتیجے میں آغا شاہی جو اس وقت سکریٹری جنرل

برائے امور خارجہ تھے۔ ان سے ملاقات کی - آغا شاہی پاکستان کے بے تاج کے بادشاہ ہیں۔ زبان گہربار اور ذہن آہنی دلائل سے مسلم ہے۔ ہر آن "گویا دبستان کھل گیا" کی منزل پر ہیں۔ بہرحال انہوں نے ہماری انجمن پر سے پابندی اٹھانے کا مطالبہ تسلیم کیا لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ بات low key پر رہنا چاہیئے۔

کچھ عرصے بعد صحافیوں کا ایک ڈیلیگیشن ہندوستان سے آیا۔ مایۂ ناز صحافی سعید نقوی بھی اس میں شامل تھے۔ آغا شاہی نے اپنے گھر پر ہم لوگوں کو چاء پر مدعو کیا ان کے باغ سے گذرتے ہوئے صوفیہ کے ایسے گلاب کے پھول پر نگاہ پڑی۔ سوچا کیوں نا اسی کو بطور تحفہ دیدوں۔ چنانچہ اندر داخل ہوتے ہی پھول پیش کیا۔ پھول کو دیکھتے ہی یہ محسوس ہوا کہ تاڑ گئے۔ خوبصورت مسکراہٹ آنکھوں سے عیاں تھی . . . .

It is a lovely present ....from where did you get this flower?"

میں نے تھوڑی دیر ٹھہر کر کہا - آپ ہی کے باغ سے توڑ لیے۔ مسکراتے ہوئے بولے

"This is a unique way of giving present

فاضلانہ انداز میں ہندو پاک تعلقات پر نگاہ ڈالی۔ سعید نقوی نے اپنا موقف پیش کیا۔ گفتگو بہت دلچسپ تھی۔ بحث و مباحثہ کے خاتمہ پر کاظم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا . . . .

Your wife s very talented "but she's ow the wrong track

پھر خود ہی بہت زور سے قہقہہ لگایا. . . . . . . مجھ سے مخاطب ہو کر بولے اگر آپ اپنے نظریات کی ، تطہیر ، کر ڈالیں تو میں آپ کو سفیر بنا کر بھیجنے کے لئے تیار ہوں . . . . - -

چونکہ یہ remark مارشل لاء حکومت کے دوران دیا گیا تھا اس لئے بجز خاموشی کے اور کیا جواب ہو سکتا تھا . . . . . . بہرحال گفتگو جاری تھی کہ اچانک چونک کر

بولے ۔ ہم نے آپ لوگوں کو چاۓ پہ بلایا تھا . . . . لیکن آج خانساماں چھٹی پر ہے . . . . ہم چاۓ کی طرف سے مایوس ہو گئے . . . . .
تھوڑی دیر میں دیکھا خود چاۓ بناکر ہمارے سامنے لگا رہے ہیں . . . .
پھل دار درخت کیسے جھکتا ہے ۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح اس وقت کھل کر سامنے آگئی
بہر حال تاریخ کا کارواں آگے بڑھتا گیا ۔ سامراج کے کارندوں نے ایک مرتبہ پھر زمین پر خون کی ہولی کھیلی ۔ آنگن کی رونق کجلاگئی ۔ چوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں . . . لیکن محبت کا بیج پھر لہلہانے لگا ۔ سیاسی تحریکوں نے جنم لیا ۔ پاکستان کے غیور عوام نے محبت کا پرچم بلند کیا ۔ پیپلز پارٹی نے منشور کے وعدے نبھاۓ تاریخ ساز معاہدۂ شملہ، ہوا جس پر مجسمہ اندرا گاندھی اور ذوالفقار علی بھٹو کی ذہانت و ذکاوت کی مہر ثبت ہوئی ۔ عوام کی امنگوں اور آرزؤں کی تکمیل ہوئی ۔ امن کے لئے ان کی قربانیوں نے ثمر پایا ۔ امن کی ڈالی مہکی ۔ خوشبو پھیلی ۔ رنگارنگ محفلیں سجیں ۔ ممتاز صحافی خشونت سنگھ، دلیپ مکرجی، کلدیپ نائر، اندر ملہوترا ستیش جیکب وغیرہ تشریف لائے ۔ خشونت سنگھ کے اعزاز میں خوب ہی خوب محفلیں منعقد کی گئیں خشونت سنگھ صرف صحافت کا منارۂ درخشاں ہی نہیں ادیب ہونے کے رشتے سے نفسیات کے نباض بھی ہیں ۔ نفرتوں کو کاٹ کر محبت کا گلستاں کھلانا جانتے ہیں ——— شملہ معاہدے کے بعد دونوں جانب محبت کی گنگا بہہ رہی تھی کیونکہ گو ہندوستان و پاکستان دو آزاد، خودمختار ریاستیں ہیں ۔ ایک گنگا جل کا اشنان کئے، پور پور میں پھولے پہنے، ہندیا لگاۓ ہوئے ہے تو دوسری کوثر و تسنیم میں نہائی ہوئی ہے ۔ یاقوت و مرجان سے مزین ہے لیکن پیپیہے کے کلیجے کی پکار دونوں طرف یکساں ہے ۔ دونوں جانب بالائی سیاست نے اپنے طبقے کے مفادات کے پیش نظر بھوک کے الاؤ اور جھاڑ جھنکاڑ پھونکنے کے بجاۓ انسانوں کو خاکستر کیا ۔ لیکن درد کے رشتے پھیلتے گئے ۔ دونوں ممالک کی تہذیبی رنگارنگی ماضی کی یاد دلاتی، حال میں ہنستی، مستقبل کے وسیع سمندر کی طرف گامزن ہے ۔

ہندوستان کے کاؤنسل جنرل شری پارتھا سارتھی

ہماری پاک انڈیا فرینڈشپ سوسائٹی نے ممتاز مغنیہ شانتی ہیرانند کی پاکستان میں آمد پر خوبصورت محفلوں کا اہتمام کیا ۔ ہندوستانی سفارت خانے میں بھی قہقہوں نے بارش کی ۔ وہاں ہندوستانی کاؤنسل جنرل پارتھا سارتھی نے معزز مہمان کا تعارف کرایا ۔ پارتا سارتھی صاحب کی پیشانی کشادہ اور دمکتی ہوئی ہے ۔ تخیل پھولوں سے لدا ہوا ہے زبان زمین سے پانی کھینچ کر ابلاغ کے پھول کھلاتی ہے ۔ محبت کے رشتے کی استواری میں زبان کی حیثیت مسلم ہے ۔ پارتھا سارتھی صاحب جس وقت یہاں آئے تھے وہ اردو زبان سے نابلد تھے ۔ لیکن اگر جذبہ صادق ہو تو کوئی کام مشکل نہیں ہوتا ۔ آج وہ صاحب طرز، نقاد اور فلسفی سید محمد تقی اور ممتاز شاعر رئیس امروہوی سے ہم کلام ہیں ۔ تحریری تقریر کا لہجہ خوب تھا ۔ "شانتی جی محبت کا سندیسہ موسیقی کی زبان میں لے کر آئی ہیں ۔ موسیقی کا کوئی رنگ و روپ نہیں ۔ وہ تو محبت کے مدہم راز کی طرح دل میں گھر کرتی ہے " ہمیں اس فن کے ذریعے پیار کے رشتوں کو بڑھانا . . . . . . " اور ان کے فن کے سوز سے محبت کے نئے دیپ جلانا ہیں . . . " ہال تالیوں سے گونج رہا تھا ۔ شانتی جی کی کٹیلی اور چمکیلی آنکھیں بیداری کا پیغام تھیں ۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر تالیوں کا جواب دے رہی تھیں ۔ کلاسیکی موسیقی پر میں نے مختصر سی تقریر کی . . . .

کلاسیکی موسیقی کو پروان چڑھانے میں مسلمانوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے ۔ سلطان حسین شرقی جن کے دادا جونا خاں جنہوں نے شرقی خاندان کی بنیاد رکھی وہ خیال کے موجد تھے ۔ حضرت امیر خسرو نے راگ ایمن منگلہ اور راگ بہار ایجاد کیا ۔ مردنگ کو کاٹ کر طبلہ بنایا ۔ طبل ایران میں پہلے سے موجود تھا ۔ امیر خسرو نے اسے modify کیا ۔ ستار کے علاوہ سارنگی بھی انہیں کی ایجاد ہے ۔ قوالی ، قول قلبانہ یہ بھی انہیں کی مہر ثبت ہے ۔ غزل کا رواج بھی حضرت امیر خسرو کا مرہون منت ہے ۔ محمد شاہ رنگیلے جن کا نام محمد شاہ تھا میاں کی ملہار کی بندش انہیں سے منسوب ہے ۔ ان کے عہد میں ادارنگ سوارنگ پیدا ہوئے جنہوں نے خیال کی گائیکی

کو جسے اورنگ زیب رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے نزدیک دفنا دیا تھا۔ اسے انہوں نے پھر زندہ و تابندہ کیا۔ واجد علی شاہ والی اودھ نے ٹھمری کی اختراع کی۔ انہوں نے پوربی لوک گیت اور خیال کے تال میل سے ایک صنف ایجاد کی اور اس کا نام ٹھمری رکھا۔ "اختر پیا" کی ٹھمریاں زبان زد خاص و عام ہیں۔ "پیا بن ناہیں آوت چین" اسے حیدر جان نے اپنے مخصوص انداز میں مزیت اور بھاؤ بتا کر گایا تھا۔ یہ بندش اس وقت بھی موسیقار گاتے ہیں۔ آصف الدولہ کے زمانے میں میاں شوری کا چرچا ہوا۔ بادشاہ نے سرپرستی کی۔ ٹپہ پنجاب میں رائج تھا استاد شوری نے خیال اور ٹپے کو ملا کر اس کا نام ہی "ٹپہ" رکھ دیا۔ مسلمانوں نے موسیقی کے میدان میں میاں تان سین، خالصاحب برجو، استاد ڈھونڈھو، استاد فیاض خاں، بڑے غلام علی خاں، استاد بابا عنایت، استاد عبدالکریم خاں، استاد ولایت حسین خان، استاد احمد علیخاں جیسے گوہر بے بہا پیدا کئے جو تہذیب کا جھومر، مسلمانوں کے ذہن کی لو اور انسانیت کا افتخار ہیں تاریخی حالات کی بنا پر مسلمانوں نے موسیقی کو علم کے طور پر تسلیم نہیں کیا نیتجہ یہ نکلا کہ ہمارے بہت بڑے فنکار علم موسیقی سے تقریباً نا واقف ہیں گو کہ یہ ہمارا حسین ترین خزینہ اور امانت ہے جس کی حفاظت کرنا اور "خوب تر" کی منزل کی طرف لے جانا حکومت کا فریضہ اولین ہے۔

شانتی صرف فنکار ہی نہیں بلکہ علم موسیقی سے بھی گہری واقفیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں موسیقی کو بطور علم کے تسلیم کیا گیا ہے۔ ٹھمری اور غزل کی دنیا میں بیگم اختر کا نام حسین منارہ ہے۔ گلے میں تپی لگنا لوں تو عیب ہے لیکن بیگم اختر کے گلے میں وہ ہزاروں حسن بن گیا۔ شانتی بیگم اختر کی شاگرد ہیں۔ بیگم صاحبہ کا فن اپنی انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ سفارت خانے میں روشن دماغ بیدار مغز حضرات جمع تھے۔ محترم پیار علی الانا، محترم عمرالہی مایہ ناز شاعر حکیم ناصر۔ حضور احمد شاہ، صفدر برلاس، بریگیڈیر صدیقی، عطیہ شفیق

مایہ ناز شخصیت نفیس میاں ، جنرل احسان الحق غرضیکہ محفل رشک گلستاں تھی ۔ غزل کے بعد ٹھمریوں کا دور شروع ہوا ۔ ٹھمری خیال کی مختصر شکل ہے ۔ اس میں خیال ہی کی طرح استھائی اور انترے کو ادا کیا جاتا ہے ۔ خیال میں سُروں کا پھیلاؤ زیادہ ہوتا ہے اور ہر طرح کی تان استعمال ہوتی ہے ۔ ٹھمری میں حرف بول تان ہوتی ہے ۔ پہلے ٹھمری گاتے وقت بھاؤ اور نرت بتائے جاتے تھے ۔ بڑے غلام علی خاںصاحب نے اس کے اسٹائل میں تبدیلی کی ۔ ٹھمری کی روح تک پہنچنے کے لئے اس کی پوری فضا سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے ۔ مجمع کی تحسین آفریں ہمنوائی کا حق ادا کر رہی تھی ۔ طبلے کی ٹھوکریں مچل مچل کر عطر بیزی کر رہی تھیں ۔ سارنگی کی تانیں دلوں کو چھو رہی تھیں ۔ سفارت خانہ بہار ہی بہار تھا ۔

دوسرے دن موسیقی کی محفل مرحوم سعید ہارون صاحب کے گھر پہ تھی ۔ ہال کی سجاوٹ ، محفل کی ترنگ ، کھانے کا پر تکلف اہتمام قابلِ دید تھا ۔ حمید ہارون اور حسین ہارون دونوں علم و فضل سے آراستہ ہونے کے علاوہ کلاسیکی موسیقی پہ دسترس رکھتے ہیں ۔ تہذیب پہ دری اس خاندان میں چاندی کے ورق کی طرح ملی ہوئی ہے ۔ محفل کا آغاز فیض صاحب کی غزل سے ہوا ۔ جی کھول کر داد ملی ۔ میر کی غزل "دل کی بات کہی نہیں جاتی" راگ کیدارے میں شروع ہوئی ۔ کیدارا بلاول ٹھاٹھ کا راگ ہے ۔ سُروں کا پھیلاؤ اور تانوں کے استعمال نے غزل کو "گلرگ" کا سبزہ زار بنا دیا ۔ ٹھمری کے بولوں کا بناؤ جھاڑ اور فانوس کھلا رہا تھا دل کے تاروں میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا ۔ موم بتیاں اب جھلا اٹھی تھیں ۔ بھیرویں دھیمے دھیمے سب کومل سروں کے ساتھ دل پہ اپنا نقش جما رہی تھی ، قدم خراماں بڑھ رہے تھے لیلیٰ ہارون ، پروین ہارون ہلکے اور میٹھے لبوں کے ساتھ مہمانوں کو رخصت کر رہی تھیں ۔

تیسرے دن محفل صدر الدین ہشوانی کے یہاں تھی جو یوں کہنے کو تو ممتاز صنعتکار ہیں لیکن تحقیقی معنی میں ذی شعور انسان ہیں غالب کے پرستار ہیں ، میر کے رسیا ہیں اور فن کاروں کے درد آشنا ہیں ۔ اس محفل میں عذرا زیدی بھی جن کے آواز کے حسن پہ جوش صاحب نے "روشن آرا" کا خطاب دیا تھا ۔ مسحور تھیں پوری محفل سر دھن رہی تھی ۔ داغ غالب حسرت

کی غزلوں نے ذہنوں کو لوٹ لیا تھا۔ بلوریں ذوق سماعت ہر بول پہ پھول نچھاور کر رہا تھا۔ ٹھمری اور دادرے کے کٹیلے بول تپتی زمین پہ بارش کی پہلی پھوار کی طرح گر رہے تھے . . . . جوہر شناسوں کی تعریف سن کر غالبؔ شانتی کہہ رہی تھیں "ہر فن کی نمود خونِ جگر سے ہوتی ہے" ہم خونِ جگر دے کر کانٹوں میں پھول بن، تاریکی میں چاندنی، منجمد فضا میں رنگوں کی معطر وادی کھلاتے ہیں . . . کلاسیکی موسیقی پختگی ذہن کی علامت اور کردار کی تطہیر کا نام ہے . . . .

محبت کی جو بھاری زنجیریں آپ نے ہمیں پہنائی ہیں ہم اسے کبھی کاٹ نہ سکیں گے۔ ہر چہرہ دمک رہا تھا ہر چہرہ مسکرا رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کتنا اچھا ہوتا آج کل اور برسوں کی محفلوں میں وہ بھی ہوتے جو کیچڑ میں اس طرح پڑے ہیں جیسے میلے پانی میں آبدار موتی جن کے متعلق یہ فیصلہ صادر کر دیا گیا ہے کہ ان کا ذوق صرف "لاری لپا" ہی سنتا ہے۔ حالانکہ کسی بھی شخص کا جمالیاتی ذوق بنا بنایا نہیں ہوتا۔ اس کا تاریخی ارتقا ہوتا ہے۔ حالات کی تبدیلی سے جمالیاتی ذوق بھی بدلتا ہے "لاری لپا" سنوانا عمومی ذوق کی تسکین ہے لیکن شانتی ہیرانند تک ان کے جمالیاتی ذوق کو پہنچانا ان کے ذوق کی تربیت ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا فن کے قدر دان اور فنکاروں کے رسیا شوائی اور ہارون، آغا حسن عابدی، اور پیارعلی الانا مٹھی بھر لوگوں کے ذوق کی سیرابی کے ساتھ ہر پیاسے کے لئے سبیل لگائیں۔ حضرت امیر خسرو کے نام پہ موسیقی کے اسکول اور کالج کھلیں۔ ہر موڑ پہ معطر وادی مہکے اور ہر گھر کے صحن میں راگنی کی چاندنی چھٹکے۔ ہر جانب موسیقی کی یاقوتی، قرمزی، سرمئی اور بنفشی بیلیں کھلیں ادھر سے سلامت علیخاں، مہدی حسن، اقبال بانو نور جہاں اور فریدہ خانم جائیں ادھر سے گنگو بائی ہنگل، روی شنکر اور ولایت حسین خاں صاحب اور امجد علی خاں صاحب آئیں اور محبت کا ایسا تاج محل تعمیر ہو جس پہ کبھی کوئی شب خوں نہ مار سکے۔

ہندوستان کے مایۂ ناز نقاد شاعر ڈرامہ نگار سید محمد مہدی
پاک ہندو دوستی کی انجمن کے استقبالیہ میں

ہر سطح پر بہاروں کے قافلے اترے نغمہ وادب کے جام

چھلکاتے ہوئے اترے یہ کہتے ہوئے آئے کہ یاد رکھیئے " دہکتے ہوئے عارض و خسارے سو

محبت ماہ وسال کے چھینٹے سرد کر دیتے ہیں۔ لیکن حسن سے عقیدت کی آگ تا حیات

لو دیتی ہے۔ تیرگی نے ہر عہد میں حسن پہ پابندگی کو روا رکھا ہے۔ جلتے ہوئے حکمنامے صادر

کیئے، توڑے دیگر قوتِ احساس کو سلب کیا، جرائت اظہار پر گرم سلاخوں کے شامیانے

تانے . . . . پھر جب عشق کی لے تیز ہوئی تو راہ میں کانٹے

بچھائے، گنگا کی کوکھ میں زہر گھولا، کوثر و تسنیم کو خطرے، میں مبتلا کیا۔ گل بداماں

جسم میں سر نگیں بچھائیں۔ فسوں بار ہونٹوں کو لہولہان کیا۔ ہجر کا درد پھیلتا چلا گیا۔"

سیاہی سرمایہ کی تقدیر ہے۔ دست قدرت میں

سونا چاندی رکھنے کے لیے گلعذاران چمن نیلام کا بکاؤ مال ہیں۔ یہی وجہ تھی زندگی

کا گلشن تیغ یار لٹا۔ مامتا کے شجر کٹے، غرور سرنگوں ہوا، غنچے آنسوؤں میں تر ہوئے،

شفق رنگ بوٹے مقتل بنے . . . لیکن تابہ کے

ہجر کا درد مٹا، وصل کا چہرہ تمتما اٹھا۔ جنگاری کی لوئیں چمکنے

لگیں۔ نگار وطن کے آتشیں رخسار میں پیار کی بجلی کوندنے لگی۔ کوہکن نے تیشے لئے میدانِ

وفا میں آگئے۔ جوئے شیر بہنے لگی۔ قافلہ نو بہار میں ممتاز ادیب و نقاد ڈاکٹر محمد حسن،

ڈاکٹر قمر رئیس، سید محمد مہدی، شارب رودولوی ہماری زمین پر اترے۔ سحر نے قدم چومے۔

ادھر ہند کی دھرتی پہ مایۂ ناز شاعر حمایت علی، عبید اللہ علیم، جمیل الدین عالی، محسن احسان

نے نئے راگ چھیڑے . . . . یادوں کی کہکشاں پھیلی۔ تشنگی بڑھی اور

بڑھی . . . .

پاک سرزمین کا سیاسی ماتھا پھر جگمگا اٹھا، مشترکہ کمیشن نے قیام

امن کی تجاویز پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ آقائے پوپیا کے فرزند بلند اقبال مرتضیٰ اور مایۂ ناز صحافی مشاہد حسین نے

صحافیوں کی علم افروز محفل سجائی۔ زمین نے کرنوں کا سنہری لباس پہنا۔ سندھ پاک انجمن کوششوں سے دقت طلب دینے کی سختیاں نرم ہوئیں۔ مجھے ہوئے دلوں کے کنول کھل اٹھے۔

ایوان ادب میں بھی چراغاں ہوا۔ زمین کی ہتھیلی پر گلستاں کھلا۔ چہرہ "تاباں" لئے سندھ کے ادیب آگئے۔ سوکھی دوب لہلہا اٹھی۔ زنگ خوردہ رشتوں کے پہیوں میں تیل پڑا۔ ادب کی سونی جگت پیہ جھوم کر گھٹا آئی۔ سادات امروہہ کے سبطین صادقین نے مسکراتے ہوئے آگے "بڑھ کر جام مینا اٹھالیا" "پاک سندھ دوستی کی انجمن" نے ہر طرح ساتھ دیا۔

مشاعرہ کا اسٹیج سج گیا۔ اسپیکر اسمبلی محترم حسین ہارون نے صدارت کی کرسی سنبھالی شعراء کی گلنار فکر نے مور پنکھ پھیلا دیئے۔ رئیس امروہوی شان الحق حقی، قتیل شفائی، اقبال عظیم، ضمیر جعفری، حمیرا رحمان، پروین فنا، سید عشرت آفرین، نگار صہبائی، صہبا اختر، پیرزادہ قاسم، یونس شرر، انجم اعظمی اور نقاش کاظمی نے اپنے کلام بلاغت نظام سے بے حسی کے جسم میں تیر ونشتر پیوست کئے۔ آزادی کے لئے گیت گائے۔ رات کے بطن سے رنگ شفق کی نوید دی۔ گلرنگ چہروں نے فضا میں خوشبو بکھیر دی۔

اب پیرزادہ قاسم، حمایت علی شاعر، محسن احسان، کشور ناہید، افضل صدیقی، انعام درانی، سعید رضا سعید، جن کی نظر وسیع اور منزل آشنا ہے داد وتحسین وصول کر رہے تھے۔ تالیوں کی گونج میں مایہ ناز عوامی شاعر حبیب جالب نے خوش رنگ گلاب کھلائے اس کا ہر مصرعہ تیرگی کو للکارتا، ستون دار سے گذرتا اور راہ میں چراغاں کر رہا تھا۔ اس کی شاعری اپنے عہد کی بصیرت کو سموئے ہوئے ہے۔ کہا جاتا ہے وہ لمحاتی شاعر ہے۔ سچ کے لمحہ کا شاعر، لمحہ جو ہار گیا اور لہولہان ہے۔ لمحہ

ہندوستان کے مایہ ناز کاونسل جنرل شری منی شنکر ائیر انجمن کی ایک محفل سے خطاب کر رہے ہیں

جو جیت گیا گل بداماں ہے ۔ محبتوں کے سامنے اس کا عزم بول رہا تھا ۔

"میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صورت"

دوسرے دن مشاعرہ امریکن سینیٹر کے سامنے کی کوٹھی میں تھا ۔ ماحول خوبصورت تھا ۔ روشن ذہن چہرے جگ مگ کر رہے تھے ۔ بیگم گل جی ، بیگم اکرام اللہ جنرل احسان الحق ، ڈاکٹر سرور سب آگے ہی نظر آ رہے تھے ۔ شام کے ہاتھ میں جام چھلک رہے تھے ۔ ممتاز و مایہ ناز ادیب پروفیسر احمد علی کے وجود سے فضا مہک رہی تھی . . . .

مشاعرہ کا باقاعدہ آغاز ہوا ۔ سابق کاؤنسل جنرل منی شنکر نے تعارفی تقریر کی ۔ فضا گلاب و بیلے سے لدی ہوئی تھی ۔ چاندی کے تاروں سے گندھی ہوئی جس وقت منی شنکر ایر یہاں آئے تھے وہ اجنبی تھے ۔ لیکن آج چودھویں کے چاند کی روشنی بن کر فضا پہ چھائے ہوئے تھے ۔ منی شنکر ایر ادارہ ، انجمن اور تحریک ہیں ۔ سراپا محبت ، خوشبو اور سحر ہیں ۔ منی نے تقریر ہمیشہ اردو زبان میں کی ۔ یہ ان کی کوشش رشتے کی استواری کی جانب خوبصورت قدم بھی ہے اور اردو زبان کی تازگی ، دلبری ، اور عوامی ہونے کی دلیل بھی ۔ یہ وہ زبان ہے جس نے ہند کی چھاتی سے دودھ پیا لیکن سوتیلی ماں کا برتاؤ پایا ۔ دھوپ اس کا مقدر رہی . . . . . . پاکستان میں آبرو بچانے کے لئے آئی بھٹکی ہوئی رہرو سمجھ کر ٹھکرائی گئی . . . . لیکن "تسلیم" کی خو کبھی نہ گئی ۔ اوپر والوں کو تو انگریزی زبان ہی بھائی ہے ۔ اپنی ادائیں باقی رکھنا جو ٹھہرا . . . . . .

لیکن حلقہ مشتاق میں یہاں اور وہاں دونوں جگہ اردو کی پذیرائی ہوئی ۔ اس کی ذات دلوں کے جوڑنے کے لیے آج بھی مومیائی ہے ۔ ممتاز ادیب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو کے حوالے سے تقریر کر رہے تھے ۔

کنور مہندر سنگھ بیدی کی من موہنی اور قندیل صفت ذات جیسے کا پرتو لئے گویا تھی ۔ ان کا ہر شعر گل بداماں تھا ۔ وہ کروڑوں نا تراشیدہ آرزؤں کو

چندن ہار پہنا رہے تھے۔ "مشاعرہ ہو اور جوش صاحب نہ ہوں۔ چاند چھپ جائے اور رات باقی رہ جائے۔ ۔ ۔ ۔ آج کی رات ہمارا تمہارا پیر مغاں ہمیں بہت یاد آ رہا ہے۔ اس لئے یہ دو شعر اس کی نذر کر کے رخصت ہوتا ہوں۔

وہ کج کلاہِ محفل یاراں نہیں رہا　　جانِ چمن وہ روح بہاراں نہیں رہا

پیر مغانِ بادہ گساراں نہیں رہا　　وہ شہر یارِ شہر نگاراں نہیں رہا

یوں اٹھ گیا کہ بزم میں اب زندگی نہیں

ہم دل جلا رہے ہیں مگر روشنی نہیں

نوجوان شاعر ندا فاضلی نے خوب رنگ جمایا۔ ان کا ہر شعر استبداد کو للکارتا۔ تعمیم کے زخم پہ مرہم رکھتا۔ اور گلبدنوں پر گہر بار تھا

ع　اوروں جیسے ہو کر بھی ہم باعزت ہیں بستی میں

کچھ لوگوں کا سیدھا پن ہے کچھ اپنی عیاری ہے۔

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں

کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

رئیس رامپوری کا ہر شعر چمن در آغوش تھا۔ جی بھر کے داد پائی۔

ان کو مرا وہ بزم میں چھپ چھپ کے دیکھنا

اور یہ بھی دیکھنا کہ کوئی دیکھتا نہ ہو

ہر اک سے پوچھتا بھی ہوں انکا پتہ مگر

دل یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی کو پتہ نہ ہو

ڈاکٹر شہر یار باشعور ادیب ہیں۔ وہ سبب و نتیجے کے تعلق کو تجریدی شکل میں نہیں بلکہ سائنسی انداز میں ہر آن بدلتے ہوئے حالات کو جانچتے اور تولتے ہیں۔

ہم خوش ہیں ہمیں دھوپ وراثت میں ملی ہے
اجداد کہیں پیڑ بھی کچھ بو گئے ہوتے

مایہ ناز شاعر اختر الایمان نے سلیس نرم و ملائم انداز میں کلام سنایا ہر شعر قدرت خیال اور رعنائی حسن بیان لئے تھا ۔ ان کی آواز اور پڑھنے کا طریقہ مہکی ہوئی رت کی طرح تھا . . . . مجمع نے نگاہوں سے پھول برسائے ۔

ڈاکٹر بشیر بدر غزل کے شاعر ہیں ۔ خیال کی تازگی اسلوب میں خوشبو کی طرح پیوست ہے ۔

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کر دے
میں تمام تارے اٹھا اٹھا کے حسین لوگوں میں بانٹ دوں
کبھی ایک رات وہ آسماں کا نظام دے مرے ہاتھ میں
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

ممتاز شاعرہ نور جہاں ثروت نغمہ ریز تھیں ۔ ان کی پیشانی کشادہ ، چہرہ شہابی اور جسم بھرا ہوا ہے جو ان کی خود اعتمادی کو ظاہر کرتا ہے ۔ ان کی فکر اور اسلوب کی شادابی یوں گلابی لنڈھا رہی تھی ۔

ایک جذبہ کہ نہیں جس کا کوئی نام مگر
مجھ کو جینے کے لئے کتنے بہانے دے گا ۔

لیکن اعظمی اسٹیج پر کیا آئے گویا دلبستاں کھل گیا ،، چہرے پر سرخیوں نے نرت کیا ۔ ہر لب غزل سرا ہوا ۔ بلوریں ذوق سماعت ہمہ تن گوش ہوا ۔،، واجد علی شاہ کی زمین میں جہاں شیعہ سنی کل شیر و شکر تھے آج نفرت کے بیج بوئے اور کاٹے جا رہے تھے

پاک ہند دوستی کی انجمن کی جانب سے برصغیر کے ممتاز و مایہ ناز شاعر کیفی اعظمی کے اعزاز میں دیئے جانے والے استقبالیہ میں دائیں جانب محترم خورشید علی خاں اور بائیں جانب ممتاز شاعر و ادیب افتخار عارف اور دیگر ساتھیوں کا گروپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شاعر کے ذہن پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

اذاں میں بہتے تھے آنسو یہاں لہو تو نہیں
یہ کوئی اور جگہ ہوگی لکھنؤ تو نہیں

یہاں تو چلتی ہیں چھریاں زبان سے پہلے
یہ میر انیس کی آتش کی گفتگو تو نہیں

کیفی کے ذہن کے پوروں سے تخلیق کی گنگا بہہ رہی تھی۔ دکھلوتا، عورت، زندگی، ایک سلسلہ لامتناہی تھا۔ لگاتار گلباری ہو رہی تھی۔ کیفی کی محبوبہ صفت بیوی موتی شرمائے ہوئے انداز میں کیفی پر نگاہوں سے پھول برسا رہی تھی۔ عہد آفریں نظم "ابن مریم" مجمع کو مسحور کر چکی تھی۔ جھرنوں کے مدھر راگ سے فضا گونج رہی تھی۔

جاؤ وہ دیت نام کے جنگل اس کے مصلوب شہر زخمی گاؤں
جنکو انجیل پڑھنے والوں نے روند ڈالا ہے پھونک ڈالا ہے
جانے کب سے پکارتے ہیں تمہیں
جاؤ اک بار پھر ہمارے لئے
تمکو چڑھنا پڑے گا سولی پر

کیفی کا ہر شعر نرم رو ندی کی طرح سینوں میں جگہ بنا رہا تھا۔ وہ شعلہ بھی تھا شبنم بھی۔ سیاہی کے لئے موت اور غنچوں کے لیے نوید سحر۔ فنی بالیدگی اور پختگی فکر اسی شاعر کو نصیب ہوتی ہے جو فلسفۂ تغیر سے واقف ہو۔

آج کی محفل کے صدر علی سردار جعفری تھے۔ ذی شعور حضرات انہیں سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سردار آزادی کے سپاہی بھی ہیں اور ملکوں ملکوں کی آزادی کے ہمنوا بھی۔ وہ سماج کے عکاس نہیں بلکہ ناقد ہیں۔ انقلاب کے باشعور نقیب ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے وہ جام چھلکا رہے تھے۔

پاک ہند دوستی کی انجمن کی جانب سے بھارت سے آئے ہوئے مایۂ ناز شاعر و ادیب، نقاد، علی سردار جعفری اور ممتاز ڈرامہ نگار
شاعر محمد مہدی کے اعزاز میں استقبالیہ زیر صدارت ممتاز و مایۂ ناز ادیب احمد ندیم قاسمی اور دیگر شرکاء۔۔۔

اور خراج وصول کر رہے تھے ۔

تیغ منصف ہو جہاں دار و رسن ہوں شاہد
بے گناہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا
جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شور سلاسل کے سوا

لوگ اصرار کر رہے تھے علی سردار نظموں کی گلاب باڑی لگا رہے تھے ،، ہاتھوں کا ترانہ ،، "یہ زندگی ہے "،، حسیں تر " "ذرد عشق ،، " نومبر میرا گہوارہ ،، "تیرے پیار کے نام" ان کے ذہن کے پوروں سے تخلیق کا دریا بہہ رہا تھا ۔ سینے سیراب ہو رہے تھے تشنگی پھر بھی باقی تھی ۔

سامنے گل رنگ ذہن سونا بدن نوجوان مسکرا مسکرا کر گلباری کر رہے تھے ۔

محبت اگر شدت اختیار کرلے تو زبان مختصر ہو جاتی ہے ۔ صرف آنکھیں بولتی ہیں ۔ جو کہہ رہی تھیں مہمان فنکار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ہمارا چہرہ نہیں پہچانتے ۔ لیکن ہمیں تم سے گہری ذہنی رفاقت ہے ۔ ہم لہو سے گلشن سینچتے ہیں ۔ تم اس میں گل کھلاتے ہو ۔ ہم معمار ہیں تم تاج محل ہو ۔ ہم چمن آرا ہیں تم سراپا چمن ہو ۔ ہم میدانی درخت ہیں تم پھولوں سے لدی ہوئی شاخ ہو ۔ تمہارا سرمایۂ فن ہمارا ہتھیار ہے ۔ جو شوکت شاہانہ کو ٹھوکر لگاتا اور غنچوں کی جبیں پر تاج رکھ دیتا ہے ۔

" میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ،، اعلیٰ ادب کو پرکھنے کا یہی میزان سر دور میں رہا ہے ۔ لیکن ہمارے تمہارے درمیان " گویا ،، کا لفظ اب باقی نہیں تم نے ہماری روح میں جھانک کر ہمارے نغمے گائے ہیں ۔ تمہاری نفرت بیزار اور محبت افروز فکر ہماری سب سے بڑی امانت ہے ۔ اس کی ہم حفاظت کریں گے ۔ اس طرح کہ مشعلوں کا ... اب ہمارے تمہارے درمیان سے نہیں گذرنے پائے گا ۔

پاک ہند دوستی کی انجمن کے ارکان کہہ رہے تھے . . . . .

مہمان فنکارو نا آسودہ تمناؤں ، تپتے ہوئے ہونٹوں اور جھلسی ہوئی آرزوؤں کا پیامِ محبت قبول کرو ۔

گل بداماں فنکار ہماری زمین پر خوشبو بکھیر رہے تھے۔ ان میں غلام ربانی تاباں ، جگن ناتھ آزاد اور صالحہ عابد حسین شامل تھے ۔ جو کہہ رہے تھے اس میں شک نہیں کہ حرص و ہوس نے دونوں جانب میٹھے بول کاٹے ، آنکھوں کے کٹورے خالی کیے زنجیروں کے جنگل میں جگمگاتے بدنوں سے جوئے خوں بہائی ۔ خون بھر پینے کے لئے نفرت کے دیوتی نے دار کی راہ دکھائی ۔ لیکن "بساطِ رقصِ بسیط" ہوتی گئی نغموں کی حرارت سیاہ خانوں کو چاٹنے لگی ۔ لوسوں کو نئی مہک ، ہونٹوں کو نیا طرزِ سخن ملتا رہا ۔ صدائے تیشہ ، کبھی "شملہ معاہدہ" کی شکل میں کامراں نکلا کبھی 'دہلی معاہدے' کی صورت میں جلوہ گر ہوا ۔

ان فکر انگیز معاہدوں میں سرفراز درختوں کا لہو چھلک رہا تھا ۔ ۔
منتظر راستے کھلے ، چاند سورج کے کنول کھلے ۔ پھولوں کی راہ گذر کھلی ۔ "چشمِ تماشہ"، "دا ہوئی"، "وکثرتِ نظارہ" نے سمجھایا کہ جڑوں کے رشتے سنگینوں سے نہیں بولوں کے کٹاؤ سے جڑتے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ نہ صرف سیاسی بلکہ فوجی مسائل بھی افہام و تفہیم اور احترامِ آدمیت کے جذبے سے حل ہوتے ہیں ۔ باہمی اعتماد کے شاداں جھونکے اسلحے کی دوڑ میں نہیں بلکہ محفلِ یاراں میں خیال کی خوشبو بکھیرنے سے ملتے ہیں تیسرے یہ کہ وردی پر خرچ کم کر کے بھوک و افلاس کے شعلے سرد کر کے ہر غنچے کے افق پر تعلیم کا تاج باندھنے سے حاصل ہوتا ہے ۔ چوتھے یہ کہ سنگینوں کے سائے میں ماں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے ۔ بچے کی مسکراہٹ آنسو بن کر بہہ جاتی ہے ۔ لیکن امن سے درمیکدہ وا ہوتا ہے ۔

پاک ہند دوستی کی انجمن کی جانب سے دیئے جانے والے ایک استقبالیے میں شری
گرجا شنکر باجپئی، مسز باجپئی، پروجیکٹ ڈائرکٹر سید کاظم امام سے محوِ گفتگو ہیں

پاک ہند انجمن کی جانب سے دیئے گئے عشائیہ میں ہندوستانی کاؤنسل جنرل شری آفتاب سیٹھ
مسز آفتاب سیٹھ ممتاز سیاسی لیڈر لفیس صدیقی۔ ممتاز سیاسی رہنما عابد زبیری ، انجمن کے نئے
سکریٹری جنرل اختر فیروز اور ممتاز طالب علم رہنما اظہر عباس . . . . .

پاک ہند دوستی کی انجمن کی جانب سے دیئے گئے، استقبالیہ میں نادرہ میاں ورلڈ رپورٹ کے مالک ممتاز صحافی سعید نقوی بائیں جانب
ہندوستانی کاؤنسلر شری جی ایل شرما۔ اختر فیروز۔ مسز میجر زیدی، ممتاز صحافی سلطان احمد، ایڈیٹر ''امن'' ممتاز صحافی افضل صدیقی

پاک وہند سے تعلقات کی استواری میں دونوں ممالک

کے عوام کے علاوہ یہاں ہندوستانی سفیر باجپئی صاحب کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان کا تعلق یوپی سے ہے۔ اردو نفیس بولتے ہیں۔ انتہائی ذہین اور خوش مزاج ہیں۔ کے ڈی شرما سراپا خلوص اور محبت ہیں۔ پاکستان میں محبت کا باغ کھلانے کے لئے بے چین۔ ہندوستان کے سفیر مسٹر سنگھ اسی محبت کی کاشت کو لے کر ہماری زمین پر آئے ہیں تاکہ بدگمانی کو اعتماد اور نفرت کو محبت کا لباس پہنایا جا سکے۔ کراچی میں کاؤنسل جنرل آفتاب سیٹھ کی ذات نیرنگ بوقلمونی ہے۔ رندانِ باصفات بھی ان کے ساتھ ہیں اور پندار پرستان بھی۔ اپنے موقف سے ہٹے بغیر وہ ہر کس و ناکس کے محبوب اور ان کی خوش کلام بیوی ہر شخص کی دوست بن چکی ہیں۔ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ محبت کے رشتے زمین سے رشتہ قائم کر لینے ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ محترم جی ایل شرما اور آفتاب جی غم کے مزاج داں اور سچے رازداں ہیں۔ انہیں بالائی سطح پر قمقمے جلانے والوں سے ذرا کم ہی سروکار۔ محبت ہے تو ان سے جو شمع فرزاں ہیں جو تاریکی پر یلغار کرتے ہیں۔ محبت کا اجالا زمانے میں پھیلا دیتے ہیں۔ آفتاب سیٹھ، امیتابھ بنرجی انتہائی خلوص و عبادت کی منزل پر آ کر اس اجالے کی کرنوں کو سمیٹ رہے ہیں۔ تاکہ محبت کا نیا آفتاب نکلے۔ اور دونوں جانب ہر انسان کے صحن میں محبت کی کرنوں کا جال بکھر جائے۔

" پاک ہند دوستی کی انجمن کی کاوشوں اور اکیڈمی آف لیٹرز" کے کرتا دھرتا غلام ربانی آگرہ کی کوششوں سے محبت کا کارواں آگے بڑھا۔ غلام ربانی مایہ ناز ادیب و نقاد ہیں۔ ان کی اصلی خوبی ان کا اخلاص ہے۔ انسانوں کا رنگ جلا بدن کچھ بھی ہو وہ تو دوستوں کے دوست ہیں۔ بڑے بذلہ سنج، بڑے منفرد، بڑے محبت ہیں۔

پاک ہند دوستی کی انجمن اور " اکیڈمی آف لیٹرز" کو محنت کا صلہ ملا پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے ادیبوں کی کتابوں کی نمائش ہوئی۔ کتاب جو کرۂ ارض انسانی معجزوں کا عطر ہے۔ کوہکن کا تیشہ ہے۔ جوئے شیر لانے کی تمنا ہے۔ پیکر ستیریں

تراشنے کی جستجو ہے۔ یہ شعلہ رخ کبھی ہوا کے دوش پر اڑتی ہے۔ ارباب وفا سے اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ چاندنی میں کنول کھلاتی ہے شیکسپئر، ملٹن، گوئٹے، بالزاک، ٹالسٹائی، سیلویٹرددا، ناظم حکمت، فردوسی حافظ اور کبیر بنتی ہے۔ کہیں نظیر، غالب، اقبال، فراق، انیس جوش، فیض، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی احمد ندیم قاسمی اور کرشن چندر کے خون جگر کی نمود میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ زندگی کی عکاس ہی نہیں نقاد بھی ہے۔

کتابوں کی اس نمائش میں تمام کتابیں اردو زبان میں تھیں۔ اردو جو فوارے کی طرح فضاؤں میں بلند ہے۔ صاف، شفاف، روشن لیکن زمین سے رشتہ جوڑے ہوئے۔ اس میں سوندھی خوشبو کی مہک ہے۔ یہ لاکھوں نا دیدہ حسرتوں، نارسیدہ امنگوں، جھلسے ہونٹوں اور تپتی نگاہوں کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ یہ کوئے یار بھی ہے کوچۂ دلدار بھی ہے برطانوی سامراج کے خلاف انقلاب کا پرچم بھی ہے، جنگ آزادی کی رضیہ سلطانہ بھی ہے اور جھانسی کی رانی بھی۔ یہ رنگ و نسل مذہب و عقیدہ کو خاطر میں نہیں لاتی۔ اس نے قائداعظم محمد علی جناح، پنڈت جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو کو بھی اعزاز بخشا اور پریم چند، آنند نرائن ملا۔ فراق گورکھپوری، کنور مہندر سنگھ بیدی، گوپی چند نارنگ، جگناتھ آزاد، اور خلیق انجم کو بھی گلے سے لگایا۔ اس نے ہر محاذ پر آزادی، حریت، ترقی اور امن کی جنگ لڑی ہندوستان و پاکستان کے ماتھے پر آزادی کا تاج باندھا۔ اسے غرور و وقار بخشا۔

لیکن عجیب بات ہے کہ دونوں ممالک آزاد ہیں لیکن اردو ابھی تک پابہ زنجیر ہے۔ اسے اس کا حق ابھی تک نہیں ملا۔ اس میں شک نہیں کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ لیکن ٹھٹھری اور سہمی ہوئی۔ غلامی کی خو بو ابھی تک ہماری نس نس میں سرایت ہے۔ ہمارا کاروبار حیات ابھی تک انگریزی ہی کا مرہون منت ہے۔ ”ہندو پانی“ اور ”مسلم پانی“ کی طرح اردو اسکول اور انگریزی اسکول موجود ہیں۔ انگریزی کے بازار میں اردو

زبان بولنے اور لکھنے والے نیلامی مال ہیں۔ اردو داں کی قیمت چار آنے۔

ہندوستان میں ۱۴ قومی زبانوں میں سے ایک قومی زبان اردو بھی ہے۔ لیکن چند علاقوں کو چھوڑ کر تعلیم گاہوں، مدرسوں اور مکتبوں میں یہ دیکھنے کو بھی نہیں ملتی۔ لیکن اوپر کی شاخوں میں چینی پھولوں کی طرح لٹکتی ضرور نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ اخباروں، رسالوں، کتابوں، فلمی گانوں، مشاعروں اور بالائی اکیڈمیز میں زندہ و تابندہ ہے۔ فلسطینیوں کی طرح اس کا اپنا کوئی گھر نہیں، کوئی در نہیں۔ ماں کی چھاتی سے دودھ پی کر اپنے آنگن میں راگ منانے کا اس کے پاس کوئی وسیلہ نہیں۔ بجز نمائش کے۔

ہندوستان و پاکستان میں اردو زبان کی بقا کا مسئلہ صرف لسانی نہیں ہے۔ یہ اعلیٰ تہذیبی روایات اور جگمگاتے کلچر کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ یہ اخلاقی و نظریاتی اقدار کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ اس کا تحفظ نئی فکر کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اردو زبان کے بقا کے سوال میں ترقی اور رجعت، فرقہ پرستی اور انسانیت، طبقاتی برتری اور معاشی مساوات، مطلق العنانی اور جمہوریت کی آزمائش ہے۔

تہذیبی سطح پر ہند کے ادیبوں کی آمد و رفت کا اعلان اور کتابوں کی نمائش پیار کا چھلکتا جام ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ نہ صرف شاعروں اور ادیبوں بلکہ طلبا، اساتذہ، ڈاکٹر، وکلا، صحافی، خطاط، نقاش، سنگتراش اور موسیقار، محنت کشوں کے وفود کا بھی بڑے پیمانے پر دو طرفہ تبادلہ ہو، رسائل و اخبارات کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو۔ تاکہ حقیقی معنوں میں رات ٹوٹے اور صبح کے ہاتھ میں سمیں جام آئے۔ نئے کوہکن نیا تیشہ لے کر نئے پیکر شیریں تراشیں۔ دونوں جانب نگاہ یاریوں چلے جیسے باد بہاری فصل بہاراں کے گلاب کھل اٹھیں۔ دل کی گلیاں پھر کبھی ویران نہ ہوں۔ چاروں طرف پیار ہی پیار ہو، پیار رکھوان بھی ہے پیار خدا بھی ہے۔

پاک ہند دوستی کی انجمن " کی جانب سے مایۂ ناز شاعر مجروح سلطان پوری کے اعزاز
میں دیئے گئے استقبالیہ کا ایک منظر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"پاک ہند دوستی کی انجمن" نے غزل کے تاجدار مجروح سلطان پوری کے اعزاز میں بھی جلسے کا اہتمام کیا، جس میں اردو کے ادیبوں کے علاوہ سندھی کے مایۂ ناز ادیب وفائی صاحب بھی شریک ہوئے۔ وفائی صاحب سندھی ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام سنجیدہ، تعمیری، مدلل اور سائنسی فکر کے نقش ونگار سے مزین ہے۔ وہ غزل کے مزاج آشنا ہیں۔

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے ایک مدت تک غزل چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستی رہی... لیکن کھونٹا اتنا مضبوط تھا کہ ٹس سے مس نہیں ہوا... اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ صنفِ سخن داخلی اور خارجی سطح پر بہت سخت گیر نظامِ ضبط و نظم اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے... غزل کا لہجہ بہت عرصہ تک داخلی سطح پر شکست خوردگی، مایوسی، کا شکار رہا۔ گردوپیش کی دنیا نے مجہول طرزِ فکر کو بڑھا دیا لیکن جب حالات بدلے، معاشی تبدیلیاں رونما ہوئیں، فکر کے سانچے تبدیل ہوئے تو غالب سے آتش، اقبال اور یگانہ نے غزل کے نئے امکانات کی نشاندہی کی... اس میں خوداعتمادی، خودنگری اور خودیقینی کی فضا پیدا کی....

غزل کے سفر میں جو تاریخی اور فنی منزلیں آئیں ترقی پسند تحریک نے اس میں اہم کارنامے انجام دیئے۔ روایت و بغاوت، عقل و خرد، انفرادیت اور اجتماعیت کے پہلو اجاگر کیے، ترسیلِ خیال کے سلسلے میں اسلوب و ہیئت میں تجربے کئے اور غزل کی رنگینی کو بڑھا دیا... فراق، فیض، مجاز، مخدوم، غلام ربانی تاباں، احمد فراز، حمایت علی شاعر اور ناصر کاظمی وغیرہ جیسے لاتعداد شعراء نے غزل کو صرف عزمِ سفر ہی نہیں دیا بلکہ اس کی "پریشاں خیالی" کو فکری و تعمیری ضبط و نظم کا سلیقہ بھی عطا کیا۔

اس سلسلے میں مجروح کا نام سرِفہرست ہے۔ جن کی عصری

" پاک ہند دوستی انجمن " کی جانب سے ممتاز افسانہ نگار عصمت چغتائی کے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ میں
عصمت چغتائی، ممتاز شاعر رئیس امروہوی ممتاز فلسفی۔ عالم و نقاد سید محمد تقی۔ حمید نقوی (ریاض)
"
ممتاز شاعر جان ایلیا، ممتاز ایڈوکیٹ علی امجد، اور طالب علم رہنما اظہر عباس و دیگر شرکاء

حقائق پر گرفت مضبوط۔ پیچ در پیچ تضادات پر نگاہ گہری۔ اور علامتوں کو نئی سمت عطا کرنے کا فن مکمل ہے۔ مجروح نے غزل کی کلاسیکی روایات کو پہلے اپنی ذات میں خوشبو کی طرح بسایا پھر اس میں انقلابی امکانات کا جائزہ لیا۔ اور انہیں حسنِ کامل کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔ یوں مجروح غزل کا نقطۂ عروج بن گئے۔

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

جاؤ تم اپنی بزم کی خاطر ساری لویں شمعوں کی بجھا دو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشنِ چراغاں تھے زیادہ

مجروح کے یہ اشعار کلاسیکی رنگ و آہنگ، جدید طرز فکر اور خوبصورت امیجری کی اچھوتی، اور انوکھی مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ انداز "دبچ کلہی" ان کے یہاں اس لئے ہے کہ مجروح کی فکر پختہ، ذہن مرتب، اور اظہار اچھوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

فن ریاضت اور عقیدہ کی گرمی کے علاوہ زندگی کے شعور، زبان کی مزاج دانی، اظہار کی صلاحیت اور دلوں تک رسائی کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ مجروح کی بصیرت اپنے ذاتی تجربات میں زمانے کے تجربوں کو شامل کر کے ایسا چراغ روشن کرتا ہے "جسے بجھایا" نہیں جا سکتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں حسین عورت کا حسن نہ جانے کتنی تہیں اترنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ۔ ۔ بس چھلکے ہی چھلکے گری تو نام کو نہیں ملتی عصمت چغتائی ہیں تو عورت لیکن بادام کی خالص گری۔ ۔ ۔ سنہری سڈول جسم، ریشم نما کانسی ہونٹ، لانبا قد، گھنگھریالے بال، بڑی بڑی پلکوں سے جھانکتی سوئی بجلی کے ہنڈے

کی طرح روشن آنکھیں، جوڑ بند کھولتی ذہنی چتون ... کوندے کی طرح لپکتی باتیں ... شعاعوں کی لکیر کھنچی ہوئی مسکراہٹ، بارش کی لطیف پھوار کھلاتی ہوئی ہنسی، تو بہ شکن کٹیلے بول، دل والوں کے لئے سائبان، بہنوں کی ہمدرد، بچوں کی دوست، شوہر کی مطیع و نخریلی بیوی، کھانے پکانے میں ماہر، سلائی ادھیڑنے میں مشتاق ... خوبصورتی، سچائی، معصومیت ہنسی، کھیل، گھر سب کی دلداہ، عصمت آپا کی کرشمہ "دامن دل" صفات شخصیت کہانی کے روپ میں، تصویر کی رنگینی، زندگی کے خاکے میں اتر آئی ہے بس پیچھے ہی پیچھے ...

لیکن ان پیچھوں کو چھیننے کی ذرا کسی نے کوشش کی تو عصمت آپا کا متحرک نقاد آشنا حقائق آگاہ قلم برف کی دبیز سلوں نفرت کی سیاہ چٹانوں، جمود کی لاش کو تازیانے لگاتا، جھنجوڑتا، شعلے برساتا، شیشے کو سورج دکھاتا ... نمک پاشی کرتا گذر جاتا ہے اور جب کوئی یہ کہتا ہے کہ رستے ہوئے زخموں کو دکھانا، مصنوعی چہرے کی نقاب نوچنا، زرگری کے ہاتھوں ادھ کھلی مسلی ہوئی کلیوں کو چہرہ دکھانا، فحاشی ہے تو عصمت اپنی نقرئی مسکراہٹ کے ساتھ گذر جاتی ہیں۔

برصغیر کی سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی زندگی نے کتنی کروٹیں بدلیں شعور کی رفتار کتنی تیز کتنی دھیمی ہوئی۔ واقعات نے جست لگائے، حقائق و رومانیت کتنی آنکھ مچولی کھیلے، عصمت آپا کا قلم اس کا صرف عکاس نہیں ناقد بھی ہے۔ مفسر ہی نہیں مجتہد بھی ہے ... زمین کو محبت، حرارت اور گرمی دیکر فصل گل کی آمد کا متمنی بھی ہے ان کے یہاں مواد، ہیئت، اسلوب، خانوں میں بٹا ہوا نہیں ہے، سب آپس میں شیر و شکر ہیں۔ ستار کے سب تار آپس میں ملے ہوئے، یا ایک تار ٹوٹ جائے تا چڑھ جائے تو ساز بے آواز و بے سرا ہو جاتا ہے ... عصمت کا اس پر گہرا یقین ہے عصمت آپا کو ماضی کا بھرپور شعور ہے حال پر مضبوط گرفت مستقبل کے قانون سے آگاہ ہیں، اعلیٰ مقصد، دل نواز سخن، جذبہ کی گرمی، خلوص کی شدت، بلند نگہی، خوبصورت ہنسی، مختلف جہتوں سے مکمل، سب سمیٹ لیجئے۔

عصمت آپا بن جائیں گی . . . . برصغیر کی اسی مایۂ نازہستی قوت گویائی کی امام ، آنسوؤں کے قلزم ذخار کی شناور ، اقلیم افسانہ کی رانی عصمت چغتائی کے اعزاز میں "پاک ہند دوستی"، کی انجمن نے گلستان سجایا ، بُلبل ہزار داستاں گویا ہوئی ۔

موسیقی

موسیقی کسی بھی مہذب قوم کا سرمایۂ افتخار ہوتی ہے۔ موسیقی کی خوبصورتی سے قوم کی بزرگی کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ موسیقی، خصوصیت کے ساتھ کلاسیکی موسیقی انسانوں کے صدیوں کے اجتماعی عمل کا تعطر ہے۔ یہ ذہن انسانی کے کوہ قاف پر بکھری ہوئی صبح ہے۔ تہذیب کے پنگھٹ پر چھلکتی ہوئی گاگر ہے یہ جہل کے ریگزار میں چشمہ آب حیواں، بے رنگی کی فضا میں معطر وادی، تاریکی کے جنگل میں چاندنی کی مسکراہٹ ہے۔

ہمارے کلچر کے ڈانڈے ویدک عہد میں تلاش کئے جائیں یا عہدِ مغلیہ سے اس کا رشتہ جوڑا جائے۔ کلاسیکی موسیقی صرف ہندوؤں کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی بھی خوبصورت میراث ہے، امانت ہے، جس کی ترویج و اشاعت کرنا، دیکھ ریکھ کرنا مہذب معاشرے کا فریضہ اولین ہے ——— موسیقی کے کوچے میں قدم رکھنا مقدس مقام کا طواف ہے۔ اس کی یاد میں سو جانا شبِ قدر کی عبادت ہے۔ اس کی سربلندی کے لئے جہاد کرنا جہادِ اکبر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہذب اقوام نے موسیقی کو عبادت کا درجہ عطا کیا ہے۔

پاکستان آنے کے بعد میں نے استاد قمر حسین اور استاد امراؤ بندو خاں سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ انہی دنوں یہ خیال بھی ہوا کہ کیوں نا موسیقاروں کی ایک انجمن بنائی جائے، جس میں ملک کے تمام نامور فنکاروں کو دعوت دی جائے عوام کی ذہنی تربیت کا اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا طریقہ نہیں، ساتھ ہی ساتھ کلاسیکی موسیقی کی کانفرنسیں بھی بلائی جائیں۔ چنانچہ بیگم کرنل نذیر احمد۔ استاد امراؤ بندو خاں اور استاد حامد حسین خاں صاحب کی سرپرستی میں انجمن کا قیام عمل میں آیا جس کا نام تھا "انجمن شیریں دیان" سکریٹری کے فرائض مجھے سپرد ہوئے۔ انجمن بنانے کے لئے کلاسکی موسیقی سے واقفیت ضروری اور اس کے خدو خال کو سمجھنا لازمی تھا۔ کیونکہ کلاسیکی موسیقی کے مقام کو پانے کے لئے

اس کے نظام کو سمجھنا ضروری ہے ۔ ہر علم کا ادراک انسان کو شروع میں الہامی طور پر ہوتا ہے ۔ لیکن ، الہام، بذات خود کسی نہ کسی تجربے کی بنیاد پر ہوتا ہے ۔ جوں جوں انسان کا شعور ترقی کے مراحل طے کرتا ہے وہ اس علم سے کہ جس کا ادراک اسے ہوا ہے وہ اسے ترقی دیتا رہتا ہے ۔ محققین اس امر پر متفق ہیں کہ موسیقی کی ابتدا بھی اس طرح سے ہوئی ہے۔ مندرجہ ذیل کتب اس بات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہونگی ۔

(1) Music of the Arabs - Welson & Gevert
(2) History of the world music by ceicil gray.
(3) The Music - Amhrsica

انسان نے ابتدائے آفرینش ہی سے اپنے گردوپیش بے شمار چیزوں کو دیکھا لیکن سرسری گذر گیا ان میں پرندوں کی آوازیں بھی تھیں ، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ الہامی طور پر اس نے یہ محسوس کیا کہ ان میں بعض آوازیں کریہہ اور بعض خوش کن ہیں ۔ مثلاً کوئے اور کوئل کی آواز یہ انسان کا پہلا تجربہ تھا ۔ اور یہی نقطہء آغاز تھا اس موسیقی کا کہ جس کو اس نے اپنانے کی خواہش کی تھی ۔ جوں جوں انسان کا جمالیاتی ذوق نکھرتا گیا (جمالیاتی ذوق کا تاریخی طور پر ارتقا ہوا ہے) اس نے تلخ آوازوں کو یکسر مسترد کر دیا صرف ان آوازوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جو خوش کن تھیں ۔ چنانچہ آج بھی ان قوموں کی موسیقی جو ہزارہا سال گذر جانے کے بعد بھی آج عصبی حالت میں موجود ہیں وہ ان جانوروں کی آوازوں ہی کی نقل ہے جو ان کے پسندیدہ جانور تھے ۔ جاپان کے شمال میں ایک جزیرہ ہے جس کا نام ' چانیا ' ہے ۔ یہاں ایک قسم کا ہنس پایا جاتا ہے جس کی آواز کی نقل ہی وہاں کی موسیقی کا سرمایہ ہے ۔ اس طرح وسط آسٹریلیا کی دفتی قوموں کی موسیقی محض کانگرو جانور کی آواز کی نقل ہے ۔ افریقہ کے بعض علاقوں میں ان کے قدیم باشندوں کی موسیقی

میں پرندوں کی نقلیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان میں زیادہ سے زیادہ موسیقی کے تین سُر استعمال ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو کینیا میوزک فیسٹول میں شرکت کا موقع ملا ہے وہ اسے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

موسیقی ارتقاپذیر ہے۔ وہ مختلف آوازوں اور سُروں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دراصل یہ سُر کیا ہے؟ اور مختلف سروں کی آوازیں کس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دوسرے یہ کہ سُر کا تخیل انسان کے ذہن میں کب اور کس طرح پیدا ہوا۔ اس بات کا جواب دیا جاچکا ہے کہ انسان میں سُروں کا ادراک پرندوں کے خوبصورت نغموں کو سن کر ہوا اور رفتہ رفتہ چار مترنم آوازوں میں ایک دوسرے سے امتیاز کرنے پر قادر ہوگیا۔ اور موسیقی کا اسکیل چار سُروں کا ہوگیا۔ چنانچہ پراچین ہندوستان کی موسیقی میں اب بھی ایسے راگ موجود ہیں کہ جس میں تین یا چار سُر لگتے ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ چار سُر بھی راگ کے لئے کم معلوم ہوئے چنانچہ ایک اور سُر دریافت ہوا اور موسیقی کے اسکیل کو پانچ سُروں کا اسکیل بنادیا جسے موسیقی کی مخصوص اصطلاح میں Pantatonic seal کہتے ہیں۔

لیکن انسان کا ارتقاء پذیر ذہن مطمئن نہیں تھا۔ "کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کیلئے" خوش کن سُروں کی تلاش شروع ہوئی علم و فضل کا مرکز یونان مددگار بنا۔

اسکیل میں دو مزید سُروں کا اضافہ کرکے اسے سات سُروں کا اسکیل بنا دیا۔ یہ جسے موسیقی کی اصطلاح میں بلاول کا اسکیل کہا جاتا ہے اور جس کے سات سُر سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا۔ ہیں۔ مختلف قوموں اور زبانوں میں ان سُروں کے نام DOR وغیرہ وغیرہ رکھے گئے ہیں۔ ان سروں کا اضافہ کرنے والا یونان کا مشہور اور مایہ ناز مفکر منتیا غورث تھا۔ اس لئے اس

اسکیل کو آج Pythagorian Seale کہا جاتا ہے۔

آمد و رفت کے ذرائع کی کمی کی وجہ سے نیشا غورث اسکیل بہت مدت تک صرف یونان میں مستعمل رہا۔ لیکن پہلی صدی عیسوی کے اوائل میں عربوں نے جو جہازرانی کے سلسلے میں دنیا بھر کا چکر کاٹتے پھرتے تھے یہ اسکیل یونان سے حاصل کیا خود یورپ والوں کو اس کا علم پہلی صدی عیسوی کے آخر میں عربوں ہی کے ذریعے ہوا۔ اس وقت اسلام نہیں آیا تھا ۶ سو سال کے بعد اسلام آیا) چنانچہ یورپ کی وہ موسیقی جو Gsigariam chants کے نام سے مشہور ہے اس سے پہلے کی موسیقی اہل یورپ نے ضبطِ تحریر میں لاکر محفوظ کرلی ہے یہ اس قوم کی اپنی میراث کی قدر دانی کی ضمانت ہے۔

عربوں کے اسلام قبول کر لینے کے بعد ابتدا ہی میں بعض قبائل عرب سے تجارت کے سلسلے میں ہندوستان آئے اور مغربی ساحل پہ آباد ہوگئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کو اس زمانے میں کوکنی مسلمان کہا جاتا ہے ــــ اور یہ امر یقینی ہے کہ برصغیر میں فیثا غورث اسکیل انہی کے ذریعے پھیلنا شروع ہوا۔ یوں ہمارا رشتہ ہر عنوان ابتدا ہی سے موسیقی سے جڑا ہوا ہے۔ اور سب سے بڑا ہمارا سرمایۂ حیات ہے۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ اس سے قبل اہل ہندو نے سیریا اور بابل کے رہنے والوں اور مصریوں نے اپنی اپنی جگہ موسیقی کے اسکیل کو وسعت دینے کی کوشش کی۔ مصر کے حالیہ تہہ خانوں سے بعض اس قسم کے ساز نکلے ہیں جن پر سات سے زیادہ پردے بندھے ہوئے تھے۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں یہ ساز اپنی اصل حالت میں نہیں رہ سکے۔ اس لئے ان کی آوازوں کے مقامات کا تعین اب قطعی دشوار ہے۔ یہ امر بھی مسلم ہے کہ بابل (سیریا) مصر کی تہذیبوں نے ایک دوسرے پہ اثر ڈالا تھا۔ یہ کہنا بھی

دشوار ہے کہ موسیقی کے اسکیل کو وسعت دینے میں ان میں سے کسی قوم نے پہل کی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں اس قسم کے گر نہ دستیاب ہو گئے ہیں کہ اہل ہند کے اسکیل کو ترقی دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ اسکیل جو ملک کے ایک حصے میں رائج تھا دوسرے حصے میں رائج نہ ہو سکا۔ فیثا غورث اسکیل باقاعدہ طور پر مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہندوستان میں عام ہوا۔ اس طرح موجودہ برصغیر کی موسیقی کا نقطہ آغاز یہیں سے ہوتا ہے جس کے متعلق عام مفکرین کا قول ہے کہ اس کی بنیاد حضرت امیر خسرو کے بابرکت، مقدس اور مطہر ہاتھوں نے رکھی۔ یوں موسیقی مسلمانوں کے لئے منزلہ عبادت کے ہے۔

Pantatonic Seale جب علاؤالدین خلجی نے دیوگری پر قبضہ کیا تو وہاں اس وقت کا مانا ہوا گویا گوپال موجود تھا۔ علاؤالدین نہ صرف نوادرات دہلی ساتھ لایا بلکہ گوپال کو بھی ہمراہ لایا۔ اس نے امیر خسرو کے متعارف کئے ہوئے فیثا غورث اسکیل اور کو ملا کر ایک راگ ایجاد کیا جس کا نام اس نے دیوگری بلادل رکھا۔ حضرت امیر خسرو نے اس راگ کو سن کر گوپال کی ذہانت کو داد دی اور **یہ بتایا کہ علم کسی بھی طرف سے آئے اس کا جی کھول کر استقبال لازمی ہے**۔ دیوگری بلادل کے بول جو آج کل کے گویے گاتے ہیں اور جس کا Notation موجود ہے اس کی انتصائی کی ابتدا ان بولوں سے ہوتی ہے "دن گن دیرے سجنا"

مسلمانوں نے فن موسیقی کی سرپرستی ہر طور کی۔

اہل ہند میں موسیقی ویدوں کے زمانے سے جزو عبادت تھی لیکن انہوں نے مسلمانوں سے موسیقی سیکھنے میں **بخل** سے کام نہیں لیا جس کے نتیجے میں برصغیر کی موسیقی عالم وجود میں آئی جس کے گانے والے پاکستان میں خال خال اور ہندوستان میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ڈاگر برادر ہندوستان میں اور مہر علی پاکستان کا نام روشن کئے ہوئے ہیں۔

سلاطین دہلی موسیقی کے دلدادہ تھے۔ التمش پہلا سلطان تھا جو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خانقاہ میں موسیقی کو آنکھوں سے لگاتا تھا ہندوستانی موسیقی یا ہندوؤں کی موسیقی اس زمانے میں سنگیت رتناکر کی تصنیف سے روشناس ہو چکی تھی۔ رکن الدین فیروز شاہ کے دربار میں مرد اور عورت دونوں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ بقول برنی " ہر گلی میں گویے تھے "، امیر خسرو نے بھی علاؤالدین خلجی کی جو بہت پکا مسلمان تھا موسیقی دانی اور دلچسپی کا تذکرہ " اعجاز خسروی " میں کیا ہے۔ امیر خسرو نے ہندوستانی موسیقی کو چار چاند لگائے۔ ستار، قول قلبانہ، مختلف راگ راگنیاں سب انہیں کی ایجاد ہیں۔ انہوں نے لکھا " **ہندوستانی سنگیت ایسی آگ ہے جو دل و روح کو حیات بخشتی ہے۔**

سلطان حسین شرقی (والئی جونپور) اس نے سترہ راگ ایجاد کیے۔ " خیال " اسی کی ایجاد ہے۔ اس کے علاوہ راگ حسینی کانگڑا بھی اسی کی ایجاد ہے۔ سوری سلاطین کے عہد میں بھی موسیقی نے ترقی کی۔ اس زمانے کا مشہور گویا محمد عادل شاہ سور تھا اور باز بہادر والئی مالوہ اور تان سین اس کے پیرو تھے۔ عادل شاہ قد آدم پکھاوج کو ہاتھوں اور پیروں سے بجاتا تھا۔ باز بہادر رقاصاؤں کے جھنڈ میں گاتا اور ناچتا تھا۔

شاہان مغلیہ کا دور اسلامی تہذیب کا تابندہ باب ہے۔ بابر ہمایوں دونوں نے موسیقی کی سرپرستی کی۔ اکبر کو موسیقی اپنے خاندان سے ورثے میں ملی تھی۔ اس نے موسیقی کے فن کو محبت کی مالائیں پہنائیں۔ اس کے عہد میں دہرپد نے بہت ترقی کی۔ اس عہد کے نامی گویوں تان سین کے علاوہ نائیک بیجو باورا، باز بہادر خان، میرا بائی اور نائک برجو بہت مشہور ہیں۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں فن موسیقی پر ایک علیحدہ باب لکھا ہے۔ موسیقی کو " طلسم کدۂ عرفان " کے نام سے تعبیر کیا ہے اور

ہندوستانی موسیقی کو سات الواب میں اس طرح تقسیم کیا ہے (۱) سر ردیبائے آزادوں کا بیان ۲۔ آہت وہ آواز جو کسی سبب سے پیدا ہو ۳۔ سروح ۴ ر رکھب، ۵ رگاندہارد ۶ ر مدہم، رنکھاد۔ چاند خاں، سورج خاں، شام چو اسی گھرانے کے معرُوف گویے تھے جنہیں اکبر کی سرپرستی حاصل تھی ——— مشہور ہے کہ تان سین کی گائیکی کا چرچا سن کر چاند خاں اور سورج خاں اس کے مقابلے کے لئے دہلی پہنچے۔ تاکہ بادشاہ کے سامنے فن کا مظاہرہ کریں ——— دہلی پہنچ کر ایک کنوئیں کی جگت پر بیٹھ گئے، جہاں کچھ عورتیں پانی بھرنے کے لئے آئی ہوئی تھیں ——— پیاسے تھے اس لئے پانی مانگا ——— ایک عورت کے منہ سے بے ساختہ یہ جملے نکلے "لے دیکھو کیا بے تالہ ڈوبلا ہے۔" یہ سن کر چاند خاں چکرا گئے۔ پانی پی کر دریافت کیا۔ معلوم ہوا یہ تان سین کے گھر کی پنہارن تھی۔ یہ دونوں یہ کہہ کر واپس گئے کہ جس گھر کی پنہاری کی موسیقی دانی کا یہ عالم ہو "وہ شخص موسیقی کی دنیا کا کتنا بڑا دیوتا ہوگا"۔

باپ کی طرح جہانگیر بھی موسیقی داں تھا۔ "اقبال نامۂ جہانگیری" میں اس کے عہد کا حال ملتا ہے۔ شاہ جہاں خالص "اسلامی تہذیب" کا بادشاہ تھا اکبر کی طرح ساز بھی بجاتا اور رقص بھی کرتا تھا ——— تخت نشینی سے پہلے اور بعد کے گیارہ سال تک اورنگ زیب کو رقص و سرود سے والہانہ لگاؤ تھا، اس لئے اس نے خوشحال خاں قلدرنت کو روپیوں میں تلوایا تھا۔ لیکن "علما" کے اثر نے اس سے حسنِ جمالِ ذہن چھین کر چوب تخت اور کندہ ناتراش بنا دیا۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں ادا رنگ سدا رنگ نامی دو عظیم گویے تھے یہ زیادہ تر امیر خسرو کے اختراع کردہ ترانے گاتے تھے۔ دربار میں گویوں نے کسی بات پر طعنہ دیا کہ تم دہرپد کی گائیکی پر گلا ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس پر نعمت خاں سدا رنگ نے جواب دیا کہ چند روز ٹھہر جاؤ تمہیں اور تمہارے ہر پدوں کو کے سیر

رکوا دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے خیال کی گائیکی پر ریاض کیا۔ دربار میں بیٹھ ہوئے فن کا مظاہرہ ہوا۔ داد تحسین ملی۔ وہ دن اور آج کا دن خیال عروج پکڑ گیا اور دھرپد کا چراغ مدہم پڑ گیا (لطف خاں صاحب کی لائبریری)

جس وقت دہلی اجڑی تو لکھنؤ نے شہریاروں کو سینے سے لگایا۔ عہد آصف الدولہ کا زریں باب کھلا، ایک طرف میر و سودا نے زمین کو چار چاند لگائے دوسری طرف پنجاب کی زرخیز زمین کا ایک منچلا خرکار تلاشِ معاش میں لکھنؤ جا پہنچا وہ جس وقت پنجاب کا ٹپہ جو دہاں کی ایک عوامی دھن ہے گاتا تو لوگ مست ہو جاتے تھے یہ بات آصف الدولہ تک پہنچی۔ انہوں نے استاد شوری کو دربار میں بلایا۔ گانا سنا **موتیوں سے منہ بھرا**۔ استاد نے خیال کی گائیکی میں ٹپے کے انداز کی تانیں شامل کر کے ایک نئے انداز کی موسیقی کا سنگِ بنیاد رکھا جسے ٹپے کا انداز کہا جاتا ہے۔ رسولن بائی اور ملکہ پکھراج نے اس صنف کو چار چاند لگائے ــــــ سوز خوانوں نے بھی اس فن کو معراج تک پہنچایا۔

اکبر کی طرح واجد علی شاہ کا عہد "زریں عہد" تھا جسے انگریزوں نے زبردستی قبضہ جمانے کی خاطر "بدترین عہد" گردانا ہے واجد علی شاہ پر لگائے ہوئے الزامات اور گرد و غبار کی تہوں میں اٹا ہوا یہ چہرہ مرزا علی اظہر برلاس کی کتاب "واجد علی شاہ" میں چودھویں کا چاند بن کر نکلتا ہے۔ مرزا صاحب جید عالم ہیں سراپا میں کرشن کنہیا ہیں۔ مزاج کے اعتبار سے شعلہ و شبنم ہیں۔ پیاسوں کو پانی پلانا۔ مضطرب روح کو آسودگی بخشنا ان کا شعار ہے۔ کاظم کے بہنوئی اور میرے کرم فرما ہیں۔ ان کے محبت بھرے کرم و نمک کا گواہ میرا ہر قطرہ خون ہے ــــــ انہوں نے اپنی کتاب میں آہنی استدلال سے ان تمام الزامات کو رد کیا ہے جو واجد علی شاہ پر انگریزوں نے لگائے تھے ــــــ مرزا صاحب نے واجد علی شاہ کی موسیقی دانی پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے

ان کا کہنا ہے کہ واجد علی شاہ نے کلاسیکی موسیقی اور عوامی موسیقی یعنی لوک دھنوں کو ملا کر موسیقی کی ایک دلاویز صنف ٹھمری کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ایک بیان کے مطابق انہوں نے اپنی بیگم کی خوشنودی کے لئے یہ صنف ایجاد کی۔ ہندوستان کی مشہور مغنیہ حیدر جان کی ماں کو ٹھمری گانے کی تعلیم دی۔ جس کے مشہور بول ہیں ۔" پیا بن ناہیں آوت چین "۔ ٹھمری کی رنگینی نے زینت محل کو موہ لیا۔ اندر محل میں بھی موسیقی کی محفلیں سجنے لگیں۔ اودھ کے گھرانوں میں موسیقی کی قدر دانی پیدا کرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

سلطنت اودھ کے خاتمے کے بعد والیانِ رام پور، گوالیار، بنارس، پٹیالہ، اور میر پور سندھ نے کلاسیکی موسیقی کو سینے سے لگایا۔ اس کی سرپرستی کی اور اسے جی بھر کر رواج کیا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مسلمانوں نے برصغیر کی موسیقی کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ موسیقی کے متعلق مسلمانوں میں دو اسکول ہیں ـــــ پہلا اسکول موسیقی کو ناجائز اور حرام قرار دیتا ہے چنانچہ" عبدالرحمٰن بن غنم سے روایت ہے کہ مجھے ابو عامر وابو مالک نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ یقیناً میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے " جو زنا، ریشم، شراب اور باجوں کو حلال سمجھیں گے۔" نیل الاوطار "، صہ ۱۲۳

علامہ شوکانی نے باجوں کے متعلق ارشاد فرمایا

" جن باجوں کو حرام کیا گیا ہے وہ وہی باجے ہیں جو شراب نوشی کے ساتھ پیوست ہیں . . . . لہٰذا جو گانا شراب کے ساتھ شامل ہو اس کے امتناع کا حکم صادر ہوا . . . . . "

اسی طرح سماع و مزامیر کے متعلق بہت سی روایات ہیں جن کو بعض علماء مثلاً ابن حزم، ابن طاہر، ابن ابی الدنیا وغیرہم نے اپنی کتابوں میں یکجا کیا ہے۔ یہی وہ علماء

حضرات ہیں جن کی تنگ نظری، کوتاہ بینی، جہل افروزی، نفرت پرستی نے موسیقی کے راستے میں تعصب کے جھاڑ جھنکاڑ ڈالے، موسیقی کے عالموں پر تین منزلہ عمارت سے کوڑا پھینکا، کیونکہ ملا و قاضی سب حکومت کے پروردہ تھے۔ جنہیں لوگوں کے بلوریں ذوقِ سماعت کو زخمی کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا ـــــــ ان "علما" کے خار دار مزاج نے موسیقی کو نہ صرف گھائل کیا بلکہ اسے علم و سائنس کے درجے تک پہنچنے سے روک دیا۔ گویوں کو "میراثی" کا لقب عطا کرکے مطعون کیا ـــــــ اور یہ روایت بعض "شرفا" میں اب بھی باقی ہے جو موسیقار کو مراثی کہہ کر اپنی شرافت، کو تسکین دیتے ہیں لیکن کھوکھلی ہے ان کی ذہنیت، سطحی ہے ان کا شعور اور بانجھ ہے ان کی تاریخ دانی ـــــــ مراثی لفظ بنا ہے میراث سے۔ چونکہ موسیقار" اپنے گھرانے میں غصب شدہ" توڑے لینے دینے سے تو عاجز تھا۔ اس کی تو بس سب سے خوبصورت میراث موسیقی تھی۔ جسے وہ نسلاً بعد نسلاً وارثت میں چھوڑتا تھا "موسیقی کے گھرانوں" کی بات اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس طرح مراثی کی بھی تاریخ ہے۔

تصوف نظامِ جبر کے خلاف فکری بغاوت تھی وہ حریت فکر کے علمبردار تھے، روشن خیالی کے رسیا تھے ـــــــ تمام اصناف میں صوفیوں نے قاضی، ملا، مفتی اور زاہد کا مذاق اڑایا جو اسٹیٹ مشینری کا کل پرزہ بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے نظامِ فکر میں انسان کو مرکزی حیثیت دی۔ انسانی اخوت اور برادری کا پیغام دیا "بلا تفریق مذہب و ملت تمام انسان ایک ہیں"۔ چنانچہ موسیقی کی راہ سے کانٹے چننے اور اس پر پھولوں کی بارش کرنے میں صوفیاء نے اہم ترین کردار ادا کیا ہے ـــــــ ان حضرات نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ موسیقی جائز ہے۔ سفیان ثوری داؤد ظاہری، کمال الدین رفوی، ذوالنون مصری اور جنید بغدادی نے مختلف احادیث کی روشنی میں موسیقی کی حلت میں اظہارِ خیال کیا۔

کمال الدین اوفوی اپنی کتاب " الامتاع " میں لکھتے ہیں کہ " ظاہریہ ، مالکیہ ، حنبلیہ ، شافیعہ ، میں سے ایک گروہ نے ان تمام احادیث کو خفیف قرار دیا ہے "۔ جو حرمتِ غنا کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ۔ ان روایات کو ائمہ اربعہ ، داؤدِ ظاہری ، اور سفیان ثوری میں سے کسی نے حجت تسلیم نہیں کیا ۔ حالانکہ یہ لوگ مجتہدین کے سرخیل ہیں اور ان کے مذاہب کے بے شمار پیرو موجود ہیں ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی " اخبار الاخبار " میں فرماتے ہیں ۔ " ایک مسلک تو فقہا کا ہے جو غنا اور فرامیر کے سخت منکر ہیں اور اس معاملے میں تعصب اور عناد کا انداز اختیار کرتے ہیں بلکہ اس فعل کو گناہِ کبیرہ اور اس کے جواز کے عقیدے کو کفر زندقہ اور الحاد سمجھتے ہیں ۔ فقہا کا یہ طرزِ عمل زیادتی ہے اور اعتدال و انصاف کے مسلک سے باہر ہے ۔ . . دوسرا مسلک محدثین کا ہے جو کہتے ہیں کہ تحریمِ غنا کے متعلق کوئی صحیح حدیث موجود نہیں جو کچھ ہے وہ خفیف ہے ۔

موسیقی کی حلت میں علامہ سید مرتضیٰ زبیری " شرح احیاء العلوم الدین " میں یہ روایت نقل کرتے ہیں ۔

" ربیع بنتِ معوذ کہتی ہیں کہ جب میری رخصتی ہوئی تو نبی ؐ تشریف لائے ۔ اور اس طرح بیٹھے جس طرح تم میرے سامنے ہو اتنے میں ہماری کچھ باندیوں نے دف پر گا گا کر میرے مقتول آبا ؤ اجداد کا ندبہ کیا ان میں سے ایک نے کہا " ہم میں سے ایک نبی ایسا ہے جو کل کی بات بھی جانتا ہے . . "۔ آپ نے فرمایا اسے چھوڑ دو ۔ وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھی ۔ "

انس بن مالک سے روایت ہے کہ

" رسول خدا ؐ مدینے کی ایک گلی سے گذر رہے تھے دیکھا کہ کچھ لڑکیاں دف بجا کر گا رہی ہیں کہ ہم سب بنی نجار کی لڑکیاں ہیں ۔ . . . خوشا نصیب کہ آج محمد صلعم ہمارے پڑوسی ہیں . . . آپ ؐ نے فرمایا اللہ جانتا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔ "

انہیں روایتوں کے پیشِ نظر امام غزالی نے " احیاء العلوم " میں سماع کے بارے میں

سماع کے بارے میں یہ فتویٰ صادر کیا کہ جو شخص کہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ نبی نے حرام سنا اور حرام سننے سے نہیں روکا تو بالاتفاق کفر کا مرتکب ہوا ،،

علامہ عبدالغنی اپنی کتاب ،، الضیاع الالات فی سماع الالات ،، میں فرماتے ہیں ۔

" اچھی آواز کا مختلف النوع باجوں پر سننے کا مسئلہ ایسا نہیں کہ اسے مطلق حرام قرار دیا جائے . . . . کیا پرندوں کی چہکار سننا بھی حرام ہے یہ بھی غایت درجے کے نغمے نواز ہیں اور انسانی جذبات میں تحریک پیدا کرتے ہیں ۔"

"شیخ جنید بغدادی نے فرمایا کہ" صوفیائے کرام پر تین مواقع پر رحمت باری کا نزول ہوتا ہے اول کھانے کے وقت کیونکہ وہ سخت بھوک کے بغیر کھانا نہیں کھاتے . . . دوسرے مذاکرے کے وقت کیونکہ وہ صدیقین کے مقامات پر بات کرتے ہیں . . . تیسرے سماع کے وقت جب ان پر وجد طاری ہوتا ہے (وجد الہامی چیز ہے یا نہیں ؟) یہ بحث طلب مسئلہ ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ وجدانیت کا تاریخی ارتقا ہوا ہے)۔

موسیقی کی حلت کے بارے میں یہ دلیل بھی دیجاتی ہے کہ موسیقی کا اہم جزو آواز ہے جب کرخت آواز کا سننا حرام نہیں تو موزوں و دلکش آواز کا سننا کیونکر حرام ہو سکتا ہے قرآن پاک میں خدا خود فرماتا ہے " اِنَّ انکرہ الاصوات لصوت الحمیر ،، یعنی بے شک بری سے بری آواز گدھوں کی ہے ۔" یعنی خدا خود کریہہ آواز سے نفرت کرتا ہے ۔ چنانچہ انہی تمام دلائل کی بنا پر صوفیائے کرام نے موسیقی سننا واجب قرار دیا ہے ۔ ذوالنون مصری فرماتے ہیں ،، سماع حق کا وارد ہے یہ دونوں کو حق کے لئے متحرک کرتا ہے جو حق کے لئے وہ حق پرست کے لیے ،، سنے وہ زندیق ہے ۔،،

ابوالحسن دراج فرماتے ہیں ،، سماع مجھے ایک پر رونق میدان میں لے گیا وہاں میں نے ابر رحمت کی گہر باری دیکھی تو وجد میں آگیا ۔ وجد نے مجھے جام صفا پلایا ۔ جس سے میں رضا کے مراتب حاصل کئے ۔،،

عمرو بن عثمان مکی فرماتے ہیں " وجد کی حقیقی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ وہ مومنین و صادقین کی عبادت کے وقت کا لطیف راز ہے ۔"

مختصر یہ کہ علمائے دین نے گو کہ موسیقی کو ناجائز قرار دے دیا تھا لیکن تصوف صوفیائے کرام نے ہر دور اور ہر عہد میں موسیقی کو سماع کے ذریعہ باقی اور جاری رکھا ۔ فنِ موسیقی کے ارتقا اور نشو نما میں عربوں اور ایرانیوں نے بھی قابل قدر کردار ادا کیا ۔ عرب میں ایام جہالت سے لے کر قرون اولیٰ پھر اموی اور عباسی عہد نے سینکڑوں مشہور گویوں کو جنم دیا مثلاً ابن محرز ... ابراہیم موصلی وغیرہ ۔ مخارق اور علویہ راگ کی نئی طرز کے موجد تھے ان دونوں نے فارسی اور عربی راگوں کے امتزاج سے نئے راگ بھی ایجاد کئے ۲۳۳ھ سے ۲۸۹ھ کا زمانہ موسیقی کے عروج کا تھا ... اسی عہد میں فن موسیقی پر عربوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں ۔ تفصیل کے لیے دیکھیں (جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی اکتوبر ۱۹۲۵ء و فہرست کتب خطی باڈلین لائبریری از ہنری جارج فارمر مطبوعہ ۱۸۸۷ء)

چوتھی صدی ہجری میں شہرہ آفاق کتاب " آغانی " جو ۲۱ جلدوں پر مشتمل ہے لکھی گئی جس کے مصنف کا نام ابوالفرج تھا ۔

عربی اور عجمی راگوں کو بارہ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے جنہیں وہ مقامات کہتے ہیں ۔ یہ تقسیم بارہ برجوں کے لحاظ سے کی گئی ہے ۔ ان میں سے ہر ایک راگ یا مقام کو مزید دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے ۔ مختصر یہ کہ گو کہ علمائے دین نے موسیقی کو ناجائز قرار دیا تھا لیکن دوسرے اور اسباب کے علاوہ صوفی حضرات کی کرم فرمائیوں سے یہ فن بڑھتا اور ترقی کرتا رہا ۔

ہندوستان میں جیسا کہ کہا گیا مسلمانوں نے موسیقی کی دنیا میں گراں بہا خدمات انجام دیں ۔ انہوں نے موسیقی کے مزاج کو سمجھنے اور اس کی روح کو پانے کے لئے سنسکرت زبان پڑھی ۔ موسیقی کے عالموں نے بلا تفریق مذہب و ملت زانوئے ادب تہہ کیا ... ہندو مسلم اتحاد کی تابندہ نشانی موسیقی پر نادر کتب تخلیق کیں ... " غیاث الامنیا " اس کا

بین ثبوت ہے اس مخطوطے کا کچھ حصہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ "لہجات سکندری"، "لب علم الانس" "راگ درپن" اور پارجاتک"، جو عہد اورنگ زیب میں مرزا روشن کے ہاتھوں ترتیب پائی ۔ اس کے علاوہ ٹھاکر نواب علی کی کتاب "معارف النغمات"، ہے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کتاب کے سلسلے میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ یہ کتاب دراصل مرزا ہادی رسوا نے لکھی ۔ بہرحال "معارف النغمات موسیقی کی دنیا میں اہم ترین شاہکار ہے جس سے انکار ممکن نہیں ۔

کلاسیکی موسیقی کے میدان میں مسلمانوں کی نادر اور بے بہا خدمات اور عظیم تاریخی ورثے کے پیش نظر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہاں کا ہر کوچہ" اوراق مصور" بنتا ۔ ہر ذرہ ہیرا بنتا ہر گلی گلستان بنتی ۔ ۔ ۔ موسیقی سے لگاوٹ کے نتیجے میں نظر میں بیداری، مزاج میں توازن اور فکر میں بالیدگی پیدا کرنے کی ہر سطح پر کوشش کی جاتی ۔ اسکول کالج اور یونیورسٹی میں کلاسیکی موسیقی کو نصاب تعلیم کا حصہ بنایا جاتا ۔ حضرت امیر خسرو کا چہرہ جگمگا اٹھتا ۔ مسلمان کا ماتھا دمک اٹھتا ۔ "بھاتکنڈے یونیورسٹی" کی طرح ہماری زمین پر کلاسیکی موسیقی کی جڑیں پھیلیں شاخیں آسمان سے ٹکراتیں ۔ فضا میں تار جھنجھناتے ۔ "استادان فن کو موتیوں میں تولا جاتا کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی "انگلیاں فگار" ہیں ۔ لیکن ان کا ایک ایک قطرۂ خون موسیقی کے ٹمٹماتے دیئے کو روشنی بخشتے ہیں ۔ مسلمانوں کے عظیم ورثے کے پیش نظر ضرورت اس امر کی ہے کہ نئی نسل کو "فلمی موسیقی" "زمبا سمبا"، اور بریک ڈانس" کی لعنت سے چھٹکارا دلایا جائے "امریکی" "ہشش"، کو رگ رگ میں اترنے سے روکا جائے ۔ آج مسلمانوں کی زمین کٹ رہی ہے آسمان کٹ رہا ہے، شاخیں کٹ رہی ہیں ۔ پیلے ذہن پیلے پھول اگا رہے ہیں ۔ اعلیٰ اسلامی اخلاق کا سرمایہ زد پر ہے ۔

دنیا کے عظیم المرتبت فنکاروں موزارٹ اور بتہوون

اور چائیکوسکی کی مرتب کردہ

synphonies کو سننے کے بعد یہ احساس اور بھی بڑھ جاتا ہے
کاش ہمارے یہاں علمی اعتبار سے کلاسیکی موسیقی کی جانب توجہ کی جاتی "سُر" کو لکھنے کے فن کو رواج دیا جاتا ۔ اسٹاف نوٹیشن کا طریقہ اپنایا گیا ہوتا تو ہم بھی آج آفتاب موسیقی استاد فیاض خاں ، استاد بڑے غلام علی خاں صاحب ، استاد چھوٹے غلام علی خاں صاحب اور ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم کے فن کو اقوام عالم کے سامنے پیش کر کے سرخرو ہوتے . . . .
لیکن آج ہماری موسیقی کی عظیم روایات اور عظیم تاریخی سرمایہ صرف اتنا ہی کہہ رہا ہے

" دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے

ادب

تہذیب و تمدن کے جتنے مظاہر ہیں اس میں ادب کو اولیت حاصل ہے۔ یوں تو تمام فنونِ لطیفہ ہیں۔ پابندیوں کو توڑنے، روایت پرستی سے چھٹکارا پانے اور آزادی کی لے کو آگے بڑھانے کا جذبہ کار فرما ہے۔ یہ جذبہ اس شدتِ احساس کا عکاس ہے جو غلامی اور محکومیت کی بنا پہ فنکار کے شعور پہ ہتھوڑے برساتا ہے۔ فن کے ذریعے وہ محدود سے لامحدود میں آتا ہے اور زندگی کے دامن کو خوشیوں کے موتیوں سے پُر کر دینا چاہتا ہے۔ یہ انداز نظر فکر اور فارم دونوں ہی میں نظر آتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مصور، خطاط، نقاش سنگتراش، بت تراش کسی حد تک اپنے مادی قیود میں رہنے پر مجبور ہیں۔

لیکن ادیب جس کی نظر بیدار، مشاہدہ بصیر، حرکت و ارتقا کے عمل سے آگاہ، سیاسی و معاشی رجحانات سے روشناس ہے وہ لفظ و معنی کے ذریعے نہ صرف زمین پر اپنی انگلیوں کے پوروں سے تخلیق کی چاندنی بکھیرتا ہے بلکہ وہ ہوا کے دوش پہ سوار ہو کر وقت کی گرفت سے آزاد چٹانوں، ریگستانوں، سمندر، اور دریا کو پار کر کے تمام دنیا سے اپنا رشتہ قائم کرتا ہے۔ ہر ذی شعور ادیب اپنے عہد کے مذاق کا عکاس بھی ہوتا ہے اور ناقد بھی۔ وہ اندھیرے اور اجالے کو دکھاتا بھی ہے۔ اور اس کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے عہد کا 'رسول' بھی ہوتا ہے اور 'مفسر' بھی۔

غلامی، شہنشاہیت اور سرمایہ داری نے ہر دور میں انسانوں کو زنجیریں پہنائیں۔ محبت اور محنت کا خون کیا۔ دکھ درد کی آگ بھڑکائی۔ باشعور فنکاروں نے ہر سطح پر ناآسودگی کے اسباب و علل معلوم کرنے کی سعی کی۔ اپنے ادراک سے ان بنیادی حقیقتوں کا پتہ لگانے کی کوشش کی جس نے بہار کو خزاں کا رنگ دیدیا۔ دنیا کے ادیبوں کی طرح برصغیر میں بھی ظلم و سیاہی کے خلاف لڑنے کی روایت موجود ہے۔ کبیر و تلسی، بھٹائی و وارث شاہ، غالب اور میر، خوشحال خاں خٹک اور بابا بلھے شاہ نے انسان کو آسودگی بخشنے کی خاطر اپنے عہد کی کھڑکی کی ہوئیں،

رکاوٹوں کو پار کرنے کی کوشش کیں ۔ ناقابل فہم ، مبہم اور الجھی ہوئی تفسیروں کو سلجھانے اور اپنی اور اپنے عہد کی مجبوریوں کے اندر رہتے ہوئے روشنی اور محبت کی جوت جگائی ، کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری انداز میں جمہور سے رشتہ کسی نہ کسی شکل میں جڑا رہا ۔

اردو ادب میں روایت سے بغاوت کی جڑیں بہت گہری ہیں ۔ ادیبوں نے اپنے اپنے عہد میں طبقاتی روابط اور فکری ماحول کے مطابق انسانی ہمدردی میں گیت گائے ۔ مجبوریوں اور کلفتوں پر آنسو بہائے ۔ کبھی ملا و زاہد کو نشانہ بنایا ، کبھی شہنشاہوں کو اور کبھی تقدیر کو ۔ مسائل کا حل کیا ہے ؟ غربت و افلاس سے نکلنے اور معاشی استحصال سے نجات کا راستہ کیا ہے ؟ اس پر ان کی نگاہ نہیں تھی اور نہ ہی اپنے عہد کی مجبوریوں کے تحت ہو سکتی تھی ۔

اردو ادب نے جیسا کہ ہر شخص واقف ہے جاگیردارانہ عہد میں پرورش پائی ۔ شہنشاہیت ، مطلق العنانی اور تقدیر پرستی مستقل قدر کی شکل لئے ان کے حصے میں آئی ۔ دوسری طرف صوفیانہ اثرات بھی ان کے مزاج میں شامل ہوئے جنہوں نے رکاوٹوں کو راستے سے ہٹایا اور رندمشربی کی ریت ڈالی ۔ لا محدود سے ملنے کی تمنا بھی کی اور خدا کا وجود بھی اپنی ذات میں تلاش کیا ۔ غرضیکہ انہوں نے ہزار رنگ سے زندگی کو دیکھا اور امیر و غریب کی تفریق ظاہری طریقے پر ختم کر کے نظر کو مساوات کا حسن عطا کیا ۔ استحصال کی بنیاد تلاش کرنا ان کے بس میں نہیں تھا

غدر ہندوستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ معاشی ، سیاسی اور تہذیبی سطح پر زندگی نے رخ بدلا ، غلامی کی جکڑ مضبوط ہوئی ۔ غلامی نے آزادی کی راہ دکھائی زنجیریں توڑنے اور غیر ملکی حکومت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی لے تیز سے تیز تر ہونا شروع ہوئی تہذیبی اور سیاسی میدان میں قدامت پسند والے نے اعتدال کی راہ دیکھی ۔ اعتدال پسند والے نے انقلاب کے دروازے کھٹکھٹانا شروع کیا ۔

ادب کا رشتہ ہمیشہ سے سماج اور جمہور سے جڑا ہوا ہے لیکن غدر کے واقعہ کے بعد اس کی نظر زیادہ صاف ہوئی ۔ شعوری طور پر ادب کا رشتہ سماج سے جڑا ۔ سرسید ، حالی ، شبلی

وقار الملک، نذیر احمد نے اس فکر کو چار چاند لگائے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا انقلابات سے ہمکنار رہی۔ قدیم نظام حیات کے پرخچے اڑ گئے ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے مزدور کے ماتھے پہ تاج باندھا۔ معاشی و سیاسی سطح پر استحصالی نظام کی جگہ محنت کشوں نے امامت کے فرائض انجام دینے شروع کیے۔ بین الاقوامی انقلابات نے ہندوستان کی فکر و نظر کی دنیا میں سوچ کی نئی طرح ڈالی، پرانے پیمانوں کی جگہ غور و فکر کے نئے سانچے وضع ہوئے۔ آزادی کی لہریں اونچی ہوئیں۔ ساحل سے ٹکرائیں اور بالآخر گوہرِ مقصود پالیا۔ آزادی کے گوہرِ مقصود کو پانے میں اگر ایک طرف سیاسی رہنماؤں نے قربانیاں دیں تو دوسری طرف ادیبوں نے بھی اپنا خونِ جگر صرف کر کے چمن میں پھول کھلائے۔ وطن کی محبت، زبان کی محبت ان کا مسلک، اور مطمح نظر رہا۔ کبھی سیاسی رہنماؤں کے قدم سے قدم ملا کر چلے کبھی سیاسی سمجھوتہ بازی کو نشانہ بناتے چلے، انسانیت کا درد لے کر چلے، ایک نئے نظامِ حیات کی لگن لے کر چلے، ایسی دنیا تعمیر کرنیکا خواب لے کر چلے جہاں ذرہ ذرہ آفتاب میں ڈھل جائے۔ معاشی و سیاسی و تہذیبی مقدمے حل ہوں اور ہر انسان خوشی سے اپنے آنگن میں سرمست ہو جائے۔ رجعت پسند قوتیں سیاست و تہذیب کے میدان میں ہمیشہ صف آرا ہیں۔ بھیس بدل بدل کر آزادی کی مشعل کو گل کرنے کے لئے کوشاں رہیں۔ لیکن ادیب نسل و رنگ سے بالاتر آزادی کے گیت گاتے، خونِ دل دیتے، ظلم و ستم سہتے اعلیٰ مقصدِ حیات کی قندیلیں جلائے آگے بڑھتے رہے۔ رنگِ شب کاٹتے، سحر سے ہمکلام ہوتے رہے۔

جدید عہد میں اردو ادب کے معماروں کی فہرست اتنی ہی ہے جتنی سمندر کی لہروں کی۔ علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، احتشام حسین، آل احمد سرور، سید محمد تقی، نیاز فتح پوری، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، سجاد ظہیر مصطفےٰ زیدی، سید آل رضا، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، منٹو، عصمت چغتائی، وامق جونپوری، مجاز، ڈاکٹر سید عبداللہ، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، مشتاق یوسفی

ساحر لدھیانوی، غلام رسول مہر، ڈاکٹر علیم، پروفیسر احمد علی، کرشن چندر، حمایت علی شاعر
جذبی، صفدر میر، عبداللہ ملک ادا جعفری۔ ضمیر جعفری۔ خدیجہ مستور، شان الحق حقی۔ رضیہ سجاد ظہیر
اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر رشید جہاں، مخدوم، عصمت چغتائی، احمد فراز، ظ انصاری،
قتیل شفائی، صوفی تبسم، آنند نرائن ملا، محسن احسان، حبیب جالب، ڈاکٹر محمد حسن،
ڈاکٹر عابد حسین، فرمان فتح پوری، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مشفق خواجہ، جمیل جالبی
محمد مہدی، احمد عباس، خالد علیگ، ناصر کاظمی، کشور ناہید، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض
تابش دہلوی، محشر بدایونی، سجاد باقر، وزیر آغا نے آزادی کا ترانہ گایا۔

پاکستان بننے کے بعد اس ملک کے ادیبوں نے نئے معاشرے
کی تشکیل، اس کے قومی تشخص کی تلاش، ہجرت اور بے سر و سامانی جیسے مسائل پر قلم اٹھایا
ایک نیا معاشرہ جہاں ہر آنگن میں چاندنی چھٹکے اور ہر بچے کے چہرے پر ہنسی ہو۔ اس کی آس
اور لگن لگائی، لیکن جلد ہی "اجالا داغدار" ہو گیا۔ جیلیں ہتھکڑیاں، بیڑیاں مجبوریاں،
احتساب ناحق کا دور شروع ہوا۔ سنگینوں نے استقبال کیا۔ ارمان آرزو امیدوں کے
جنازے نکلے اپنا ہی ملک اپنی ہی فوج نے فتح کر لیا۔ مارشل لا نافذ ہوا۔ ادیب کی بھی
کشتی بھنور میں پھنس گئی۔ ہر فن آزادی کا طالب ہے۔ ادیب نے بھی آزادی فکر و نظر کا
خواب دیکھا تھا۔ مگر وہ اب کہاں، سخت گیری میں بھی ان کا قلم چلتا رہا، ہتھیار بن کر تیر گی
پر برستا رہا۔

جنگ سرمایہ دارانہ نظام کی تقدیر ہے۔ جنگ ہوئی، جنگ میں
سب کچھ ایندھن بنا۔ دلہن کا آنچل جلا، بچوں کی خوشی جلی، محبوبہ کے آنگن میں چتا جلی
ادیبوں کے ذہنوں میں الاؤ جلا، جنگی ترانے، قومی نظموں کا لاوا ابل پڑا۔ زمین کو سلگتے
دیکھ کر ہر شاعر ہراساں تھا۔ ہر قلم احتجاج کر رہا تھا۔ امن کا طالب تھا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا جب آزادی کی لے تیز ہوئی۔ تنقید،

شاعری ، ناول ہر صنف سخن میں ادیبوں نے ویرانی دل کا حال بیان کیا ۔ زمانے کو آئینہ دکھایا ۔ مستقبل کی نبض پہ ہاتھ رکھا ۔ خواب جو شرمندہ تعبیر نہیں ہوئے خواب جنھیں "کرب وبلا" نے حوصلہ دیا ۔ خواب جو ہنوز راہ دیکھ رہے ہیں ۔ ہر عنوان ادیب شریک دوراں رہے ۔ تنظیمیں بھی بنیں ۔ تنظیمیں ٹوٹیں بھی ۔ ادب کی تحریک چلی بھی ۔ ادب کی تحریک کچلی بھی گئی ۔ شاعر پابہ جولاں ہوا ، "شاعر دربدر پھرے مارا" کی منزل پہ آیا ۔ کبھی اس کی حب الوطنی پہ شک کیا گیا ۔ کبھی وہ "نظریہ" کی زد پہ آیا ۔ لیکن اس کی 'کلاہ' ، اس طرح آج بھی کج ہے جیسے کل تھی

برصغیر کے یہ وہ ادیب فنکار ہیں جو فلسفہ تغیر پہ یقین رکھتے ہیں ۔ طبقاتی کشمکش کے رموز سے واقف ہیں ۔ طبقاتی کشمکش کے ذریعے عدم طبقاتی سماج بنانا چاہتے ہیں ۔ ایسا سماج جہاں انسان کی تخریب نہیں تعمیر ہو ۔ عقل و سائنس انسان کو کھنڈرات نہیں گلستاں میں تبدیل کردیں ۔ جہاں امن و آزادی ہو ۔ کیونکہ یہ دونوں آپس میں عاشق و معشوق کی طرح جڑے ہیں ۔ آزادی کے بغیر امن اور امن کے بغیر آزادی بے معنی و ہیچ ہے ۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جو امن کے دوست اور امن کے دشمنوں میں تمیز کرتے ہوئے اجارہ داروں کے خلاف صف آرا ہیں ۔ یہ تخریب کو تعمیر ، رنج کو خوشی ، تیرگی کو روشنی ، زوال کو ترقی اور الفاف دشمنی کو الفاف دوستی میں بدلنے کے لیے قلم کو ہتھیار بناتی ہیں آہنی عمل سے 'آگ لگانے والوں' پہ وار کرتی ہیں اور آگ بجھانے والوں کی جانبدار ہونے پہ فخر کرتی ہیں ۔

ادبی انجمنوں سے میرا رشتہ بھی بندھا ہوا تھا میں نے ادب کی دنیا میں تھوڑا بہت کام کیا ۔ اونچائی ، مضبوطی ، پاکیزگی کے ایسے نشان جن کے نقش پہ چلنا 'پارسائی' کی علامت ہے ان عظیم ہستیوں کو دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ۔ یہ سب کچھ میری زندگی کا حسین ترین اور خوبصورت ترین سرمایہ ہے ۔

مایۂ ناز نقاد، ادیب، صحافی حضرت علامہ نیاز فتحپوری

حضرت علامہ نیاز فتح پوری

نیاز صاحب ایسی ہی ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے حیات آفریں قلم سے تیرگی کی دھجیاں بکھیریں اور ادب کو حقیقت کا آئینہ خانہ بنایا۔ اس عظیم ادیب سے ملنے کی سعادت مجھے بھی نصیب ہوئی۔ میرے گھر کی فضا نے مجھے دو نعمتیں بخشں ہر سفتے محفل رامش و رنگ کی ـ اور ہر پندرہ واڑے یاراتیں علم و دانش کی۔ جس کے تاجدار علامہ نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی اور محترم راس مسعود ہوتے تھے۔

ابھی خرد کے انکھوے بھی نہیں پھوٹے تھے کہ اس چارپائی پر جس پر میرے والد سیٹ کر پڑھا کرتے۔ میں دراز ہو جاتی۔ اور پر کتابوں کی رضائی بنا کر اوڑھ لیتی۔ جس میں "نگار" "من ویزداں" اور نہ جانے کون کون سی کتابیں ہوتیں . . . . وہیں پڑی رہتی۔ ابا کی ڈانٹ پڑتی تو کتابوں کو ہٹا کر اعلان کر دیتی۔ "ارے واہ ہم تو پڑھ رہے ہیں . . . . وہی نیاز احمد کو . . . . . اور کیا . . . . ڈانٹ جاری رہتی" لاحول ولا قوۃ معلوم نہیں کس قسم کی لڑکی ہے صاحب یہ . . . . یہ کیا ٹریننگ دی ہے تم نے . . . . شوق دیکھئے انگلی سے امی سے مخاطب ہو کر کہتے . . . . سب کتابوں کے نشانات کی ترتیب یقیناً بدل دی ہو گی . . . . . . بہر حال امی کے بیچ بچاؤ سے معاملہ رفع دفع ہو جاتا . . . .

وقت گذرتا گیا۔ علم سے رشتہ قائم رہا۔ نیاز صاحب کی تحریروں نے ذہن کے دریچے کھولے۔ ان سے ملنے کا شوق پیدا ہوا لیکن دیکھا پھر بھی نہیں۔ اجازت ہی نہیں ملی کبھی ابا کے دوستوں کے درمیان بیٹھنے کی یا دیکھنے کی۔

امی کے انتقال کے بعد ہمارا گھر بھی اجڑا اور دل بھی۔ آنسوؤں کا غسل کر کے بھوپال سے لکھنؤ گئی۔ اپنی بہن عطیہ نقوی جو فارسی کی بہت ہی پایۂ کی ادیبہ ہیں ان کے گھر پر ہمارے رہنے کا بندوبست ہوا۔ ایک دن اپنے بہنوئی (غلام حسین نقوی ایڈوکیٹ) کے کمرے میں میں اور باجی جان بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص بھاری بھرکم جسم۔ گہری

سوچتی ہوئی آنکھیں، گندمی رنگت، درمیانہ قد، چھڑی ہاتھ میں لئے ہنستے قہقہہ لگاتے ابا کے ساتھ داخل ہوئے . . . . یہ میری بیٹی عالیہ ہے . . . . . . یہ ہے عطیہ . . . . ابا نے تعارف کرایا ، اچھا اچھا . . . تو معلوم ہوا . . . یہی وہ "دو فاضلہ" ہیں . . . جن کا ذکر عسکری تم کیا کرتے ہو . . . . کیا مضائقہ ہے ہنستے ہوئے اگر ابھی کے ابھی امتحان ہو جائے . . . . . اچھا تو اس شعر کے معنی بتاؤ

رفتم بہ مسجد کہ ببینم جمال دوست دستش بر وکشید دعا را بہانہ ساز

دستش بد دش بغر بنہاد از راہ کرم مارا چو دید لغزش پا را بہانہ ساز

نیاز صاحب کے سوال سے میری نبضیں چھوٹ گیئں ۔ میں سر سے پیر تک پسینے میں ڈوب گئی ۔ چہرہ زرد پڑ گیا ۔ ہراساں ہو گئی میں سب کا منہ تکنے لگی ۔ نیاز صاحب کو ہماری حالتِ زار پر ترس آ گیا . . . . . ہماری طرف سے منہ پھیر کر ابا کی طرف یوں مخاطب ہوئے . . . . تو عسکری میں کہہ رہا تھا کہ "یارانِ طریقت" کے چنگل سے کون بچا ہے جسے "کافر"، "ملحد" اور "بے دین" انہوں نے نہ ٹھہرایا ہو ۔ سقراط سے لے کر والیئر تک ۔ اور سر سید سے آزاد تک ، غالب سے اقبال" تک اور "مجھ بندہ ناچیز" تک سب کو کافروں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے ۔ بھئی وجہ کیا ہے . . . . وجہ یہ ہے نیاز کہ معاشرے کی ناقص اقدار کے خلاف آواز اٹھانا کفر ہے ۔ یہ سب براہ راست عقلی اجتہاد کے دشمن ہیں ۔ تو جناب میرا الحاد عین الایمان ہے ۔ نازم بکفر خود کہ بہ ایمان ۔ برابر است ۔ نیاز صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا ۔

نیاز صاحب کا سر جملہ طنز و مزاح لئے ہوئے تھا ۔ وہ "مولوں" کے لطائف بیان کر رہے تھے . . . . گھر قہقہوں سے گونج رہا تھا . . . . . .

نہ جانے کیا بات ہے کہ ہمارے بہت سے ادیب و شاعر اس شئے لطیف سے یکسر خالی ہیں وہ "مخطوطات" سے سن پیدائش تو معلوم کر لیتے ہیں ۔ گورکنی سے تاریخی شخصیت کی ہڈیاں

تو بر آمد کر دیتے ہیں۔ لیکن ہنس نہیں سکتے . . . .

شاید اس لئے کہ ہنسی تضاد سے پیدا ہوتی ہے ۔ قول و فعل کے تضاد سے حرکت و جمود کے تضاد سے ۔ آزادی بخشنے، اور جرأت اظہار چھیننے ، اسلام کا مقدس نام لینے اور اس کی بیخ کنی کرنے عہدہ دینے اور قوت احساس سلب کرنے کے تضاد سے جو شخص معاشرے کے بنیادی محرکات سے واقف نہیں وہ شائستہ ہنسی نہیں ہنس سکتا۔

لکھنؤ کے قیام کے دوران نیاز صاحب کا نیاز صرف ایک ہی مرتبہ حاصل ہوا ۔ پھر میرے حالات بدلے ، زمین بدلی ، آسمان بدلا میں ناظم آباد میں ایک چھوٹے سے گھر میں آ گئی . . . . میرے والد مجھ سے ملنے ہندوستان سے آئے ہوئے تھے ۔ ایک دن ہم لوگ لان پہ بیٹھے ہوئے تھے ۔ باتوں میں مصروف تھے ... دیکھا کہ نیاز صاحب ، سیمابی انداز میں ہنستے مسکراتے سامنے چلے آرہے ہیں۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی برس پڑے ۔ واہ جناب خوب اور اطلاع بھی نہیں کی ، بھئی عسکری تم آگئے ، خوب ، خیر بہت ہی اچھا ہوا آتو گئے . . . . اور یہ عالیہ تمہاری بیٹی "فاصلہ" نہیں نالائق ہے ۔ یعنی میرے گھر سے بہت نزدیک رہتی ہے ۔ پتہ بھی نہیں دیا . . . . خیر اب خوب محفلیں ہوا کریں گی ۔

سر شام نیاز صاحب ہمارے گھر پہ تشریف لاتے ۔ ان کے علاوہ جوش صاحب ، آل رضا صاحب ، منور عباس صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر زین العباد نقوی غرضیکہ خلقت جمع ہوتی علمی و ادبی مباحث چھڑتے ، قصے اور کہانیاں بیان ہوتیں ۔ ایک مرتبہ ہمارے گھر کے سب افراد جمع تھے ۔ ابا کے تمام دوست احباب موجود تھے ۔ کچھ خواتین بھی تھیں۔ جن میں ثریا بیرسٹر ، گل رعنا زیدی ، نشاط کاظمی اور خانم رقیہ بہت نمایاں ہیں ۔ انہوں نے نیاز صاحب پہ سوالات کی بوچھار کر دی اور نیاز صاحب نے بھی مزے لے کر کہنا شروع کیا ۔ تم نے مذہب کے بارے میں سوال کیا ہے تو کبھی مذہب کا مطالعہ میں نے صرف اس نقطہ

نگاہ سے کیا کہ اخلاق کی عملی تعلیم کے لحاظ سے اس کا درجہ کیا ہے جو بہت بلند ہے۔ مجھے مولویوں نے قطعی متنفر کر دیا۔ کیونکہ اخلاق ان کے پاس چھو کر نہیں گیا۔ . . . . . . کھرادی ہوئی لکڑی ہیں۔ ہاتھ چھیل کر رکھ دیتے ہیں . . . . اب رہا شعر و سخن کا مسئلہ . . . . تو یہ ذوق بارہ تیرہ سال کی عمر ہی میں پیدا ہو گیا تھا . . . . . پھر دو آتشہ ہو گیا . . . . لکھنؤ کی وجہ سے جس کی فضا نشہ بخش، سرزمین عشق خیز، گلیاں رومان آفریں تھیں . . . . مرکز چوک تھا۔ جہاں حسن کا طوفان اٹھا کرتا تھا۔ جینے سے زیادہ مرنے کو جی چاہتا تھا . . .

اس وقت لکھنؤ کی بلند معاشرتی زندگی کا جز و لازم یہ تھا کہ روسا رقص و غنا کی محافل میں شریک ہوں . . . . . اور ڈیرہ دار طوائفوں کی صحبت میں علم مجلسی سیکھیں۔ چودہرائن کا گھرانہ شائستگی کا مرکز تھا۔ چودہرن کی حیثیت معلم کی ہوتی . . . گفتگو۔ انداز نشست برخاست۔ شعر خوانی، لطائف گوئی . . . . موسیقی کا صحیح ذوق . . . . . زبان کا صحیح استعمال سکھایا جاتا اور پھر درود و سلام ہوتا . . . . . . اچھا ہاں تو اس وقت کی یاد میں ایک غزل کہی تھی سنو۔

آپ تھے میں تھا شب ماہ تھی تنہائی سے تھی
ہائے وہ وقت کہ دشوار تھا جینا مجھ کو
اف ری مجبوریٔ الفت، یہ خبر کس کو تھی
تم کو چاہوں گا تو جینا بھی پڑے گا مجھ کو

خرم کا زمانہ تھا۔ نیاز صاحب روزانہ آتے سوز و سلام کی محفلیں ہوتیں جوش صاحب، نسیم امروہوی، امید فاضلی کے مراثی اکثر زیر بحث آتے۔ ایک دن حسب دستور تشریف لائے۔ آتے ہی ابا سے سوال کیا؟ عالیہ کہاں ہے۔؟ ابا نے

کہا بی بی حیدرآباد سے آئی تھی ۔ اس کے گھر مجلس ہے عالیہ کو بھی ساتھ لے گئی ہے
. . . . . اماں . . . یہ تمہاری بی بی تو اس کو چھوڑتی ہی نہیں . . . عجب مذاق ہے . . .
نیاز صاحب تھوڑی دیر سوچ کر بولے . . . . . یہ سب تمہاری خطا ہے . . . کاظم . .
لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کرتے ارے یہ دونوں آغا خان کے گھوڑے ہیں . . کبھی تھان پر
ملتے ہی نہیں . . . .
اچھا کاظم قلم دوات دو ، پرچہ لکھا ، یہ پھاڑ نہ دینا ند بان ، سمجھ کر . . . . .
عالیہ کو دے دینا ۔ اس میں لکھا تھا ۔

ہیں عالیہ آج کل مجالس کی نقیب
ملتا ہی نہیں پتہ کہیں دور و قریب
کل تک تو مجھے ڈر تھا فقط کاظم کا
لو ہو گئے حسین بھی اب اپنے رقیب

نیاز صاحب کی زندگی منظم و مربوط تھی ۔ ہر لمحہ کا حساب رکھتے ، کھانے پینے
اٹھنے بیٹھنے ، گھومنے پھرنے اور لکھنے پڑھنے کے اوقات مقرر تھے ۔ ان میں تبدیلی ناممکن تھی
لکھنے کے اوقات موسم کے تابع ضرور تھے ۔ گرمی میں چھ گھنٹے کام کرکے قلم رکھ دیتے لیکن سردی میں
دس گھنٹے سے کم کام نہیں کرتے ۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا " نیاز صاحب لگاتار اتنے گھنٹے کام کرتے
کرتے آپ تھک نہیں جاتے ؟ فرمایا ، اگر کام میں لطف آنے لگے تو تھکن کا احساس پیدا نہیں ہوتا
. . . لفظ تھکن محض اضافی چیز ہے . . . طبیعت کی خرابی کے دوران اکثر یہ اشعار
پڑھتے جب کام نہیں کر سکتے تھے ۔ لیکن اس وقت عجب بے کسی کا عالم ہوتا

بیا دِ جوشش تمنائے دیدنم سنگر | چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امید بخم | بہ دیدن تو شنیدم ، شنیدنم بنگر
زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی | بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

روزانہ میں نیاز صاحب کے ہمراہ نیشنل آرکائیوز جاتی کیونکہ ممتاز حسن صاحب نے نیاز صاحب کو "مخطوطات" کا کام سپرد کیا تھا۔ مجھے بھی نیاز صاحب نے کام دے رکھا تھا۔ فرصت کے اوقات میں نیاز صاحب جامی، عرفی، اور کبھی کبھی حافظ بھی پڑھاتے... فردوسی تو تمہارے باپ کے محبوب شاعر ہیں لیکن میں عرفی میں جو زندگی پاتا ہوں وہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں... بہت ہی مزے لے کر عرفی کو پڑھاتے کبھی حافظ کی غزلیں سناتے۔ اپنے دفتر سے دوپہر کو کاظم ہم لوگوں کو لینے آتے اور یوں ہم گھر چلے جاتے۔

اسی دوران عجیب واقعہ ہوا۔ ہمارے مالک مکان نے ہمیں گھر خالی کر نیکا نوٹس تھما دیا۔ میرے ساتھ رحمن بھائی کا بھی کنبہ تھا۔ بڑی مصیبت تھی۔ نیاز صاحب کو معلوم ہوا۔ مشکل کشائی کی اور ہم لوگوں کو اپنے گھر پر رہنے کی جگہ دیدی... بچی نے ہاتھ پھیلا کر ہمیں گلے سے لگایا۔ روزانہ خوب مزے مزے کے کھانے پکتے۔ نیاز صاحب کو کلیجی، گردے اور بھیجا بہت پسند تھا۔ عجیب عجیب طرح کی فرمائشیں کرتے... شام کو ہم لوگوں کو ساتھ لے کر بازار جاتے۔ پہلے آم چکھے جاتے۔ پھر آخری دکان سے خریدتے۔ میں ہنستی...... تو کہتے... ارے بھی آم خریدنا آرٹ ہے... ہر شخص کو نہیں آتا... ایک دن بچی سے کہنے لگے... تم نے عالیہ کا کمرہ بھی دیکھا.... ٹھیک ٹھاک ہے یا یونہی... تباہ حال ہوگا... بچی نے بڑی آہستگی سے کہا.. نہیں۔ سلیقہ مند ہے۔ اچھی طرح رکھتی ہے... ابھی بات ختم نہیں ہوئی تھی اچانک کاظم نے کہا "نیاز صاحب عالیہ کے متعلق کیا خیال ہے... ؟ عالیہ۔ ارے۔ عالیہ بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کے متعلق خیال دیا کیا جائے... بس... یہی کہ "مجھے اگر ایسی بیوی مل جاتی تو اب تک سترہ اٹھارہ برسیاں اطمینان سے ہو چکی ہوتیں"، باتیں کرتے کرتے اوپر کے صحن میں پہنچ گئے... دیکھا آپ نے.... یہ واش بیسن گندہ پڑا ہے۔ میری بیوی خوامخواہ

اس کی تیج کرتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انتہائی بدسلیقہ ہے عالیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میرے اور بچی کے منع کرنے کے باوجود نیاز صاحب نے اپنے ہاتھوں سے واش بیسن دھونا شروع کر دیا۔

میں شرمندہ، ششدر اور حیران کھڑی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ نیاز صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دوں، کیونکہ یہ وہ عظیم ہاتھ تھے جنہوں نے ادب میں روایت سے بغاوت کی داغ بیل ڈالی۔ درایت کی اہمیت کو تسلیم کرایا۔ کئی نسلوں کے فکر ونظر کے جالے صاف کئے۔ تعصب سے عقلیت، تقلید سے تجدد، ابتذال سے ندرت فکر کا روشن باب "نگار" کے نگار خانے میں کھولا۔ ادبی تنقید، انشائیہ، مکتوب نگاری، علوم عقلیہ، علوم مذہبیات کا در وا کیا لیکن نازک جمالیاتی احساس کے ساتھ۔ یہ وہ ہاتھ تھے جو اپنے عہد کے ادبی شعور کے آئینہ دار تھے۔ فکر و آگہی، عزم واستقلال کی حیات آفریں تاریخ میں پیوست۔

نیاز صاحب سرسید، شبلی کے ذہن کی ملی جلی کڑی تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انگریزی، فارسی، عربی اور ترکی کے مفکرین کا بھی اثر انہوں نے قبول کیا۔ لیکن عقلیت پسندی اور مذہب کے باب میں انہوں سرسید سے اکتساب کیا ادبی تحریروں میں اکثر شبلی کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن چونکہ ان کا مزاج خلاق تھا۔ تقلید کے منکر تھے۔ اس لئے ہر مقام پہ وہ اجتہادی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ابتدا میں ٹیگور کی گیتا نجلی ۔ ۔ ۔ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اس کا ترجمہ "عرض نغمہ" کے نام سے کر ڈالا۔ مہدی افادی اور ساتھ ہی ابوالکلام آزاد کے "الہلال" اور "البلاغ" نے توجہ مبذول کی لیکن یہ سب باتیں اس وقت کی تھیں "جب آتش جوان تھا" جوں جوں عمر کی منزلیں طے کیں اپنا منفرد رنگ پختہ سے پختہ نکھرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے رنگ کے آپ ہی تاجدار بن گئے۔

نیاز صاحب کا مطالعہ وسیع، فکر بلند اور عمل کوہ شکن تھا ۔ ۔ ۔

باب الاستفسار کے ذریعے ایک طرف انہوں نے مروجہ عقائد پر ضرب کاری لگائی تو دوسری جانب دیمک لگی ہوئی قدامت پسندی کے بتوں کو گرا دیا ۔ عالمی افکار و نظریات سے اردو کو روشناس کرانے میں ان کا مقام بہت بلند ہے ۔ نگار رسالہ نہیں "دانش محل" تھا جسے انہوں نے ترکی کی مشہور و معروف شاعرہ نگار بنت عثمان کے کلام سے متاثر ہو کر جاری کیا تھا۔ "نگار" نے یونیورسٹی کا حق ادا کیا۔ جس شاعر یا ادیب کو "نگار" نے "سند" دیدی وہ سند یافتہ کہلایا۔ انہوں نے عمومی ذوق کی تسکین کی نہیں بلکہ تربیت کی۔ روشنی بخشنے کی یہی وہ خطا تھی جس کی بناپر جبہ و عمامہ کے تاجروں نے ان کے خلاف فتویٰ صادر کیئے۔ علم کی روشنی دینے والے کو زمانہ سر کا تاج بنالیتا ہے ۔ اس کی دستار بندی کرتا ہے ۔ لیکن میاں بصیرت بیزار اور جہل افروز صاحبان نے انہیں "کافر" "زندیق" اور "ملحد" کے خطابات سے نواز کر "دربار" میں سرخروئی حاصل کی ان باتوں کے باوجود نیاز صاحب کی پیشانی پر کبھی شکن نہیں پڑی ۔

ان کا قلم ہی ایمان تھا ۔ قلم جو صداقت و انصاف کا علمبردار تھا ۔ انہوں نے تمام زندگی کسی سیٹھ ساہوکار سے رشتہ جوڑ کر کسی "ممدوح خاص" کی مدح سے قلم کو آلودہ نہیں ہونے دیا صرف قلم سے روزی کمائی اور قلم ہی کے زور پر اپنے حسن فکر و عمل کا خراج زمانے سے لے لیا نیاز فتح پوری کے عہد میں سانس لینا بھی بڑائی ہے . . . نیاز اردو زبان کا معمار اعظم ہے ۔

وقت گذرتا گیا ۔ نیاز صاحب سے ایک عرصہ کے لئے رشتہ ٹوٹ سا گیا میں چین میں تھی اچانک اطلاع ملی "نیاز صاحب بہت بیمار ہیں" . . . . رکشے سے گر پڑے سر میں چوٹ آئی . . . موٹر ٹکر مارتی ہوئی گذر گئی . . . . . نیاز صاحب کی حالت خراب ہے . . . . کچھ دنوں بعد میں چین سے واپس آئی . . . . ائیر پورٹ سے سیدھی نیاز صاحب کی عیادت کے لئے گئی ۔ حالت واقعی بہت خراب تھی مجھے دیکھتے

ہی ایک دم کھل اٹھے . . . . ارے بھئی اچھا ہوا . . . . عالیہ تم آگئیں
. . . اب سفر کی آخری منزل ہے . . . .
میں نے کہا نیاز صاحب یہ نا کہیئے . . . . آخری کیوں . . . ابھی تو آپ
بہت جیئیں گے . . . . . . ہم آپ کے امام ضامن باندھتے ہیں ۔ اس کے بعد آپ
بالکل ٹھیک ہو جائیں گے . . . . نیاز صاحب اس وقت سخت علیل تھے ۔ لیکن حاضر
دماغی ویسی ہی تھی ۔ سنتے ہی قہقہہ لگایا . . . ہاں ہاں بھئی امام ضامن ضرور باندھ
دو ، امام ضامن تو تم ضرور باندھ دو کیونکہ تاریخ میں کوئی شیعہ مرا ہی نہیں ہے .

نیاز صاحب بستر مرگ پر تھے ۔ لیکن ان کی عقل بیدار اور عقائد
کی پیشانی شرمسار تھی ۔ نیاز صاحب کا نام جہالت کے لئے کڑی دھوپ اور فہم و ادراک
کے لئے چاندنی تھا۔ وہ دشمنوں کے لئے انگارہ اور دوستوں کے لئے نورتن تھا۔ دل چاہتا ہے
کہ میں اس نورتن کے ہاتھوں کو ایک مرتبہ پھر بوسہ دیدوں . . .

بچپن میں جوش صاحب کا ذکر اپنے والد کو کرتے سنا
لیکن انہیں کبھی دیکھا اور نہ ہی پڑھتے سنا۔ اس زمانے میں جوش صاحب تک رسائی کا واحد ذریعہ ہمارا دوست ننو تھا۔ مزدور لیڈر ایران توران کی خبروں کا ماہر خود اعتمادی اور جرأت و بے باکی میں منفرد " علو بیا، آج تو میاں کی شملہ کوٹھی میں بڑی زور کی دعوت تھی۔ منیکا بائی بھی تھیں، وہاں جوش ملیح آبادی انقلابی بھی آئے تھے۔ اور کیا جانے کون کون تھا۔ . . . . . . اور ہاں علو بیا۔ انقلابی جوش بڑا انقلابی ہے۔ کل رات بڑا بھاری جلسہ۔ اپن کے لوگوں کا تھا۔ خوب پڑھا. . . انقلابی جوش نعرے لگے۔ زندہ باد تو اپن نے بھی خوب کہا . . . وہاں اپنے والے وزیر بھی تھے تم نے ہی تو اس کے لئے ووٹ ڈلوایا تھا . . . . خود تو وزیر ہو گیا لیکن ننو میاں کھڑے کے کھڑے وہی لکڑی کاٹ رہے ہیں . . . آجائیگا وہ بھی ہاں بیٹیوں پر ایک دن . . . . یاد رکھنا بی بی تم . . . لوگ کہتے ہیں. . . کہ اگر ملیح آبادی انقلابی جوش بار بار یہاں آگیا تو انقلاب آجائے گا ضرور . . .
. . . . . بڑا رعب والا ہے اپنے میاں کی طرح . . . . .
اس طرح ننو بھیں جوش صاحب سے روشناس کراتا رہتا تھا

وقت گذرتا گیا۔ میں تعلیم کے سلسلے میں لکھنؤ چلی گئی
اور پھر وہاں سے دہلی آئی . . . . دہلی تو جوش صاحب کی راجدھانی تھی . . .
چپہ چپہ پر ان کی حکمرانی تھی۔ پنڈت نہرو جیسا انسان ان کا قدر دان تھا۔ وہاں ہم کس کھیت کی مولی تھے۔ دہلی میں قیام کے دوران صرف ایک مرتبہ ان کا دیدار نصیب ہوا۔ اور وہ بھی یوں کہ سکریٹری تعلیم غلام السیدین اور سکریٹری ثقافت اشفاق صاحب ہمارے ابا کے بہت گہرے دوست تھے۔ ابو الکلام آزاد کے یہاں دعوت تھی۔ ابا کے ساتھ میں ہم بھی

مدعو تھے ۔

ابو الکلام کا گھر جنت نظیر تھا ۔ باغ سے گذر کر ہم کمرے میں داخل ہوئے کمرے کے حسن کو دیکھ کر مصور کے جمالیاتی ذوق کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ فرش فروش گاؤ تکیے سب ہلکے بادامی رنگ کے ، یہاں تک کہ چائے کا سیٹ بھی ہلکا بادامی ۔ ۔ ۔ پوری فضا مہک رہی تھی ۔ ابو الکلام کو دیکھتے ہی "سحر" کا احساس دل میں جاگ اٹھا۔ روشنی کا طلسم سامنے تھا۔ قیامت خیز نگاہیں ۔ ایسی کٹیلی نگاہیں جو خاموش تھیں ، لیکن بولتی ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ سناٹے کو جگاتی ہوئی ۔ ان کے نزدیک ذاکر صاحب بیٹھے تھے ۔ کتنا عظیم انسان جو ہر دل کے کواڑ کھول کر داخل ہو جائے ۔ نکھری نکھری گفتگو ۔ علم کا بہتا ہوا دریا ۔ ہر حرف روشن ہر ادا نورانی میں نہائی ہوئی ۔ سامنے جوش صاحب تھے ۔ پورے وجود پر ماں کے دودھ سے نہائی ہوئی معصومیت برس رہی تھی ۔ چہرہ قندھاری انار ، ہر بول ہر انداز ہر ادا سے اس کی بوندیں ٹپک رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نکر انگیز گفتگو ہو رہی تھی "Why do I write"

گراہم گرین اور الزبتھ باون کے نظریات پر بحث ہو رہی تھی ۔ سارترے کی کتاب "What is liteeature" بھی زیر بحث تھا ۔

گفتگو میں نہ جانے کتنے پیچ وخم آئے ۔ بات طنز ومزاح کے حلقے میں داخل ہوئی آرتھر کوسلر کی کتاب "Insight & Out look" پر بحث ہوئی ۔ " دراصل ہمارے اذہان زندگی کی بیزار کن یکسانیت سے بے حس ہو چکے ہیں صاحب یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ سماج کی ناہمواریوں کو طنزیہ انداز میں پیش کرنا اہم فریضہ ہے ۔ آرتھر چارلس، ڈکنس ، سوئفٹ ، پی جی ووڈ ہاؤس ایڈیسن اور اسٹیل خالص مزاح کی نمود ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جوش صاحب انتہائی پُروقار انداز میں بحث میں شریک تھے۔ ہاں صاحب ان حضرات میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ ارادے اور عمل کی ذمہ داری کو دانائی و احتیاط کے ساتھ قبول کریں اب آپ فارسی کے اشعار میں یہ انداز ملاحظہ فرمائیے۔

زاہد بہ زن فاحشہ گفتہ مستی ‍‍‍ ‍ ‍ بنگر زکہ بمستی وحیوں بوستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم ‍ ‍ تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

جوش صاحب چونکہ میرِ محفل تھے۔ اس لئے ہر شخص ان کی گفتگو غور سے سن رہا تھا۔ جوش صاحب کی علمیت کا سکہ سب کے دل پر جم چکا تھا۔ اب ان کا کلام ایک نئی فضا تخلیق کر رہا تھا۔ جس پر ساری محفل سوجان سے نثار ہو رہی تھی یہی پہلا اور آخری دیدار تھا جو مجھے دہلی میں جوش صاحب کا نصیب ہوا۔ اس کے بعد پھر" التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا" کی منزل رہی۔

گردشِ لیل و نہار کے ہاتھوں جوش صاحب پاکستان آ گئے۔

مولانا ابوالکلام نے اس ضمن میں بہت خوبصورت بات کہی۔" ہندوستان سے جوش نہیں جا رہے ہیں بلکہ برگد کا تناور درخت اکھڑا چلا جاتا ہے۔ - - - -

ایسا درخت جس کی جڑیں گوتمی مسکراہٹ، کرشن کی مرلی، تان سین کی تانیں، مغلوں کے جمالیاتی ذوق، تاج محل کے حسن اور اسلام کی آفاقیت سے سینچی گئی تھیں، اتنے بڑے ملک کا اتنا بڑا درخت چھوٹے سے آسمان کے نیچے کیسے سماتا۔ درخت نے ذرا جگہ گھیری چھوٹے چھوٹے پودے رگڑ کھانے لگے، پھلنے لگے، جلنے لگے، مالیوں نے شاخوں کی کتر بیونت میں کسی طرح کی کسر نہیں چھوڑی۔ معمولی درخت ہوتا تو کبھی کا مرجھا جاتا۔ لیکن میدانی درخت جھکڑ اور پتھراؤ کے سامنے کھڑا رہتا ہے۔ صرصر و سموم سے روغن غذا کرتا اور لودیتا رہتا ہے۔

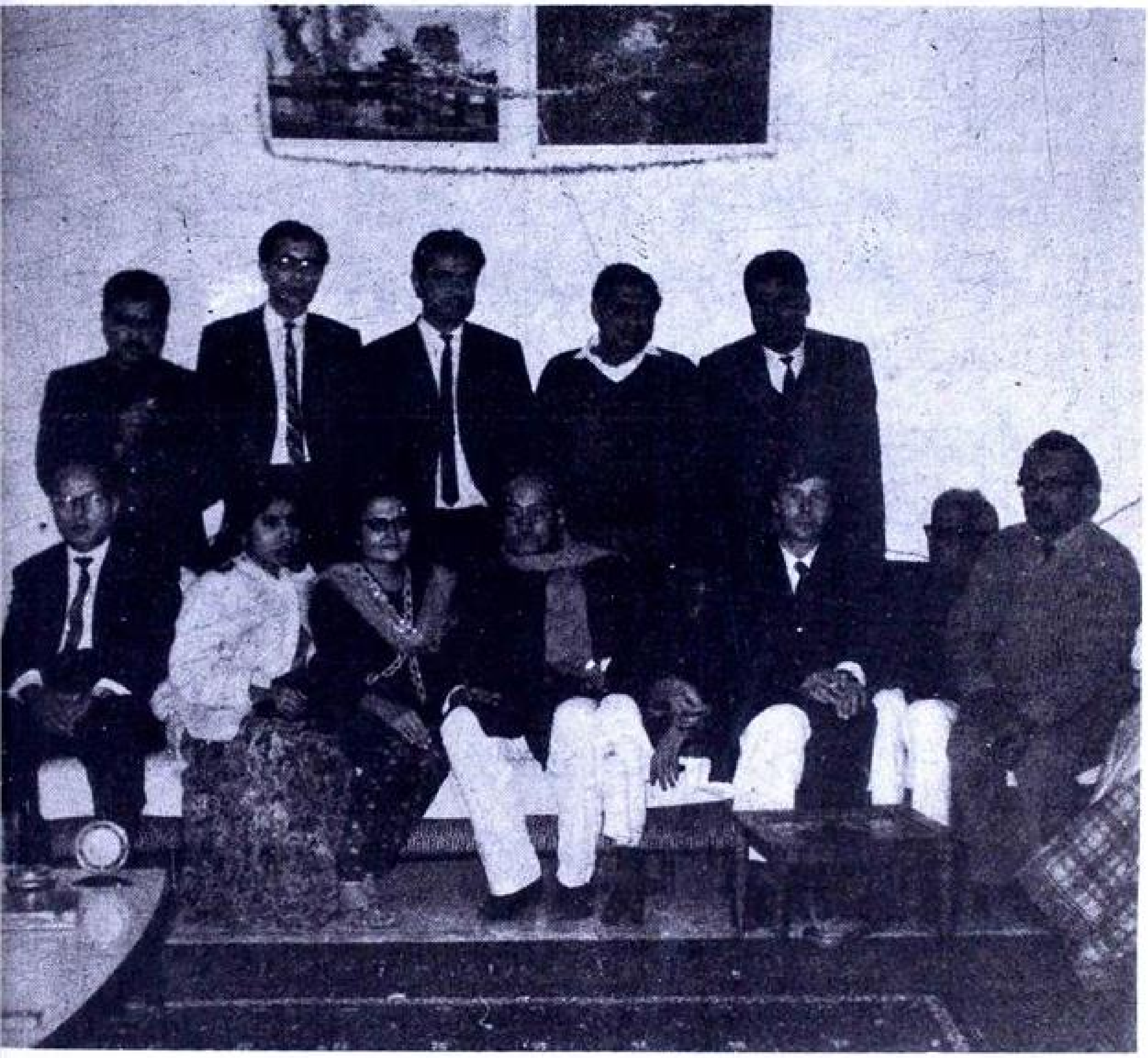

حضرت جوش ملیح آبادی کے ہمراہ سید ظفر مہدی سابق پرنسپل پریمئیر کالج۔ ممتاز افسانہ نگار سلطانہ مہر
ممتاز مصور صادقین۔ میتھو آرنلڈ لکچرر لندن اسکول آف اورنٹیل اسٹیڈیز، سید محمد صادق (ایڈوکیٹ)

سید محمد مسعود ایڈوکیٹ (ہانگ کانگ) اور دیگر شرکاء

حضرت جوش ملیح آبادی

جوش صاحب کی پاکستان میں آمد کے سلسلے میں نت نئی کہانیاں روزانہ سننے میں آتیں۔ طالب نقوی سکریٹری تھے انہوں نے سنیما کا لائسنس دینے کا وعدہ کیا تھا اس لئے آگئے۔ اسکندر مرزا نے پلاٹ دینے کا وعدہ کیا اس لئے آگئے۔ . . . ہندوستان میں اردو کی حمایت میں نظم لکھ ڈالی تھی۔ اردو کے عاشق ہیں، پاکستان میں اردو زبان کی محبت میں آگئے۔ جمشید روڈ پر بنگلے الاٹ ہو گئے تھے اس لئے چلے آئے . . . . غرضیکہ کروڑوں منہ کروڑوں باتیں . . .

جوش صاحب سے ملنے کا اشتیاق تو تھا ہی کسی طرح ان کے گھر پہنچے تین کمروں کا مختصر سا گھر جمشید روڈ پر واقع تھا، چاروں طرف بانس کا ٹٹر لگا ہوا . . . "یہی وہ بنگلہ ہے جو جوش صاحب کو الاٹ ہوا ہے میں نے اپنے بھائی مسعود سے دریافت کیا۔ اس وقت چونکہ جوش صاحب تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ہم مایوس واپس آگئے۔ کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ جوش صاحب اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئے ہیں۔ گمان یہی تھا کہ ان کا نیا گھر، ڈیفنس، کلفٹن یا کے۔ ڈی۔ اے کے علاقے میں جہاں بڑے لوگ رہتے ہیں وہاں ہوگا لیکن ہم پر تو اس وقت اوس پڑ گئی جب معلوم ہوا کہ ان کا گھر تو فیڈرل بی ایریا کے علاقے میں واقع ہے یعنی ہمارے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر بہر حال کسی نہ کسی طرح جوش صاحب کے مکان پہنچے۔

دو منزلہ مکان تھا۔ اوپر بہت بڑا ہال تھا، بیچ میں تخت بچھا ہوا تھا جس پر غرارے میں ملبوس بھاری بھرکم خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ سامنے پاندان رکھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔ کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ . . . . نام کیا ہے؟ میں نے تفصیل بتائی۔ کام کیا ہے؟ بس وہی . . . اے جوش صاحب سے ملنا . . . . شادی ہو چکی ہے؟ ہوں . . . . . تو میاں کہاں ہیں؟ . . . . . خیر جاؤ . . . . . سامنے

کے کمرے میں میز پر جوش صاحب بیٹھے لکھنے میں مصروف تھے . . . . .

مجھے دیکھتے ہی بولے . . . . ادہو ۔ اچھا اچھا ۔ بہت خوب بہت خوب . . . ۔ پہچان تو لیا آپ نے ، ہاں ، ہاں پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے ، جوش صاحب

میرا نام عالیہ ہے ، عسکری صاحب کی بیٹی ۔ قلم یکدم ہاتھ سے چھوڑ دیا . .

واہ . واہ . . . . . واہ . . واہ . . . .

ارے سنتی ہو اپنے عسکریوا کی بیٹی آئی ہے ۔ فراق عسکری صاحب کو ہمیشہ عسکریوا کہتے تھے ۔ یہ کہتے ہوئے مجھے گلے سے لگا لیا ۔ سنا انیس عسکری کی بیٹی آئی ہے تھوڑی دیر میں سعیدہ آپی ، بچے سب میرے ارد گرد جمع ہو گئے ۔ پرانی یادوں کا رنگین باب کھل گیا ۔

" میر انیس پر تمہارے باپ کی جو نظر تھی وہ برصغیر میں کسی کو نصیب نہیں ۔ فردوسی دمیر انیس کا کیا خوبصورت تقابلی مطالعہ کیا ہے واہ واہ . . . . .

ایک مرتبہ نواب بھوپال کے یہاں مشاعرہ تھا ۔ مشاعرہ کے بعد جگر صاحب نے میر انیس کی شان میں ذرا سخت الفاظ کہے . . لبس پھر کیا تھا تمہارے والد کا گھر دینے ہی خون باڑھ پہ آ گیا ۔ اسی وقت فی البدیہ یہ نظم لکھ کر نواب کو سنائی وہاں راس مسعود بھی موجود تھے . . . ہائے ہائے راس مسعود تو انیس کے شیدائی تھے فوراً عسکری صاحب کو گلے سے لگا لیا ۔ " نظم کے کچھ بند تو سن لو . . . . اچھا نوٹ بک دو تو اس میں سے سنائیں ۔ "

سنو ! اے جگر آرے ، علی سکندر
کہ چوں فہم تو ۔ فہم رُستا ، نباشد
کلام انیس خدائے سخن را
نہ فہمد جلاہا کہ کرگھا نباشد

بہ ازم اندروں زہر تریاق سوزے
کہ سید بود آں جولاہا نا باشد
کلامش مصفٰی چو تسنیم و کوثر
شراب طہور است "کھرا" بناشد

موسیقی پر بھی تمہارے والد کی گرفت مضبوط تھی ۔ کیا کہنا باپ کی طرح تمہیں بھی موسیقی سے لگاؤ ہے؟ یا نہیں . . . . . .

معمولی سا۔ اچھا سچا عالیہ کے لئے گانے کی محفل کرو کل . . . . تو ٹھیک ہے نا گانے کی محفل ہوئی ۔ استاد امراؤ بندو خاں صاحب کا گانا ہوا ۔ محفل خوب جمی . . . ڈنر کے وقفے کے دوران جوش صاحب نے موسیقی کے متعلق باتیں کرنا شروع کیں ۔

" اورنگ سدا رنگ نے بہت سی چیزیں محمد شاہ سے منسوب کر کے کہی ہیں ۔

مثلاً کاموود کی مشہور بندش ہے . . .

اپنے پیا کو جانے نہ دوں گی کارے
اپنے پیا کو جا نے نہ دوں گی
آنکھوں میں راکھوں پلکیں موند موند
محمد شاہ تم سدا رنگیلے پیا بر سے لوند لوند
اپنے پیا کو جانے نہ دوں گی

خیال کاموود تمہارے باپ کا پسندیدہ راگ تھا .

اچھا پھر ہوا یوں کہ جب مغلوں کی مرکزی حکومت پہ زوال آیا تو راگ راگنیوں نے اودھ کا رخ کیا . . . . . . ہائے لکھنؤ ۔ کیا محفلیں ہوتی تھیں ۔

بہاگ کی ٹھمری تمہارے باپ سناتے تھے ۔ آہا آہا . . . . .

" رس بھری انکھیاں را دھا کی من چھین کے لے گئیں " . . . . . .

اور خیال بہار میں امیر خسرو کی یہ ٹھمری . . . . . .

حضرت خواجہ سنگ کے لئے دھمال

بیش خواجہ تم بن ٹھن آئے

حضرت رسول صاحب جمال

حضرت خواجہ سنگ کیلئے دھمال

اور امین کی یہ مشہور ٹھمری

آل نبی اولادِ علی پہ واری واری جاؤں

زہرا کے فرزند حسن و حسین پہ واری واری جاؤں

بندو خاں سے مخاطب ہو کر . . . . . اور آپ کے والد بندو خاں صاحب کی سارنگی . کیا کہنا . . . . . . سب سازوں میں پیچیدہ ترین ساز غالبًا یہ دو ہیں . سارنگی اور . . . چیز دینا . . . . شولوی نے جہاں تک یاد پڑتا ہے ایک مقام پہ لکھا ہے ستار، بوعلی سینا نے بھی ایجاد کیا تھا . . . . . اور سارنگی تو دنیا . ستار . اور طنبورہ کے امتزاج سے بنی ہے . سارنگ خاں جو محمد شاہ کے دربار سے منسلک تھا غالبًا اس کی ایجاد ہے . باتوں ہی باتوں میں پکھاوج کا ذکر آیا . پکھاوج دراصل مردنگ کی ترقی یافتہ شکل ہے . . . . . پہلے زمانے میں گھڑے پر کھال منڈھ دی جاتی تھی . ایک منہ کے گھڑے سے کسی کو دو موہنی گھڑا بنانے کا خیال آیا ہو گا . لمبوترے گھڑے کو دونوں رخ سے منڈھ کر مردنگ بنائی . . . . . . مردنگ تو صاف مٹی کی ہوتی تھی لیکن پکھاوج لکڑی کی . . . . . اس کا دایاں رخ بائیں رخ سے بقدر چھوٹا ہوتا ہے . . . . . . اور پکھاوج کو دو ٹکڑے کیا کیجئے طبلہ تیار . . . .

واجد کی طرف مخاطب ہو کر . . . . میاں تمہارا ہاتھ بہت صاف ہے . . .

طبلے کا نام دراصل جنگی ساز طبل پہ رکھا تھا۔ امیر خسرو نے . . .
مگر یہ دائیں کا گھیرا کیوں چھوٹا ہے . . . . پکھاوج کی طرح بایاں ڈھیلا رکھا جاتا ہے ۔ اور اسی میں گمک پیدا کی جاتی ہے ۔ دراصل . . . . پکھاوج کے بول کھلے ہوتے ہیں . . . اور طبلے کے لئے بند بول مقرر کئے گئے ہیں . . . . . بس یہ انگلیوں کے آپ کے کمال ہے . . .
مگر . . . ہائے ہائے . . . فنکار نان جویں کو ترسیں . . ہائے ہائے کھوپڑی خالی معدہ آباد عیش کریں . . ہائے ہائے۔

موسیقی پہ جوش صاحب کی باتیں دل کے تاروں کو چھیڑ رہی تھیں ۔ کاڈ ویل نے اپنی شہرہ آفاق کتاب " خیال اور حقیقت " میں شاعری کے سرچشموں کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں اس نے بہت دلچسپ بحث کی ہے ۔ اس کا خیال یہ ہے کہ " شاعری اپنی خصوصیات کے اعتبار سے گیت ہے " اسی لئے کہا جاتا ہے کہ شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے جوش صاحب کی موسیقی پہ دسترس کو دیکھ کر اس کے اس خیال کی صداقت سامنے آگئی ۔

محرم کا زمانہ تھا ۔ بی بی نے یہ طے کیا کہ ایک یا دو مجالس ہمارے گھر پہ ہوں گی ۔ چنانچہ عورتوں اور مردوں کی ملی جلی مجلس ہوئی ۔ بلا امتیاز ، مذہب و ملت تمام ذی شعور حضرات شریک ہوئے ۔ بختیاری صاحب ، جسٹس اخلاق حسین ، کمانڈر مشتاق اور ان کی بیگم صاحبہ ہاشم رضا صاحب جنکا تخیل بلند فکر ہمہ جہت اور زبان کوثر و گنگا میں نہائی ہوئی ہے انکے علاوہ ابرار نقوی جو کہنے کو تو کلکٹر کسٹم ہیں لیکن حقیقی معنی میں ادیب ہیں ، ادیبوں پہ ہمہ دولت قربان کرنے میں سب سے آگے ۔ جوہر شناس — صغیر حسین جعفری صاحب ایڈوکیٹ یعنی علم و فضل کا منارہ ممتاز شاعر حکیم ناصر دریا بے ناز الانسان آفتاب زیدی مع اپنی علمیت کے رعب کے سراپا اجالا ہی اجالا ۔ ڈپٹی ڈائریکٹر زین العابد نقوی اور ان کی بیگم صاحبہ

یعنی زہرا خالہ غرضیکہ بہت بڑا اجتماع ہوا۔ پہلی مجلس آل رضا صاحب کے مرثیے کی ہوئی آل رضا صاحب کا شمار جدید مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی نگاہ بلند، سخن دلنواز اور اسلوب منفرد ہے۔ وہ صرف مرثیہ ہی نہیں بہترین غزل گو ہیں۔ ان کی شخصیت جو نرم، ملائم اور شبنم ہے، گلاب کی خوشبو میں بسی ہوئی ہے۔ اس کا جوہر ان کی غزل اور مرثیے میں نظر آتا ہے۔

جس زمانے میں لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ مرثیہ اپنی عمر کی آخری منزلیں طے کر چکا ہے۔ اب اس میں زندگی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اسی دور میں آل رضا صاحب نے مرثیے کی دنیا میں قدم رکھا۔ ادب کی طرح مرثیہ کی صنف کو بھی تاریخی حقائق سے آگاہ کیا۔ منطق اور فلسفہ کے ترازو پہ اسے تولا اور اسے بھی زندگی کی کشاکش سے آشنا کیا، زمانے کی رفتار، اور نئے اثرات کا تجزیہ کیا۔

قدیم مرثیہ نگاروں نے عقائد کی بنا پہ مرثیے کہے تھے اول تو اس وقت اعتقادات کے معاملے میں "سوشح" مسئلہ نہیں تھا دوسرے مذہبی جوش اسباب و علل کی کڑیاں جوڑنے کا مطالبہ بھی نہیں کرتا تھا۔

آل رضا صاحب نے واقعہ کربلا کے معاملے میں عقیدت اور محبت دونوں کا حق بھی ادا کیا اور اس کے ساتھ ہی واقعہ کربلا کے اسباب و علل پہ نگاہ بھی ڈالی اور اسکا تجزیہ کیا۔ اموی سیاست نے اسلام کے چہرے کو کس طرح مسخ کیا اور نواسہ رسول حسین نے انکار کی منزل پہ آکر اس کا کس طرح صحیح رخ زمانے کو دکھا دیا۔ اس پہلو کو آل رضا صاحب نے خلوص کی گرمی، جذبے کی شدت اور فن کی پختگی کے ساتھ اس طرح بیان کیا کہ مرثیہ کو نیا رخ اور آئندہ آنے والی نسلوں کو نیا لائحہ عمل مل گیا۔

منظرِ وقت کو تھا ایسے ہی ایثار سے کام
ارتقا دو نظریوں کا سوا طشت از بام
ایک اسلام سے منسوب حکومت کا نظام
دوسرا موردِ آلام حقیقی اسلام

ایک سر چڑھ کے یزیدِ اموی میں ابھرا
دوسرا پس کے حسین ابنِ علی میں ابھرا

دوسری مجلس میں حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھا۔ "جو شہادت سے ڈرے اس کی عبادت کفر ہے"

ممتاز نقاد، ادیب، شاعر سید محمد تقی، جون ایلیا، محمد علی صدیقی، پی اے انصاری رئیس صاحب، ارتضیٰ زیدی، (سکریٹری) حسن مصطفےٰ۔ بخاری صاحب، منور عباس ایڈوکیٹ، مرزا عابد عباس، ظفر حسین صاحب، پروفیسر نصیر نقوی، پروفیسر منظر کاظمی، صفدر برلاس، ممتاز شاعر راغب مراد آبادی اور مختلف کالجوں کے اساتذہ، طلبا، صحافی دانشور غرضیکہ ایک دنیا امنڈ آئی تھی۔ بیگم اکرام اللہ۔ بیگم ہدایت اللہ، پروین ہارون، کون تھا جو وہاں موجود نہیں تھا۔ جوش صاحب اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں مرثیہ سنا رہے تھے۔

خلق کو تو نے تمنائے شہادت بخش دی
اس تمنائے شہادت نے شجاعت بخش دی
پھر شجاعت نے بھڑکنے کی حرارت بخش دی
اس حرارت نے گداؤں کو حکومت بخش دی

اس قدر عجلت سے تو روئے زمیں پہ چھا گیا
مدعی چکرا گئے تاریخ کو غش آگیا

تعریف و تحسین کے نعروں سے سارا گھر گونج رہا تھا اور جس وقت انہوں نے یہ بیت

سنائی۔

یہ انی سر پہ نہیں تیرے انا کا تاج ہے
کربلا تیرے نظامِ فکر کی معراج ہے

سرخ انگاروں کو جس نے خاک کر کے رکھ دیا
جس نے دامانِ حکومت چاک کر کے رکھ دیا

جب حکومت قہر ہائے معدلت ڈھانے لگے
جب غرورِ اقتدار ، اقتدار پر چھانے لگے
خسروی آئین پر جب آگ برسانے لگے
جب حقوقِ نوعِ انسانی پہ آنچ آنے لگے

ان میں در آبازوئے خیبر شکن سے کام لے
ان مواقع پر حسینی بانکپن سے کام لے

سانس لینے کو نہیں کہتے ہیں دانا زندگی
ہر نفس اک طرح نو کی ہے تمنا زندگی
ہر قدم تسخیرِ قدرت کا ہے سودا زندگی
خون میں ہے ارتقا کا شور و غوغا زندگی

سرد ہے جس کا لہو وہ آدمی بے جان ہے
بے دلوں پر زندگی دراصل اک بہتان ہے

دل، جراحت اگر بھاگے تو راحت کُفر ہے
غم سے اُکتائے طبیعت تو مسرت کُفر ہے
تخت پہ قابض ہو جابر تو اطاعت کُفر ہے
جو شہادت سے ڈرے اُسکی عبادت کُفر ہے

دامنِ صد پارۂ غیرت کو سی سکتا نہیں
موت سے جو منھ چھپاتا ہے وہ جی سکتا نہیں

داورا ہلچل ہے پھر برپا میانِ مشرقین
ہر نظر ہے ایک ماتم، ہر نفس ہے ایک بین
تخت پر سرمایہ داری ہے لقبدِ اجلالِ زین
اور مِس سے مَس نہیں ہوتے محبانِ حسینؑ!

ہے یہی ایمان تو ایمان کو میرا سلام
اک فقط ایمان کیا۔ قرآن کو میرا سلام

جوش صاحب مرثیہ کیا پڑھ رہے تھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چاروں طرف چاندنی کھل رہی ہے۔ فلک شگاف نعرے بلند ہو رہے تھے پوری فضا مہک رہی تھی۔

جوش صاحب کا مکان چونکہ میرے گھر سے بہت قریب تھا اس لئے روزانہ میں شام کو ان کے یہاں چلی جاتی۔ بہت ہی اچھی محفل سجتی۔ ایک دن اچانک شور سا ہوا سب گھبرا کر کھڑے ہو گئے دریافت کیا تو بہت ہی پیارے انداز میں فرمایا .... "کیا بتائیں صاحب ہم نے عشق کئے، ہمہ وقت محبوبہ کی خاطر داریاں کیں ... یہاں ہمارے نواسے عاشق ہوئے ہیں۔ لیجئے یہ دیکھئے معشوقہ کو پیٹ رہے ہیں۔ ہائے ہائے عاشق کے ہاتھوں معشوقہ کو پٹتے صاحب ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔

"آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"

میرے کالج میں چھٹیاں تھیں۔ ایک دن دوپہر کو تمام ساتھی گھر آ گئے۔ جوش صاحب کے پاس جانے کا پروگرام بنا۔ گھر پہنچے ..... آؤ آؤ بھئی آؤ آؤ .... جوش صاحب نے انتہائی والہانہ انداز میں ہم سب کا استقبال کیا۔ بیوی سے مخاطب ہو کر بولے " عالیہ کے کالج کے یہ سب پروفیسر ہیں " ہوں سن لیا .... بیٹھئے۔ پان کھائیے۔ نہیں جی ہم لوگوں کو چائے پلوائیے بہت ہی برا منہ بنا کر بولیں .... ادئی۔ ائے چار قدم پہ گھر ہے۔ مہمان تمہارے یہاں آئے ... ائے چائے نہیں پلوائی یہ بھی خوب طریقہ ہے خاطر کرانیکا ... چائے پلوا کے لانا چاہئیے تھا۔ بات یہ اصولی غلط ہے۔ ہاں جی یہ تو ٹھیک ہے ... لیکن سنیئے ہم جا کر چائے بنا لاتے ہیں۔ ...... میری طرف سے پیٹھ پھیر کر جوش صاحب کی طرف مخاطب ہوئیں۔ ائے مجھے ایسی عورتیں زہر لگتی ہیں .... جو دوسروں کے کارخانے میں دخل دیں ....

ارے ارے کیا کہہ رہی ہو .... ہونہہ تم مت بولو ....

ائے ہاں۔ عورتوں کے "جھگڑے" ہیں تمہارا کیا کام ہے یہ سنتے ہی ....

بڑی زور سے جوش صاحب نے قہقہہ لگایا۔ بڑی واہ۔ واہ۔ واہ

جس زمانے میں میں آدم جی سائنس کالج میں پڑھا رہی تھی تو وہاں کے اساتذہ اور طلبا نے جوش صاحب کے ساتھ ملکر شام منائی۔ جوش صاحب نے کلام سنایا، سب نے خوب ہی خوب داد دی، طلبا نے پھول نچھاور کئے بعد میں ان کی اجازت سے سوالات کا سیشن ہوا۔ سوالات کی بھرمار ہوگئی . . . .

تو بولے "ارے سب اکٹھا ہی سوال کرنے لگے۔؟ ایک ایک کرکے۔ کیا ہے سوال؟

جوش صاحب! احساسِ حسن اور ذوقِ جمال تو داخلی کیفیات ہیں کیا اس کا تعلق خارج سے بھی ہے؟

جواب! دراصل ذوقِ جمال کا تعلق شعور سے ہے۔ اور شعور زمان و مکان سے آزاد نہیں شعور اور ذوقِ جمال کا تاریخی ارتقا ہوا ہے اس لئے مخصوص سماجی اثرات سے انکار ممکن نہیں جو ذوق جمال کی تربیت کرتے ہیں۔ کوئی بھی شخص بنا بنایا ذوق جمال لے کر پیدا نہیں ہوتا۔

سوال۔ شاعر ادیب اور فن کار کا کام تو تخلیق ہے۔ اس کی روزی روٹی مہیا کرنا تو اس کا کام نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

جواب . . ہاں صاحب اتفاق تو کرتے ہیں لیکن صرف اس حد تک جیسا گورکی نے خیال ظاہر کیا ہے۔ "یعنی ہاتھ دماغ کی تربیت کریں۔ اور تربیت یافتہ ذہن ہاتھوں کی تربیت کرے . . . . فکر ٹھوس زمین سے جڑکر ہی شاداب ہوتی ہے، ورنہ نہیں . . . . دیکھیئے صاحب ہم نے تمام زندگی روزی کمائی اور تخلیقی عمل بھی جاری رکھا

سوال۔ آپ نے ہمیشہ تعقل و تفکر کی دعوت دی اس کے برعکس اردو شاعری کا بیشتر سرمایہ اس صفت سے خالی ہے۔ زیادہ تر جذبات کی شاعری ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب . . . بات بالکل درست ہے . . . وجہ دراصل یہ ہے ہمارے بیشتر شعرا دربار سے وابستہ تھے۔ نواب کو خوش کرنا ان کے لئے لازمی تھا . . .

اور اگر نواب تفکر کی بات سمجھ بھی لیتا تو لوگوں کو بتاتا کیوں ؟ نوابی خطرے میں ہوتی پھر نوابی تو روبہ زوال تھی ہی ۔

"نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

یہ حالت تھی . . . ایسی صورت میں گردوپیش کے حالات کو فراموش کر دینا ۔ مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا اسی میں نجات تھی ۔ شاعر اور نواب دونوں کے لئے بس جذبات ہی جذبات تھے ۔

سوال ! تشبیہ و استعارہ شاعری میں حسن پیدا کرتا ہے . . لیکن کیا کوئی شاعر محض اس صفت کی بنا پر بڑا شاعر بن سکتا ہے . ؟

جواب ! جی نہیں بالکل نہیں . . . اچھوتی تشبیہ اور نادر استعارے کلام میں حسن پیدا کرتے ہیں ۔ لیکن یہ راستے ہیں منزل نہیں ۔ منزل تو خیال کی رعنائی ہے ۔ اگر خیال بڑا نہیں تو بے چاری تشبیہ بس لونڈی ہی رہے گی ۔

سوال ، جوش صاحب ! آپ کا پسندیدہ شاعر کون ہے ؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے نظیر اور انیس ، ٹھیک ہے ۔

جواب . . . . بالکل ٹھیک . . . نظیر مجھے پسند ہے دو وجوہ سے اول تو یہ کہ اس عہد میں جب دربار کے لوازمات میں شاعری کا پورا پورا جکڑا ہوا تھا نظیر نے مختلف راستہ اختیار کیا ۔ یعنی احتجاج کی شکل میں اس نے رسمی شاعری پر لعنت بھیج دی . . . دوسری بات یہ کہ اس نے دیرینہ روایت سے زبان کے اعتبار سے بھی بغاوت کی ۔ اب تک اعلیٰ طبقوں کی زبان شاعری میں استعمال ہوتی تھی ۔ کیونکہ لکھا ہی انہیں کے لئے جاتا تھا ۔ نظیر نے فارسی شاعری کا بھی اثر قبول نہیں کیا جو اردو شاعری کے مزاج میں داخل ہو چکی تھی . . . انہوں نے عوامی انداز ، میں عوامی زبان ، عوامی مسائل پر گفتگو کی ۔ عوام چونکہ بجلی کا ہنڈا ہوتے ہیں اس لئے نظیر کی بھی جھاڑ و فانوس بن گئی

"روپئے کا فلسفہ" "آٹے دال کا فلسفہ" "کوڑی کا فلسفہ" ۔ ان فلسفوں کو صرف نظیر نے بیان کیا اور بس ۔ برسات کا موسم رنگین ہوتا ہے ۔ رومانی جذبات حرکت میں آتے ہیں آم کے باغ میں جھولے پڑنا ۔ ۔ کنواریوں کی چوڑیاں کھنکنا، سہاگن کی پازیب بجنا یہ سب اس موسم میں ہوتا ہے ۔ لیکن نظیر ایک طرف وہ گیت گاتا ہے ۔" جو ہم بہو بیٹیاں کیا جانیں، لیکن ساتھ ہی وہ روزمرہ کے تجربات خوش شکلی و بد شکلی، خوشنمائی و بدنمائی کو دکھاتا ہے مثلاً بھانڈ کے قصے، مراثی کے لطیفے اور جسمانی لذت کی داستانیں مستی سے سرشار ہو کر انڈیلتا ہے لیکن وہ رومانیت کا زیادہ قائل نہیں ۔ برسات میں رومانیت کے علاوہ اسے یہ بدنمائی بھی یوں نظر آتی ہے ۔

بچھو کسی کو کاٹے کیڑا کسی کو گھورے
آنگن میں کنسلائی کونوں میں کنکھجورے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
اور ۔ ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں
ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائینچے چڑھے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سوال ۔ آپ سے ایک سوال یہ ہے ۔ ۔ ۔

جواب ۔ ۔ ۔ بات کاٹتے ہوئے ۔ ۔ ۔ ارے بھئی کیا ہم بیٹھے بس یہ سوال جواب ہی کرتے رہیں گے ۔ قیامت کے دن کا ریہرسل یہیں اسی وقت ہو جائے گا کیا ۔ ۔ نہیں صاحب ۔ ۔ ۔ افوہ افوہ ۔ بس اب ہم گھر جائیں گے ۔

سوال ۔ جوش صاحب ! صرف ایک سوال اور ہمارے تعلیم کے معیار کے متعلق کچھ فرمائیے ۔ ۔ ۔ ٹھیک ۔ ۔ جناب جہاں نفرت کی پکار پر لاکھوں انسان جمع ہوتے ہوں وہاں محبت کی دعوتِ مسلسل پر کوئی شخص کان نہیں دھرتا ۔ ۔ ۔

- - - - - - - - - -

جہاں مشائخ کے مزاروں پر گنبد تعمیر ہوتے ہوں اور خانماں برباد غریبوں کے سروں کو سائے سے محروم رکھا جاتا ہو ۔ اہل جہل محلوں میں رہتے ہوں اور آفتاب علم جوتیاں چٹخاتے گھومتے ہوں ، جہاں جنوں کی تاجپوشی اور عقل کی حجامت ہوتی ہو ، یونیورسٹیوں کی محراب کے نیچے عرس کا لوبان سلگ رہا ہو ۔ وہاں روشنی ، علم ، تعلیم ، شاعری سبحان اللہ . . . . ہماری دنیا جہالت کا پائے تخت ہے ۔ علم کا شمشان ہے ۔ اوہام و اساطیر کی راجدھانی ہے جن و پریوں کا مسکن ہے ۔ دیوتاؤں کا مولد ہے . . . . . ہر وقت ، ہر آن ، لاکھوں روحانی مرغے منڈلاتے رہتے ہیں . . . . علم کیا . . . ؟ عقل کیسی . . . . ؟

جوش صاحب . . . آپ کی زندگی میں تو سب کچھ ، حسن ، عزت ، شہرت دولت ہے ۔ پھر آپ زمانے سے کیوں خفا ہیں . . . .

ٹھیک . . . . جانور ہیں . . . بس اپنے چارے دانے کی فکر کریں ، دوسروں کی گھاس کاٹ لی . . . اور بتیر گئے . . . . معدہ آباد ہو گیا . . . . . خوب . . . .

اماں دکھ زندگی کے نس نس میں اس طرح سمویا ہوا ہے جیسے مارواڑی کی دلہن کے ہر پور میں چھلے . . . .

جوش صاحب . . . آپ کی ایوب خاں سے ملاقات ہوئی . . . تو کیا باتیں ہوئیں ؟ . . .

جواب . . . کہنے لگے . . . جوش صاحب ۔ آپ تو عالم ہیں . . . . میں نے کہا نہیں میں عالم ہوں . . . پھر بولے . . . یہ بتائیے سوشلزم سے کیونکر بچ سکتے ہیں . . . میں نے کہا گویا آپ یہ پوچھ رہے ہیں رحمت الٰہی سے کیسے بچا جا سکتا ہے . . . بادشاہ سچی بات سے گھوڑے

کی طرح ٹاپیں مارنے لگتا ہے . . . سو وہی ہوا !

جوش صاحب ! نور کی رفتار تیز ہے یا خیالات

نور کی رفتار جھکڑ ہے خیالات کی رفتار کے سامنے

جوش صاحب . . . ہم لوگوں کے لئے یعنی نئی نسل کے لئے آپ کا کیا پیغام ہے

بس یہی پیار کرنا ، پڑھو اور خوب پڑھو۔ ایک لمحے کے لئے بھی سائے میں نہ بیٹھنا۔ ورنہ دھوپ تمام عمر تعاقب کرے گی۔

جوش صاحب موتی بکھیر رہے تھے اساتذہ اور طلباء موتی چن رہے تھے اور ناز کر رہے تھے کہ ہم نے جوش کو دیکھا تھا . . . "

جوش صاحب کا گھر چونکہ میرے گھر سے بہت قریب تھا۔ اس لئے آنا جانا رہتا تھا۔ ایک دن علی الصبح ان کے گھر پہنچ گئی ۔ دیکھا جوش صاحب بڑا سا پائپ ہاتھ میں لئے باغ میں پانی دے رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر نگاہوں سے پیار کیا پھر کام میں محو ہو گئے . . . اوپر سے چچی کی آواز آئی " اے بس اب پانی دینا ختم بھی کرو" پودے جل جائیں گے . . . . انہہ ۔ تمہاری تو تیرہ سو سال سے پانی بند کرنے کی عادت ہے ۔ صاحب ہم تو ساقی ہیں۔ پیاسا کسی کو نہیں دیکھ سکتے . . . اوئی ۔ سحو تبرا شروع کر دیا . . . .

ارے یہ تبرا نہیں ہے۔ تاریخی حقائق بیان کر رہا ہوں . . . انہہ ہوں گے تاریخی . . . نہاؤ گے کب . . . بس جاتا ہوں . . . رام رام چھوم چھنا چھوم چھنا غرغرغر . . . اے ختم بھی کرو . . . کب تک کلیاں کرو گے۔ کلیاں نہیں کلیات کر رہا ہوں . . . ناشتہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر میں دیکھا میز پر بڑی چھوٹی منجھلی سنجھلی ہر قسم کی پتیلیاں رکھ دی گئیں۔ سجاد، سعیدہ، چچی سب نے اپنی پلیٹوں میں کھانا نکال کر کھانا شروع کر دیا۔ "ادھر لو گے" " اچھا دے دو"

ہم سے کبھی بی بی نانا سوہت ۔ اے بی بی تم تو کھاؤ ۔ نہیں میری طبیعت ٹھیک نہیں ” اے بی بی تم تو بس مارے نکھرن کے مری جات ہو مجرہ نکونا ہیں ، نجرہ نکونا ہیں . . . اوئی اے یہ کھانا کھا رہے ہو کہ نرت کر رہے ہو . . . نہیں بس نرت کسر رہے ہیں ۔ ” پچاس روپیوں کا جو حساب تم نے دیا اس میں ڈھائی روپے کم ہیں “ . . . ڈھائی کا ہم نے قلم خرید لیا . . . . . دیکھا . . . یہ کیوں ڈیڑھ روپے کا قلم بتایا تھا کہ لینا . . . یہ ہے فضول خرچی ۔ ہٹت . . . لڑی . . . . . . ۔ ناشتہ ہو رہا تھا کہ اچانک بی بی حیدر آباد سے آگئیں ۔ جوش صاحب نے گلے سے لگایا ۔ بہت دیر ابا کی باتیں ہوتی رہیں ۔ بی بی نے کہا جوش صاحب آپ سب کے بارے میں تو بتاتے ہیں بیوی و شوہر کے متعلق تو کچھ کہیے ۔

اماں ” بیوی فرنیچر ہے ۔ احساس ملکیت کی بنا پر ۔ گائے ہے کھونٹے میں بندی رہتی ہے ۔ بس چارہ دانہ ڈال دو . . . .

بیوی ہو یا محبوبہ . . . قرب مسلسل اور ہجر مسلسل دونوں قاطع محبت ہیں . . .

بس میانہ روی . . . محبت مابین ہجر و وصل رہتی ہے . . . . .

. . . بیوی اور شوہر کا تو رشتہ ہی کمینہ ہے ۔ “ . . . .

شوہروں کے بارے میں کیا خیال ہے ؟

دیکھیے کاظم بیٹھے ہیں یہ عابد ہیں . . . . اچھا بھئی . . . شوہر کی قسمیں تین ہیں . . . ایک انگریزی نسل کا گھوڑا ہوتا ہے اس کے منہ میں بٹ دی جاتی ہے تاکہ لگام کھنچی رہے ۔ لیکن وہ اتنا بدمعاش ہوتا ہے کہ بٹ کو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے کتنا ہی اچھا سوار کیوں نہ ہو اسے پٹخ دیتا ہے ۔ تھان پر کبھی نہیں ملتا ۔ بس سواریاں لیے گھومتا ہے وہکی چال خوب چلتا ہے ۔

دوسرا ۔ معمولی نسل کا ہوتا ہے ۔ ہلکی پھلکی چال چلتا ، چارہ دانہ کھاتا ۔ پھر

تھان پر واپس آجاتا ہے۔

تیسرا - خچر کی نسل کا ہوتا ہے - بس جب دیکھو تھان پر کھڑا - چارہ دانہ سامنے رکھا ہے منہ جھکا کر کھا لیا - پھر سواری کے انتظار میں کھڑا ہو گیا - - -

جوش صاحب - - آپ کس قسم کے - - - ارے جناب ہم تو انگریزی، اور عربی دونوں نسل سے تعلق رکھتے ہیں - آغا خان کے تھان کا گھوڑا - مجال ہے کہ کبھی جو تھان پر ملے ہوں - - - - - ائے کیا کہتے چلے جا رہے ہو - - - بجی دور سے بول رہی تھیں - ارے کچھ بھی نہیں - یہی کہہ رہے تھے کہ بیوی ہو تو بس تمہاری ایسی مادر صفات خوب ساتھ دیا - - - ہوں - - - نظم مکمل کر لی - - - - - ؟ ہاں ہو گئی مکمل - - - تو سناؤ - - جوش صاحب نے بجی کو نظم سنانا شروع کیا ویت نام پر لکھی ہے - - - ہاں ٹھیک ہے - - - چھپوا دو - - - مشاعرے کے پیسے مل گئے - - - ابھی نہیں - ائے جلدی کرو - لو سب نے شعر سن لیا پیسے نہیں دیئے بھئی ہو گا - - - سیٹھ تو نہیں ہیں ہم جو رو کر گڑی ہو - شاعر اعظم و اعظم کچھ نہیں ہو تمہاری قیمت ہی کچھ نہیں - - - - - -

بجی کے یہ الفاظ دیکھنے میں تو معمولی تھے لیکن تھے بہت معنی خیز میں اکثر اردو بورڈ جوش صاحب کے پاس جاتی - اور وہاں سے کتابیں لے آیا کرتی - ایک دن دیکھا جوش صاحب دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھے ہیں - ان کے کمرے میں سناٹا ہے - جوش صاحب - - آج آپ کے دفتر میں بہت سناٹا ہے - ہوں - عجیب مایوسی کے ساتھ مجھے دیکھا - - - میں خاموش ہو گئی - خاموشی کو توڑتے ہوئے میں نے پھر کہا - - جوش صاحب مجھے چند کتابوں کی ضرورت ہے آپ دلوا دیجئے - - - ٹھنڈی گہری سانس بھرتے ہوئے بولے - - نہیں صاحب ہم کسی لائق نہیں - - -

اب ہم کتابیں نہیں دلا سکتے، ہماری نوکری ختم کر دی گئی - - - یہ پرچہ

تم بھی پڑھ لو . . . . . اب تو رکشا کر لو . . . بس اب گھر چلیں . . . . . .

جب جمالیاتی تصورات سنگ تراشی میں ابھرے تو تاج محل بنا ۔ اربابِ مستانہ نے چھیڑا تو تان سین بنا ۔ تصویر میں نکھرا تو مونالیزا کی مسکراہٹ میں پھیلا . . . اور الفاظ کے پیکر میں ڈھلا تو غالب و جوش بن گیا ۔ حسن کی آتشیں فکر اور حسی لطافت کو پانے کے لئے کم دری نظر نہیں بلکہ قندیل تخیل ، طورِ در آغوش نگاہ اور گل ریزِ ذہن کی ضرورت ہے ۔

جوش اردو ادب میں میدانی درخت ہیں جس کی جڑیں زمین میں اور چوٹیاں فضاؤں میں ہیں جو صرصر و سموم سے روغن غذا حاصل کرتا اور سقراط کے سامنے اونچائی ، مضبوطی اور پاکیزگی کا نشان بنا کھڑا رہتا ہے جس کا ایندھن دیر تک جلتا اور زمانے کو لو دیتا ہے ۔ بت تراشی ہو یا سنگ تراشی ، قوتِ احساس کو سلب ہونے سے بچانے ، جراتِ اظہار کو جگانے ، پابندیوں کی زنجیریں توڑنے شخصی و اجتماعی آزادی کی تڑپ پیدا کرنے ۔ غم کی تلخی میں شہد کی شیرینی گھول دینے کی تمنا ہر تخلیق میں نظر آتی ہے ۔ گلستاں کو سنوارنے کے لئے فنکار کا کانٹوں سے الجھنا لازم ہے پھر مقدر در در کی ٹھوکریں ، غربت و افلاس کے مہیب سائے ۔

اسی جرم کی پاداش میں غالب کی نغمہ بار شخصیت ہمیشہ صورتِ گل پریشاں رہی ۔ ابتدائی زندگی کی چند روزہ ' فرصتِ گناہ ' کے بدلے زندگی کی سفاکیوں سے الجھتے " گناہ " کی لہروں میں تیرتے رہے ۔ افلاس تقدیر . . . بن گیا ۔

اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل نواب کلب علی خاں والیٔ ریاست رامپور کو ایک خط لکھا ۔ " آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانچ سو روپے مفتی جی تجہیز و تکفین کے لئے بھیجے ہیں ۔ . . .

فقیر کو بھی یہی توقع ہے کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہیں رہے گا ۔ ۔ ۔ آپ سے آخر میں ایسے تین التماسیں ہیں ۔ ۔ ۔ ۱۔ ایک ہزار روپے کا قرض رکھتا ہوں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے ۲۔ حسین علی کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے ۳۔ سو روپے مہینہ جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر حسین حیات قرار پائے ۔ ۔ ۔ خواہ میری زندگی میں خواہ میرے بعد اجرا پائیں ۔" خطوط مرتبہ غلام رسول مہر"۔ حالات کی سخت گیری غالب سے یہ لکھواتی لیکن خودداری وانا آڑے آکر یہ کہلاتی ۔ "تشبیب میں تو میں بھی اس مقام پر جہاں عرفی و انوری پہنچے ہوئے ہیں افتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں ۔ مگر مدح و ستائش میں مجھ سے ان کا ساتھ نہیں دیا جاتا ۔ ۔ ۔ !" یادگار غالب مولانا حالی " دوسرے مقام پر لکھا ۔ "بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دوں یہ میرے لئے ممکن نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میرے قصیدے دیکھو ۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر"

یادگار غالب صفحہ ۔ حالی ۔

غالب تمام زندگی عرضداشتیں لئے کلکتہ، لکھنؤ، دہلی، رام پور دربدر پھرتے رہے ۔ نااہل اہل ثروت ہر طرح کی ذلتیں دیتے رہے ۔ لیکن ذی شعور و بیدار مغز انسانوں کی کمی نہیں ۔ یوں بھی ہوا کہ خورشید نما فکر کو یہ کہنے والوں نے غالب کی خوب خوب پذیرائی بھی کی ۔ انہیں ماتھے کا جھومر بھی بنایا ۔ ان کی زندگی کے افسردہ لمحوں میں رنگینی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ۔ لیکن مزے کی بات ہے کہ غالب کا قلم تو زندگی کی مصیبتوں کا ذکر کرتا ہے لیکن دردست ، احباب کے خطوط میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں ملتا کہ انہوں نے غالب پر کیا کیا احسانات کئے اور ان کی پیشانی کو اپنے حضور بار بار جھکوانے پر کس طرح مجبور کیا ۔ تاکہ غالب کو کہیں کوتاہی دامن کی شکایت نہ ہو جائے ۔

جوش جب جس وقت پاکستان آئے تو ان کے سحر خیز قلم نے اندھیری رات میں چاہت کی روشنی پائی ۔ ان گنت محبت کے چھارُ دفانوس جلائے ۔ قوت

احساس کو ملبے ہونے سے بچایا اور جرأت اظہار کے علم گاڑے تخیل کی پاکیزگی لہجہ کی معصومیت، بیان کی شائستگی پرکھنے والوں نے ان کے حیدر ماہ وجود کو ہار پہنائے۔ گوہر شناسوں نے ماتھے کا تاج بنایا۔

لیکن جس وقت جہل افزا اور خیر بیزار طاقتوں کے جھکڑ چلے تو چولہا بھی بجھا۔ بیٹی کا ڈوپٹہ بھی بے رنگ ہوا، مکان، دکان، پاسپورٹ سب شعلوں کی لپیٹ میں آگیا ۔ نیو ٹاؤن کے چھوٹے سے فلیٹ سے قرضہ داروں نے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ بیوی بچے کہاں جائیں، کہاں سر چھپائیں ۔ مجھے جوش صاحب اپنی بیٹی سعیدہ کا ہم مرتبہ گردانتے تھے، میں نے ان کی بیوی کی آفسردگی بچوں کے آنسو، گھر سے بے گھر ہونا سب کچھ دیکھا۔ ایسے وقت میں روشن علی علی بھیم جی جو سر تا بہ قدم شبنم ہی شبنم ہیں دستگیری کے لئے آ پہنچے۔ گھر دیا۔ ممتاز حسین صاحب نے جوش کی "ردی" بیچ کر پیسے دیئے۔ منور عباس ایڈوکیٹ نے مقدمات کی پیروی کی۔ خورشید علی خاں اور راغب مرادآبادی نے، دامے درمے، ہر طرح ناز برداری کی۔ آغا حسن عابدی جو بزنس کی دنیا میں مضبوطی کا نشان اور عام لوگوں کے لئے تپتی زمین پر بارش بن کر برس رہے ہیں انھوں نے ہمیشہ جوش صاحب کی نہ صرف قدر و منزلت زبانی کی بلکہ ہر طرح ان کی زندگی میں چراغاں کرنے کی کوشش کی۔ مایۂ ناز شاعر و ادیب سید محمد عسکری جو جوش کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ ہر عنوان ان کے ساتھی بنے رہے۔

جوش صاحب اپنی خود داری اور انا کے اسیر تھے۔ تمام زندگی برطانوی سامراج جیسی طاقت سے ٹکرائے۔ نظام حیدرآباد کو مالی منفعت کے باوجود ٹھکرا کر چلے آئے۔ اردو زبان کی محبت میں پنڈت نہرو کی ناز برداریاں رد کر دیں۔ اور ہر مقام پر ہر سیاہی سے ٹکراتے رہے۔ ایسا شخص عزت نفس کو بیچ نہیں سکتا، خود داری کے دامن کو چھوڑ نہیں سکتا۔

غالب نے لکھا " وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں "، جوش صاحب نے بھی مختلف مقامات پر اپنی تنگی اور پریشاں حالی کا تذکرہ کیا ہے۔ " یادوں کی برات " میں ریاست حیدر آباد سے نکالے جانے کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی دوسرے اسی قسم کے حالات گذرے لیکن جوش صاحب کا قلم روشنی بکھیرتا تاریکی کاٹتا رہا۔ دوستوں نے یاری کا حق ادا کیا ہوگا لیکن کسی "تذکرے" میں اس مخصوص فرد کا یہ اعلان سننے میں نہیں آتا کہ میں نے اس طرح دستگیری کی . . . یہ سب اس لئے ہے کہ " حساب دوستاں در دل "
کسی عظیم المرتبت انسان کی پریشانی میں اس کے قدموں پر زر و جواہر نچھاور کرنا عین عبادت اور اس سے ہاتھ کھینچنا کفر ہے۔ عبادت خواہ کسی بھی عنوان سے ہو اس کی نمائش غیر اسلامی اور کفر ہے۔

اس لئے کہ جوش صاحب کوہ قاف پر طلوع ہونے والی سہانی صبح کا دوسرا نام تھے۔ ان کی ہستی چمکتے ہوئے رنگوں میں گندھی ہوئی تھی۔ محبت کی گاگریں چھلکاتی ہوئی ان کی فکر مربوط تھی۔ اعلیٰ تہذیبی اقدار کا تعطر تھی۔ ان کی زبان ترنم ریز آبشاروں کا مسکراتا تبسم تھی۔ دمکتا ہوا ذہن ہی چمکتا ہوا لفظ دے سکتا ہے۔ وہ سراپا غزل پیکر۔ مہکتا ہوا روپ تھے،

زندگی سچ ہے۔ شاعری زندگی کی آئینہ دار ہونا قدر ہے۔ سچ بولنا جوش صاحب کے نزدیک ذکر الٰہی تھا۔ اس لئے انہوں نے معاشرتی پابندیوں میں جکڑے رہنے کے باوجود شاعری کو سچ بولنا سکھایا۔ فن کی بنیاد صداقت پر رکھی۔ شعری بصیرت کے ساتھ شاعری کو اعلیٰ ترین منزل پر پہنچایا۔ جھوٹ، نفاق، توہم، تاریکی، وہم اور مذہب فروشی و ریاکاری کا پردہ چاک کیا۔

قوت احساس جو زر و جواہر کے پیچھے سلب ہو چکی تھی۔

اسے جرأت اظہار بخشی۔ باطل کے سامنے انکار کی منزل پہ ادب کو کھڑا کیا۔ سیاست سے ادب کی جھجک دور کی۔ حق کی روشنی دکھائی ، کیونکہ باطل سے ٹکرانا اور حق کا پرچم بلند کرنا ان کے نزدیک حج اکبر تھا۔

" غلامی کی حیات جاوداں" کے مقابلے میں " آزادی کا ایک لمحہ" پالینا ان کے لئے جہاد اکبر تھا۔ اس لئے وہ برطانوی سامراج کے سامنے جو سروں پہ گرم سلاخوں کے شامیانے تانے کھڑی تھی۔ استقامت کی معجزہ سامانی کے ساتھ ، ہندوستان کی تحریک آزادی کی علامت بن کر اس پہ تلوار کی کاٹ ، بجلی کی چمک اور شعلہ بے باک بن کر گرجتے اور برستے رہے۔ اور تحریک آزادی کو قریب لانے کے لئے انقلاب کا عہد آفریں پیغام قوم کو دیتے رہے۔

رنگ ونسل سے بلند ہوکر ساری انسانیت کے پیار کو سینے میں لے لینا ان کے لئے شب قدر کی بیداری تھی۔ اس لئے وہ ناتراشیدہ آرزوں ، نادمیدہ مسرتوں کا درد لے کر ان قوتوں کے خلاف جو زندگی کو۔ لکھ بنا دیتی ہیں نبرد آزما رہے۔ عقل کی بزرگی کے گیت گانا ان کے نزدیک تلاوت قرآن تھا۔ اس لئے شعور کو تصوف کی گھاٹی ، لوبان کے دھوئیں میں لپٹے ہوئے جذبے اور وجدان کی کہر میں دبی ہوئی عقل کو جگمگاتی فکر کا پرچم تھمایا۔

عقل سچ بولتی ہے۔ سچ صلیب پہ چڑھتا ہے۔ اس کی لاش پہ گھوڑے دوڑتے ہیں ، وہ پھانسی پہ لٹکتا ہے ، اس کے سینے کو آرے سے چیرا جاتا ہے ، وہ زہر کا جام پیتا ہے۔ عقل وشعور ، سچ کی یاداش میں بادِ صبا کو قید کیا گیا۔ چاندنی رات کو اسیر اور خوشبو کی اذانوں کو مقید کیا گیا۔ حافظ ، فردوسی کے مسکن تک پہنچنے کی آرزو پوری نہ ہوئی شیکسپیر کی سرزمین پہ جاکر اپنے کلام کا انگریزی میں ترجمہ کرانے کی حسرت کو داد نہیں ملی۔ ملیح آباد ان کی کروڑوں حسین آرزوؤں کا جھرمٹ تھا۔ اس کا دیدار اس کی نگاہوں کی تمنا

تھی ۔ وہ پوری نہیں ہوئی ۔ جوش صاحب نے رات لے کر سحر سجائی ۔ دل کا گلشن خون کرکے پاکستان کی تہذیب لہلہا دی گئی ۔ جوش صاحب کیکر کے درخت پر پڑی ہوئی انگور کی ایک ایسی بیل تھی جس کا ہر خوشہ زخمی تھا ۔ ہر خوشہ لہولہان تھا ۔ لیکن اسی لہو میں ڈوبے ہوئے قلم سے اس نے ادب کا ایک ایسا لافانی تاج محل تراشا جس پر زمانہ لاکھ پتھر برسائے لیکن اس کے خدوخال ہمیشہ لو دیتے رہیں گے ۔ اس کی بصیرت کا لہو نئے عہد کے شعور میں سرایت ہو کر چراغاں کرتا رہے گا ۔ نگہہ بلند ۔ اعلیٰ لفظ الفین ، فنی حسن کاری زمانے کو جھکا کر ہمیشہ خراج وصول کرتی رہے گی ۔

حضرت فیض احمد فیض

سپرو ہاؤس میں " افرو ایشین کمیٹی " کی جانب سے
فیض صاحب کے اعزاز میں جلسہ تھا۔ جلسے کے منتظمین میں حاجرہ آپا، پنڈت سندر لال
کے علاوہ بنے بھائی بھی تھے۔ جنہیں آج کے جلسہ میں سکریٹری کے فرائض انجام دینا تھے۔
" آج یہ کرسی تمہیں سنبھالنا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو بنے بھائی جھلاری آنکھوں، خوبصورت
مسکراہٹ، روشنی کی شطرنجی نما شخصیت کے ساتھ کھڑے ہم پر یوں حکم صادر کر رہے تھے
. . . . ارے ہم . . . ہمیں نہ کچھ آئے نہ جائے . . . ہم کیسے کچھ کہیں
گے . . . کرسی کے لئے تو لوگ سورج کو قتل کر دیتے ہیں . . .
بنے بھائی کس طرح فراخدلی کے ساتھ یہ 'نعمت' ہمیں عطا کر رہے ہیں۔ میں سوچنے
لگی عجیب بات ہے . . . لیکن بات عجیب تھی بھی نہیں . . . .
اس لئے کہ بعض ہستیاں کرسی کو زینت بخشتی ہیں . . . ایسی ہستیوں
کے لئے کرسی غیر اہم ہوتی ہے . . . اور بعض کو کرسی زینت بخشتی ہے . .
کرسی نشین ہوئے، گاڑی پر جھنڈا لہرایا . . . لیجئے بڑے آدمی ہو گئے . . .
جھنڈا گرا . . . کرسی ہٹی . . . کاغذی پیراہن بن گئے۔ بنے بھائی اپنی بڑائی
سے باخبر تھے . . . اس لئے انہوں نے کرسی کی ذمہ داری ہمیں سونپ دی اور اس
طرح کرسی نے ہمیں زینت بخشی۔

ٹھیک چار بجے کا گجر بجا۔ گھنٹیاں بجیں، فلک
شگاف نعرے لگے . . . . . . ایک شخص داخل ہوا۔ یوں محسوس ہوا جیسے
آدم کے شرافت نفس کا خوبصورت باب کھل گیا۔ بے رنگی میں رنگوں کی معطر وادی
کھل گئی . . . . چہرے پر ہلکا سا تبسم مچل رہا تھا۔ بناوٹی تبسم
نہیں جو اوپر سے چاندی کے ورق کی طرح چپکایا جاتا ہے۔ تہذیب کے بازار میں نقلی

تبسم خوب بکتا ہے ۔ انگریزی اسکولوں کی سوا گنتے ہی یہ تبسم مچلنے لگتا ہے ۔ ۔ ۔
فیض صاحب کے چہرے پر جو تبسم تھا اس میں اعتماد بھی تھا اور انسانوں سے پیار
بھی ۔ ۔ ۔ فیض صاحب کی آنکھیں بول رہی تھیں ۔ کنول کی طرح آب پر کھلی ہوئی
لیکن جڑوں میں درد لئے ، کربِ شب ٹوٹنے کا درد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ان کی آواز میں میٹھا سا درد اور دھیما پن تھا ، بلکہ سرگوشی کا سا انداز تھا ۔ ۔
جس کی وجہ سے ہر بات جو وہ کہہ رہے تھے راز معلوم ہو رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
راز جو کلی کی طرح خوبصورتی نکال رہی تھی ، غنچہ کی طرح چٹک رہی تھی اور پھول بن
کر فضا کو مہکا رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " امن و آزادی حسین و تابناک
تصورات ہیں ۔ ۔ ۔ ہر ذی شعور انسان کو ان سے پیار ہے ۔ ہم اور
آپ انہیں دو باتوں کے طالب ہیں ۔ ۔ ۔ چاہتے ہیں کہ ہمارے آپ کے رشتے
مضبوط و استوار ہوں ، نفرت کی دیواریں ڈھا دی جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
محبت ہی محبت ہو چاروں طرف ۔ ۔ ۔ ہمیں تو ہندوستان سے بہت پیار ہے
ہم تو روز آنا چاہتے ہیں ۔ ۔ ۔ لیکن بات یوں ہے کہ ہندوستان ہماری محبوبہ ہے
اور پاکستان بیوی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیوی محبوبہ کے پاس نہیں آنے دیتی ۔ ۔ "
جلسے کے ختم ہونیکے بعد بنے بھائی نے میرا تعارف کرایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ
ہماری طالب علم ہی نہیں ہماری پارٹی کی بہت نمایاں کارکن ہیں عالیہ ۔ ۔ فیض صاحب
نے دھیمے انداز میں اچھا کہا اور لوگوں کے ہجوم میں کھو گئے ۔ بس یہی ہماری پہلی
ملاقات تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وقت دبے پاؤں گذرنے لگا ۔ ۔ میں کسی نہ کسی
صورت پاکستان آگئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں آکر کچھ عرصے تک تو اجنبیت کا
احساس رہا ۔ ۔ ۔ جو فطری تھا لیکن پرانی یادوں کی ہوک بھی اٹھتی رہی ۔ ۔ ۔

لیکن تا بہ کے"۔۔ دوستوں کا حلقہ بنا، ڈاکٹر تنول، ایلیا بی بی، محمد علی صدیقی، سحر انصاری نصیر ترابی، فہمیدہ ریاض، سیدین شاکر، جان ایلیا نے ہماری خاطر تواضع کی، حمایت علی شاعر اور حبیب جالب نے پذیرائی کی۔ ڈاکٹر وحید الدین کی بیوی یعنی آپا اور ڈاکٹر سرور نے دلداری کی، دل ٹھکانے لگا، وحشت کم ہوئی۔

ڈاکٹر سرور کا گھر ادیبوں کا کاشانہ ہے۔ وہاں پھول والیوں کی سیر بھی ہوتی ہے اور ادیبوں کی پذیرائی بھی۔۔ فیض صاحب کے اعزاز میں ان کے گھر پر محفل تھی۔ ہجوم یاراں تھا، کھانے کے دوران سرور نے فیض صاحب سے یہ کہتے ہوئے میرا تعارف کرایا۔۔۔ یہ اپنے مہدی کی بہن عالیہ ہیں۔۔۔ ہوں۔۔ اچھا۔۔ مہدی سے تو دہلی میں ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔۔۔ بلکہ ساتھ ہی رہتا ہے۔۔۔ مگر آپ سے ملنا نہیں ہوا۔۔۔ جی شاید اس لئے کہ ہم لوگ تو یہاں آگئے ہیں۔۔۔ فیض صاحب ہم بھی آپ کو دعوت دینا چاہتے ہیں۔۔۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو۔۔۔۔
فیض صاحب نے دعوت قبول کی۔

ہمارے گھر پر فیض صاحب کی دعوت ہوئی۔ فیض صاحب بھی سر شام "طلوع" ہوئے۔ اس محفل میں اسرار و رموز آشنائے "فیض یعنی آفتاب احمد خاں بھی موجود تھے۔ جن کی ذات مختلف رنگوں میں گندی ہوئی ہے۔ ذہن مرتب۔ فکر میں بلاغت اور انداز میں نکھار ہے۔ ان کے علاوہ کنور ادریس اپنی بالغ نگہی کے ساتھ بنفس نفیس موجود تھے۔ یوسف جمال "شارح فیض" اپنی رندی و سرمستی۔ شعور کی نئی جہتیں کھولتے ہوئے تشریف فرما تھے مہدی صاحب "ساقی گری" کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ کلام کی چاندنی چھٹک رہی تھی۔ فضا میں اجالا ہی اجالا پھیل رہا تھا کہ اچانک ہنگامہ و شور برپا ہوا۔۔۔ اندر جا کر دیکھا تو ہمارے بھائی صاحب گھر والوں پر برس رہے تھے" صاحب" لاحول ولا قوۃ۔۔۔ عالیہ کا گھر اس لائق نہیں رہا کہ کوئی شریف انسان اس میں قدم رکھے۔۔۔ غضب خدا کا۔۔۔ خاندانی روایات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔۔۔

سید زادی کہلاتی ہیں ... اور گھر میں جام پر جام ٹکرائے جا رہے ہیں اور مہدی تو میری نظر میں بہت تھا سکین ... آج وہ بھی ... اسی رنگ میں ...

خوب بس ... جلدی چلو ... یہ ٹھہرنے کی جا نہیں ...

میری بہن مسز زیدی بھائی صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھیں ....

ارے تمام زندگی تو آپ "ولیس" اور "مالکولس" سنے بغیر سوئے نہیں، آنکھ کھلی تو "الیا بلاول" سے ناشتہ کیا ... جانکی بائی اور رسولن بائی کی ٹھمریوں سے کھانا ہضم کیا ... یہ مولوی کب سے ہو گئے ... اتنے کانٹے کہاں سے نکل آئے ... کہ سب کو چھیلے چھینکے دے رہے ہیں ...

بھائی صاحب کی بیٹیاں امن اور رقیہ سہمی ہوئی ایک طرف بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ سارے گھر پر سراسیمگی کا عالم طاری تھا ... حسبطین بھیا گو ان سے عمر میں بڑے تھے لیکن وہ خاموش بتے

میں گھبراہٹ کے عالم میں باہر گئی ... فیض صاحب اور بھائی جان مجھے دیکھتے ہی پریشان ہو گئے ..... کیا ہوا ... منہ بسورنے کی کیا ضرورت ہے ؟ ... بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا ؟ ..... وہ بھائی صاحب گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں ... آپ لوگوں کی وجہ سے ... کہتے ہیں یہ "سب" پینا قطعاً حرام ہے ... اور آپ لوگ تو ... فیض صاحب بہت ہی سکون کے عالم میں بیٹھے سب کچھ سنتے اور مسکراتے رہے ... پھر آہستہ سے بولے تو کیا ہوا ... ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے کبھی غم اور آنسو تو پینے جاتے ہیں یہ کہتے ہوئے اٹھے۔ بھائی صاحب کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے سنیئے "یہ تو عالیہ کی غلطی ہے ... مجھے پہلے سے بتایا ہی نہیں کہ آپ تشریف لا رہے ہیں ... ہم تو کسی کی عبادت میں کبھی مخل ہوتے ہی نہیں ... ہماری یہ عادت نہیں ...

تو پھر ۔ بھئی ۔ ۔ آپ ۔ ۔ ۔ کیوں؟ کسی کی ۔ یہ جملہ سنتے ہی بھائی صاحب ہنس پڑے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ وہ سب سے آگے بیٹھے فیض صاحب کے کلام پر داد دے رہے تھے ۔

پاکستان آنے کے بعد میں نے گانے کا خوب ہی خوب ریاض کیا ۔ امراؤ بندو خاں صاحب اور استاد قمر ہمارے استاد تھے ۔ گھر میں گلستاں کھلتا ۔ بی بی ہر مجلس کی روح رواں ہوتیں ۔ چاروں طرف بیلے کی کلیاں چٹکتیں ۔ گھر بقول فیض صاحب "گھر کیا ہے تمہارا ۔ ۔ یہ تو ۔ ۔ ۔ آرٹ گیلری ہے"۔ ہر طرف نقاشی اور مصوری کے نادر نمونے ، ہندوستان میں موسیقی کے جتنے ساز تھے وہ سب ہم نے اپنے گھر میں سجائے تھے ۔ فیض صاحب کے اعزاز میں خوب دعوتیں ہوتیں ، بی بی حیدرآباد سے آجاتیں ۔ محفل کی رونق دوآتشہ ہو جاتی ۔ میں ٹیڑھے ترچھے انداز میں غزلیں گاتی انہیں سناتی خوب ہی خوب داد ملتی ۔ ۔ ۔ ۔ ہر شب شبِ قدر ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ بس چراغاں ہی چراغاں ۔ ۔ ۔

لیکن اچانک دل کا چاند بجھ گیا ۔ "ہر شے میں کسی شے کی کمی کا" احساس ہونے لگا ۔ شفق کے لال ڈورے سیاہی میں ڈوب گئے ۔ ۔ ۔ ہر خوشی جیسے بلیڈ سے کاٹ دی گئی ۔ ۔ ۔ چاروں طرف درد کے بگولے ہی بگولے اٹھنے لگے ۔ بی بی نے درد کا الاؤ جلا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ڈسلواٹاؤن میں میری بڑی بہن کے گھر صفِ ماتم بچھی چاہنے والوں نے ہم سب کو اپنی بانہوں میں لے لیا ۔ فیض صاحب اور ایلیس بھی ، ذکیہ سرور کے ساتھ اس غم میں شریک ہوئے ۔ فیض صاحب نے گلے سے لگایا ۔ اس وقت مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھی میرے ساتھ آنسوؤں کے دریا میں ڈوب گئے ۔ ۔ وقت گذرتا گیا ۔ ۔ ۔ لیکن درد بڑھتا گیا ، میری طبعیت زیادہ خراب ہو گئی ۔

۔۔ تین مرتبہ مجھے Nervous break down ہوا ۱۰۰ور ۔
میں اسپتال میں داخل ہوگئی ۔ میری عزیز ترین دوست مہر حسن جو نفسیات کی ماہر ہے
میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی ۔ ۔ ۔ دیکھا فیض صاحب اسپتال میں چلے آرہے ہیں ۔ ۔ ۔
"بھئی یہ تمہارا بیمار رہنا تو اچھی بات نہیں ۔ ۔ ۔ کاظم سے مخاطب ہوکر بولے بھئی عالیہ
کی وجہ سے مہدی بھی پریشان ہیں ۔ ۔ ۔ یہ دیکھو ان کا خط ہے ۔ ۔ ۔ مجھے ان کے
خیال سے اتفاق ہے ۔ ۔ ۔ تم لوگوں کو کچھ عرصے کے لئے گھر بدل دینا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔
میرے گھر کے سامنے فلیٹ خالی ہے ۔ تم لوگ وہاں آجاؤ ۔ "

میرے گھر والوں کی بھی مرضی یہی تھی کہ میں گھر تبدیل
کردوں کیونکہ ہر ورق پر بی بی کا نام لکھا ہوا تھا ۔ سب کے اصرار پر ہم لوگ نئے فلیٹ
میں منتقل ہوگئے ۔ سنجیدہ باجی اس فلیٹ کی مالکہ تھیں ۔ انتہائی پرخلوص ، محبت سے
لبریز ۔ بچے اور ان کے شوہر سب بہت پیارے تھے ۔

گھر نزدیک ہونے کی وجہ سے فیض صاحب روزانہ میرے
گھر آتے ۔ مختلف طریقوں سے میرا بوجھ ہلکا کرتے ۔ ۔ ۔ مشفقانہ انداز میں سمجھاتے ۔ ۔
"یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ تم اداس ہو ۔ ۔ ۔ بھئی مگر یہ تو ایک قلبی واردات ہے
گذر جائے گی ، خود اعتمادی کو نہیں کھونا چاہیئے ۔ ۔ ۔ حال اور مستقبل دونوں
پر یقین ہونا لازمی ہے ۔ ۔ ۔ ہماری باتیں سمجھ میں آتی ہیں تمہارے ۔ ۔ ؟
یا نہیں ۔ ۔ ۔ ؟ ۔ ۔ ۔ کبھی آتے تو نیا مضمون ساتھ ہوتا ۔ ۔ دیکھو تمہیں بتائیں
زندگی کا سب سے بڑا مال یہ ہے کہ انسان کی ذات سے دوسروں کو خوشی ہو ۔ ۔ ۔
لیکن اب یہ ہو کیسے ؟ وہ اس طرح کہ اپنی ناخوشی کو قابو میں رکھے جو بہت مشکل کام
ہے ۔ ۔ ۔ لیکن ممکن ہے ۔ ۔ اور جب تم خوش نظر آؤ گی اسی وقت تو دوسروں
کو خوشی دے سکو گی ۔

کبھی کہتے . . . . دیکھو . . . . . بھئی اپنے کو
یاد کرنا تو ہوتا ہی ہے ۔ کیونکہ ان کی یاد تو زندگی کا حصہ بن جاتی ہے . . . .
یہی یادِ حقیقی شئے ہے ۔ تو بہتر طریقہ یہ ہے کہ جس کی یاد دل میں ہے ۔ اس کی
بہترین صفات مثبت اور موثر طریقے سے ہماری زندگی میں جگہ پائیں . . . .
بے مقصد دکھ نہیں اٹھانا چاہیئے . . . اس سے زندگی کی کرن بجھ جاتی ہے
اور یہ صحت اور ذہنی صحت دونوں کے لئے مضر ہے . . . کیا سمجھیں . . .
سمجھ گئیں یا نہیں . . . . ؟

کسی وقت اپنے گھر بلا بھیجتے ۔ اور یوں سمجھاتے
دیکھو ہم ایک بات بتائیں ، تمہارے رونے سے ہمیں بہت تکلیف ہوتی ہے . . .
غم کے سامنے سر جھکانا تو ٹھیک ہے ۔ ایسا ہوتا ہے ، البتہ برداشت کا جذبہ ہونا
چاہیئے . . . . لیکن دنیا والوں کے سامنے سر نہیں جھکنا چاہئیے
سر کسی سے فرو نہیں ہوتا . . . رونے میں احساسِ شکست کو دخل ہے ۔ یعنی یہ
دنیا تمہاری تمنا کے مطابق کیوں نہیں . . یعنی تمہاری تمنا زیادہ اہم ہے ۔
تمنا اس لئے اہم کہ ذات اہم ہے ۔ اگر تم ذات کی نفی کرو ۔ اجتماعی نگاہ سے غم دنیا کو
دیکھو تو پھر تمہارا رنجیدہ رہنا ختم ہو جائے گا . . . اچھا سنو آج ہم تمہیں
نسخہ کیمیا بتاتے ہیں ، خوش رہنے کا . . . ایک تو یہ کہ چھوٹی چھوٹی الجھنوں پہ
رنجیدہ ہونا چھوڑ دو . . ورنہ وہ عالمگیر نوعیت کی نظر آنے لگیں گی . . .
پھر اتنا پڑھا لکھا ہے وہ سب بھول جاؤ گی . . . دوسری بات یہ کہ خوش
رہنا سماجی ذمہ داری ہے . . . اس لئے تمہیں خوش رہنا چاہیئے . . .
اور تیسرے یہ کہ تم رنجیدہ اس لئے بھی ہو جاتی ہو جیسا تم بتاتی ہو کہ تمہیں نیکی کا جواب
نہیں ملتا ۔ بیٹا صحیح ہے ۔ تو بھئی جب تک نیکی کا نظام نہ آئے اس وقت

تک تو کچھ نیک ہوں گے اور کچھ بد ۔ ۔ ۔ یوں ہو گا ۔ ۔ ۔ اس لیے تم اپنی طرف سے نیکی کرتی رہو ، بلا معاوضہ بالکل بلا معاوضہ ، اچھا آج تم کو ایک اور بات بھی بتاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ چوتھی بات یہ کہ زیادہ رنج کرنے سے تمہاری لطافت طبع مرجھا جائے گی اور اگر اندر کی شگفتگی مرجھا جائے تو آدمی تمہاری زبان میں کھرادی ہوئی لکڑی بن جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ زندگی میں تلخیاں تو ہوتی ہی ہیں ۔ ۔ ۔ لیکن انہیں تلخیوں میں سے مسرت نکال لینا اصل کام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ غم سے بھی دل مصفا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ یہ ضرور ہے ۔ لیکن اسے محبت اور عشق سے دھونا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ بھئی مارکس کو تو مانتی ہو ، اس نے بھی عشق کیا ۔ ۔ انفرادی اور سماجی دونوں طرح کا ۔ ۔ ۔ یہ تو ہمارا بورژوا نظام ہے جو عشق نہیں کرنے دیتا ۔ ۔ ۔ اسے تو صرف نفرت سے محبت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس لیئے کہ وہ ہمیں اور تمہیں اور ہر انسان کو Commodity سمجھتا ہے ۔ سبھی گھر یہ بلا لیتے ۔ ۔ اچھا سنو آج نیا مضمون تمہیں پڑھائیں گے ۔ ۔ ۔ یعنی یہ کہ ہر انسان کا امتحان تو ہوتا ہی ہے ۔ ۔ ۔ تو وہ ہوا ، تمہارا بھی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارا بھی ۔ ۔ لیکن اس انفرادی رنج کو اگر اجتماعی جدوجہد میں ضم کر دو ۔ ۔ ۔ تو تمہارا غم ختم ہو جائے گا ۔ رنجیدہ ہونا خود پسندی ہے ۔ یعنی یہ کہ آدمی صرف اپنی ذات پر ہی ، تمہاری زبان میں ' لہالوٹ ' ، ہو جائے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے نتیجے میں وہ شکست محسوس کرتا ہے ۔ رنج کو ذاتی نظر سے دیکھنا بند کر دو ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہمارے ساتھ مل کر کام کرو ۔ ۔ ۔ سخت محنت کرو ۔ ۔ ۔ ایک مرتبہ عوامی تحریک کا حقیقی حصہ بن جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ جو ہمارا تمہارا سب کا فرض ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تم یہ تو سمجھتی ہو کہ درد کے چند لمحے اتنی بہت سی نعمتوں کے سامنے کیا قیمت رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ بھی نہیں ۔

. . . حق کی پرورش میں ہم جتنے بھی لمحے گزار دیں سمجھو وہی مال زندگی ہے۔ اس کے علاوہ انقلاب لانے کی جدوجہد میں ہمارا وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔۔ جدوجہد ہی زندگی ہے بس تم ہمارے ساتھ چلا کرو اور ہمارے کالج میں کام کیا کرو . . . .

، کھڈا ، کراچی کا بہت ہی پس ماندہ علاقہ ہے

انتہائی خستہ حال . . . ٹوٹی سڑکیں . . ساری زمین میں بس گڑھے ہی گڑھے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آج تک ہمارا کوئی ''لیڈر'' وہاں نہیں گیا ورنہ تھوڑی بہت لیپا پوتی تو ہو ہی جاتی . . . فیض صاحب اسی ، کھڈا کالج ، کے پرنسپل تھے .

عجیب حسرتناک فضا ، بیچارے طلباء انتہائی کسمپرسی کے عالم میں تھے . . . طلبا کی اکثریت بلوچ تھی۔ غربت اور درد ان کی متاعِ حیات تھیں . . پڑھنے لکھنے سے بیزاری بھی کیونکہ وہ تعلیمی فضا سے زیادہ مانوس نہیں تھے . . . .

لیکن فیض صاحب تھوڑے ہی عرصے میں اپنی شفقت اور مٹھاس کی بنا پر کالج کی فضا میں انقلاب لے آئے ۔ طلباء اور اساتذہ دونوں ہی میں نظم و ضبط پیدا ہوا ۔ پڑھنے اور پڑھانے سے لگاؤ پیدا ہوا ۔ کالج 'معجزہ سوزِ جگر' کی نمود سے اچھا خاصا فعال ادارہ بن گیا . . جیتا جاگتا ادارہ . . اس کالج میں فیض صاحب نے مجھے دو کام سپرد کئے ۔ اول طلباء کو اردو زبان پڑھانا . . خاصا وقت طلب کام تھا کیونکہ اردو سے دلچسپی طلباء میں ذرا واجبی ہی سی تھی . . . بہر حال اگر کھاد شفاف ہوا اور روشنی میسر آجائے تو ہماری مٹی واقعی بہت 'زرخیز' ہے . . . 'اردو دانی' کا جذبہ عام ہوا . . . طلباء میں فیض صاحب کے کلام کو پڑھنے کا بھی شوق بیدار ہوا . . . دوسرا کام تھا اردو ادب کی تاریخ کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنے کا۔ یہ کافی وقت طلب اور صبر آزما کام تھا . . . اپنے چند دوستوں کی ترغیب کے نتیجے میں فیض صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا تھا ۔ چنانچہ اس کام میں انہوں نے ہمیں بھی

شریک کیا ۔ آتش ، ناسخ ، مرزا سودا کے انتخاب کا کام میرے سپرد ہوا ۔ ۔ ۔
د سودا ، کا مطالعہ اور اس کا انتخاب کرتے وقت میں نے محسوس کیا کہ دوسرے اور شعرا ،
سے کہیں زیادہ فیض صاحب استعاروں اور تشبیہوں کے انتخاب میں بلکہ بہت حد تک
الفاظ کے استعمال میں بھی سودا سے غیر معمولی حد تک متاثر ہیں ۔

فیض صاحب کے ساتھ کام کرنے میں ایک عجیب قسم کی الہامی
کیفیت کا احساس ہوتا ۔ کنجلک پراگندگی ، جالے سب کٹ جاتے ۔ نظر صاف
منشرہ اور طاہر ہو جاتی ۔ انتخاب کرنے اور کرانے سے قبل اردو ادب کا پس منظر
ضرور واضح کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ بھئی دراصل بات یہ ہے کہ مسلمان جب اس
خطے میں آئے تو اپنے ساتھ اپنی فارسی زبان بھی ساتھ لائے چنانچہ یہاں کی مقامی لوبیوں
سے ان کا میل جول بڑھا ۔ ۔ ۔ ۔ ادب اب تک اپنی لوبیوں کو زیادہ اہمیت
دیتا تھا ۔ عوام کے لئے سب کچھ لکھا جاتا تھا ۔ ۔ ۔ لیکن فارسی کے الفاظ کی آمیزش
تو اب ضروری تھی ۔ چنانچہ کبیر ، تلسی داس اور سارنگ ڈار گو کہ وہ
اردو کی نمائندہ کتابیں تو نہیں لیکن اس عکر کی نمائندگی ضرور کرتی ہیں ۔
ان میں بیشتر ہندی ہی کی روایات ہیں عوام سے گفتگو کا انداز خوبصورت طریقے پر
ملتا ہے ۔

لیکن جس وقت حکمراں غالب آگئے تو پھر ملک کے
اصلی باشندوں کی نفسیات میں تغیر آنا لازمی ٹھہرا ۔ ۔ تین صورتیں بنیں ۔ اول
دیرینہ روایت کی سرگذشت بیان کرنا تاکہ ٹھکرائی ہوئی قومی خودداری کو سہارا ملے ۔
دوسرے چونکہ شکست کی بات تھی اس لئے اخلاق پر زور صرف ہوا ۔ ۔ ۔ دریہ کہنا
شروع کر دیا کہ زندگی چند روزہ ہے ۔ اس پر توجہ صرف کرنا بیکار ہے ۔ ۔ ۔
کیونکہ مادی حالات کو بدلنے کی قدرت اگر انسان کھو دے تو پھر یہی کیفیت ہوتی ہے

. . . یہ کیفیت اس وقت عام انسان کی تھی ۔ اور ادیب اس کی عکاسی کر رہا تھا
لیکن بنیادی بات یہ کہ جس وقت حکمران طبقہ کا غلبہ بڑھا تو ظاہر ہے کہ حاکم قوم کی زبان
قومی زبان پر چھا گئی . . . . اور ادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہونے لگے .
. . . . شعراء بیشتر دربار سے متعلق تھے . . . لہٰذا شاعری کی کہانی
کا لباس بھی بدلا . . . شاعری اب دربار کی رونق بڑھانے کی چیز بن گئی . . .
دربار کیا تھا . . سازشوں، سفاکیوں، رقیبوں کی کشمکش کی آماجگاہ چنانچہ
یہ قتل و غارت گری کے جتنے پہلو محبوب کے نام پر باندھے جاتے رہے وہ سب نواب
اور دربار کے قصے ہیں ۔ اردو کا پہلا تجرباتی دور دکن کی سرزمین پر ہوا . . . .
وہاں یہ کیفیت کم تھی، مغلیہ دور میں زیادہ ہوئی . . . چنانچہ جیسے جیسے حالات بدلتے
گئے شاعری کا دامن بھی وسیع ہوا . . . استعاروں میں نئی زندگی پیدا ہوئی . . .
اور سلسلہ یہاں تک پہنچا ۔ حالات کی سخت گیری کے سبب فیض صاحب اردو ادب کی تاریخ
کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کا کام اختتام تک نہیں پہنچا سکے جس کا انہیں بہت صدمہ تھا
ملازمتوں کے معاملے میں مجھ پر جو کچھ گذری تھی فیض صاحب
کو اس کا علم تھا ۔ ایک دن دیکھا کہ فیض صاحب ہنستے مسکراتے چلے آ رہے ہیں ۔ "بھئی ۔
. . . ہم نے تمہاری ملازمت کا انتظام کر دیا ۔ پی ۔ آئی ۔ اے گراؤنڈ ٹریننگ اسکول
میں بس تم جا کر پرنسپل سے مل لو ۔ " یہ وہاں کی میری ملازمت تھی اور میں نے
پڑھانے کا کام پھر سے شروع کر دیا ۔ گاڑی مجھے لینے تو آتی تھی ۔ لیکن گھر پہنچنے میں اس لئے
دیر ہو جاتی تھی . . فیض صاحب کبھی کاظم کے ہمراہ مجھے لینے آتے اور کبھی براہ راست
کھارادر کالج سے ہمارے اسکول آ جاتے ۔ اسکول کے طلباء ان کے گرد جمع ہو جاتے اور
مختلف مسائل پر بحث کا دفتر کھل جاتا . . . طلباء سے اکثر یہ بھی کہتے "بھئی ہمارا
اکاؤنٹ کھلا ہوا ہے . . . . آپ جا کر جو چاہیں کھا لیا کریں . . . . . .

واپسی پر رکشہ یا بس اسٹینڈ پر اگر ایسے افراد نظر آتے جو اپنی ضعیفی کے سبب چلنے سے معذور ہوتے، فیض صاحب بغیر کہے ان کے ایک اشارے پر انہیں گاڑی میں بٹھا لیتے اور جہاں تک وہ جاتے انہیں پہنچا دیا کرتے۔

فیض صاحب کا اصرار تھا کہ میں پہلے کی طرح سیاسی جد وجہد میں حصہ لینا شروع کردوں " اکثر کہا کرتے۔ . . . کیا تم انسانی تاریخ کے پر آشوب اور ہیجانی دور میں بھی " الگ تھلگ" رہنے کی پالیسی اپنائے رہو گی . . . مگر یہ بات "جرم" میں شمار کی جائے گی۔ " . . . یحییٰ خان کی حکومت کے خلاف اس زمانے میں عوامی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ ہر طرف جلسے ہر جانب جلوس کبھی یوم حسن نام منایا جاتا۔ کبھی ٹریڈ یونین کی طرف سے احتجاجی جلسے ہوتے . . . اساتذہ کی تحریک چلتی۔ اساتذہ نے اپنے مطالبات کے لیے، بھوک ہڑتال کی تھی، میں بھی اس میں شامل ہوئی۔ غرضیکہ ہر جد وجہد سے ہمارا رشتہ پھر سے بندھنا شروع ہو گیا۔ حمایت علی شاعر اس زمانے میں عوامی جد وجہد میں پیش پیش تھے۔ " حبیب جالب" میں اور فیض صاحب مختلف علاقوں کا طوفانی دورہ کرتے۔ صرف ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی نہیں مولانا بھاشانی کی کسان مزدور ریلی میں رنگا ماٹی بھی گئے۔ ایک مرتبہ مولانا صاحب شیخ مجیب، مسیح الدین ہم لوگ کشتی میں جا رہے تھے، اچانک کشتی الار ہونا شروع ہوئی انتقال پر ملال میں ذرا سی دیر باقی تھی۔ سب ہراساں و پریشان تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کشتی اب ڈوب جائے گی . . . لیکن فیض صاحب کے چہرے پر نہ تو پریشانی تھی اور نہ ہی گھبراہٹ۔ بس خاموش تھے۔ کاظم نے اپنے بازوں کی طاقت دکھائی اور ہم لوگوں کی نیا پار لگی . . . . . کاظم نے ناؤ سے اترتے ہوئے پوچھا . . فیض صاحب اگر یہ ناؤ پار نہ لگتی ؟ . . . اور کشتی بھنور ہی میں پڑی رہتی تو کیا ہوتا ؟ . . . کیا ہوتا بھئی . . . بھنور میں تو کشتی پھنستی ہی ہے . . . . . .

امتحان تو ہوتا ہی ہے . . . اور پھر اس میں سے نکل بھی آتی ہے . . . .

شخصیت میں کیسے ہی بھنور پڑیں لیکن صبر و تحمل اور برداشت کے پل صراط پر قدم میں کوئی لغزش نہیں ہونا چاہیئے بس . . .

بنگلہ دلکش کی واپسی پر دو واقعات بہت ہی دلچسپ ہوئے ۔ بیگم کرنل نذیر بہت بڑی فنکارہ تھیں ۔ فن کے پرستار وہاں جمع ہوتے ۔ اور بلوریں ذوق سماعت سیراب ہوتا . . ۔ فیض صاحب کو کلاسیکی موسیقی سے اچھا خاصا لگاؤ تھا ۔ چنانچہ ہماری فرمائش پر وہ بھی بیگم صاحبہ کے گھر گئے ۔ استاد امانت علی خاں کا گانا تھا میر رسول بخش تالپور ، حاکم علی زرداری ، ظفر حسین صاحب ، محترم ڈاڈی ، ان کی بیگم صاحبہ موجود تھے ۔ استاد امانت کے بعد سب نے استاد بڑے آغا سے فرمائش کی ۔ بڑے آغا صاحب نے پہلے تو انکار کیا لیکن جب اصرار بڑھتا گیا تو انہوں نے راگ الاپنا شروع کیا . . .

. . . بڑے آغا صاحب موسیقی کے جید عالم تھے ۔ گانا ختم کرنے کے بعد ظفر صاحب کی طرف سب سے پہلے مخاطب ہوئے ،، اے صاحبو بتایئے ، ہم نے راگ کون سا سنایا . . . .

ظفر صاحب نے کہنا شروع کیا . . . ،، جی نہیں،، . . . اچھا بیگم صاحبہ آپ بتلایئے

. . . حضور اتنے بڑے لوگوں کے سامنے میں کیا زبان کھولوں . . . .

اوروں سے دریافت فرمائیں . . . یہ دیکھیئے فیض صاحب تشریف رکھتے ہیں مسکراتے ہوئے بولیں

ہاں جناب تو ہم پر پہلی مرتبہ راز افشا ہوا . . کہ آپ بھی یعنی اس کوچے کے آشنا ہیں . .

فرمایئے ۔ ہم نے کیا سنایا . . کون سا راگ تھا . . . فیض صاحب . . . پہلے تو مسکرائے

پھر کہنے لگے . . . قبلہ معلوم ہوتا ہے . . . ،، کوئی اسلامی راگ ہے،، . . .

آغا صاحب پہلے تو مسکرائے پھر بڑی زور سے تان پورے پر ہاتھ مارا . . .

اور پھر انتہائی افسردگی کے ساتھ بولے . . . بیگم صاحبہ . . . ہمیں کیوں ذلیل کرایا گیا . . . یعنی . . . یعنی . . . یہ جاہلوں کے درمیان لاکر ہمیں کیوں بٹھا

دیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب دیکھئے کل بخاری صاحب اور فیض صاحب آپ بھی ہم سے یہ فرمائش کر رہے تھے کہ موسیقی کو اسلامی لباس پہنائیے ۔ میں نے کہا یہ کیونکر سے ممکن ہے قبلہ ۔ ۔ ۔ کہ میں یہ کہہ دوں کہ بجے دنتی حضرت داؤد کی ایجاد ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب اب ہم جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ اور یہ کہتے ہوئے ہم سب کو چھوڑ کے چلتے بنے ۔ فیض صاحب اس وقت رنگ پر تھے ۔ ۔ ۔ کہنے لگے بھئی ایک مرتبہ اسی قسم کا واقعہ اور بھی پیش آیا ۔ ۔ ۔ استاد بڑے غلام علی خاں ریاض کر رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیوی نے آواز دی ، آج عید کا دن ہے کچھ اور بھی ہو گا ۔ یا بس ایک ہی دھن بجتی رہے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سن لیا ۔ ۔ ۔ سن لیا ۔ ۔ ۔ ۔ عید تو چوڑے مناتے ہیں ۔ ہم شرفاء سے کیا مطلب ۔ ۔ ۔ اچھا خیر مجھ سے تو مطلب ہے ۔ ۔ جاؤ تیل لے کر آؤ ۔ ۔ ۔ چنانچہ یہ تعمیلِ حکم میں تیل لینے بازار گئے ۔ ۔ ۔ اس وقت استاد کوئی گت تیار کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ۔ ۔ ۔ تیل لے کر جیسے ہی دہلیز پر پہنچے ، تیل کا ڈبہ بڑی زور سے پھینکا ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ اب بن گئی گت ۔ ۔ ۔ سارا تیل زمین پر بہہ گیا ۔ ۔ ۔ ہائے میں مر گئی ، بیوی چیخنے لگی اور یہ اپنی گت بنواتے رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

محرم کی نویں تاریخ تھی ۔ ۔ ۔ میرے گھر پر رقعہ آیا ۔ عالیہ رات کو ہمیں کام ہے تم ضرور آنا ؟ ۔ ۔ ۔ میں گھر پہنچی ۔ ۔ دیکھا تو ایک جم غفیر تھا ٹیپ چل رہا تھا ۔ خوبصورت گانا سنا جا رہا تھا ۔ ۔ ۔ میں دو منٹ تو بیٹھی اس کے بعد میں نے ایک دم دروازے کی طرف رخ کیا ۔ ۔ ۔ فیض صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فوراً باہر آئے " ارے تم دعوت چھوڑ کر کیوں جا رہی ہو ۔ وجہ کیا ہوئی یہ تو بتاد کیا ہم لوگوں سے خفا ہو ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے کہا نہیں ۔ ۔ ۔ بات یہ ہے کہ ہم آج کی تاریخ گانا نہیں سنتے ۔ ۔ ۔ ۔ میرے اس جملے کو سنتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے ان پر بجلی گر پڑی ۔ ۔ ۔ ایلیس عالیہ کی خاطر کیا گانا بند کر دو گی ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ابلیس نے جذبات کا لحاظ کیا ۔ فوراً گانا بند کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مجھے شرمندگی بھی ہوئی ۔ بلا وجہ سب کا مزہ کرکرا کیا ۔ ۔ ۔ گانا بند ہونے کے بعد کھانا ہوا ۔ میں نے کہا کہ فیض صاحب آج کی رات تو ہم لوگ حضرت عباس کی درگاہ پر جاتے ہیں اس لئے زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہاں تو ٹھیک ہے ہم بھی چلیں گے ، دیکھیں گے ۔ ۔ ۔ تم وہاں کیا کرو گی ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کھانے کے بعد ہم لوگ درگاہ گئے ۔ ۔ ۔ فیض صاحب نے بھی علم کو بوسہ دیا ۔ مرثیے کے دو چار بند سنائے ۔ پھر کہنے لگے مرثیے تو ہمیں کہنا نہیں آتے بس تمہاری فرمائش پہ یہ لکھ ڈالا ہے کیا تم کو پسند ہے ؟ اب ہمارے اور تمہارے مسلک میں کیا فرق رہ گیا ؟

اچھا ایک واقعہ سنو! ایک مرتبہ ہم عراقی حکومت کے بلاوے پر بغداد گئے ۔ صدام حسین گورنر اور ہم حضرت عباس اور امام حسین کے روضے کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے ۔ ۔ ۔ جب ہم اترے تو دیکھا کہ صدام بغیر جوتا اتارے دراتہ چلے جا رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ہم تو بھئی ششدر رہ گئے ۔ ہم میں اس طرح وہاں اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی ۔ چنانچہ ہم نے جوتے اتارے ۔ سر جھکایا ۔ ۔ ۔ اندر گئے ہمارے اس انداز سے غالباً وہ بھی متاثر ہوئے ۔ ۔ ۔ پھر وہ بھی اسی طور گئے ۔ ۔ ۔

احترام جذبات ، شدت احساس کا نتیجہ ہے ۔

اچھا ایک اور بات تمہیں سنائیں ۔ لاہور میں مجلس تھی ہم بھی وہاں موجود تھے ۔ ہمارے نزدیک ایک اور بہت معقول سے صاحب بیٹھے ہوئے تھے ۔ مولوی صاحب حسب دستور دو گھنٹے لگاتار مجلس پڑھتے رہے ۔ ۔ ۔ جو صاحب میرے نزدیک بیٹھے تھے وہ تھک گئے ۔ ۔ ۔ تو بولے ۔ ۔ ۔ دیکھئے ہو فیض ۔ ۔ ۔ بکے چلا جا رہا ہے ۔ ۔ ۔ بکے چلا جا رہا ہے ۔ ۔ ۔ ارے اس سے پوچھو تو کیوں جان کھپا رہے ۔ ۔ ۔ بیٹھا دماغ کھا رہا ہے ۔ ۔ ۔ ارے وہ چچا زاد و پھوپھی زاد کھبائی کی

لڑائی تھی ۔ ۔ ۔ تو گھر کے معاملے میں بولنے والا کون ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

فیض صاحب کو عوامی تہذیب کی رنگا رنگی سے گہرا لگاؤ تھا ۔ چنانچہ انہیں کی کاوشوں اور جاں سوزی کے نتیجے میں اسلام آباد میں عوامی تہذیب کے فن پاروں کے تحفظ کے لئے "لوک ورثہ" نام کا ایک ادارہ قائم ہوا ۔ فیض صاحب چونکہ اس ادارہ کے سربراہ تھے اس لئے انہوں نے دیہات سے گانے منگوائے، اسے ریکارڈ کرایا ۔ گھریلو صنعتوں کے فروغ پر غیر معمولی توجہ دی ۔ ان کی نمائش کا بھی انتظام کیا ۔ لوک گیتوں کے سلسلے میں انہوں نے پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد ہی نہیں بلکہ یہ اہتمام بھی کیا کہ پوربی کے گیت بھی شامل کئے جائیں ۔ چنانچہ یہ کام انہوں نے میرے سپرد کیا ۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق جہاں تک ہو سکتا تھا اس کام میں ان کا ہاتھ بٹایا ۔ ہندوستان میں پی سی جوشی نے اس پر بہت کام کیا ہے ۔ وہ مواد بھی میں نے فراہم کیا ۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ فیض صاحب گو پوربی زبان بول تو نہیں سکتے تھے ۔ لیکن ایک ایک بول پر سو سو جان سے واری تھے ۔ یہ تین گیت ان کے پسندیدہ تھے جسے فرصت کے اوقات میں وہ اکثر سنا کرتے اور محظوظ ہوتے ۔

بھنویں توری چڑھی کمان بان ۔ ۔ نینا دونوں بان بان
موتیا سے منگیا سنواریں باری دھنیا
چوٹی گوہے ناگنی سمان بان ۔ ۔ ۔ ۔ بالا دونوں کان بان
میں تو سے پوچھوں لہوری ننندیا ۔
تورا بھیا ۔ ۔ ۔ ہائے تورا بھیا ۔ کاہے رسیان بان، کاہے کا
کہاں بان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گانا سننے کے بعد پوچھتے ۔ ۔ ۔ تم لوگوں کی زبان میں مٹھاس تو ہے لیکن تلفظ ذرا مشکل ہے ۔ اور معنی بھی ۔ ۔ ۔ اچھا یہ بتاؤ بان بان کیا ہوتا ہے ؟ ۔ ۔ ۔

رسیان تو خیر ٹھیک ہے۔۔ ۔ ۔ ۔ اسی طرح دوسرا پوربی گیت جسے میرے والد نے لکھا تھا انھوں نے خاص طور پر ریکارڈ کرایا تھا وہ یہ تھا۔

نین دوئی ہمرے تمری اور
تم تو چندا جگت اجیارے
ہم بن بیٹھے چکور۔ ۔ ۔ ۔ ہم بن بیٹھے چکور
ہمرے تو تہیں اک کے ہو مہدی
ہم جیسی تمرے کرور۔۔۔ نین دوئی ہمرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تیسرا گیت جس کی وہ ہمیشہ فرمائش کرتے اور سنتے وہ یہ تھا۔

بول بتیا لیو تنک ہم سے
بول بتیا لیو تنک ہم سے
کہیں پیروں میں ہری ہری چیریاں
کہیں سولہا سنگار ۔ کہیں سولہا سنگھار
دلہرا یہ پیروں میں ہری ہری چیریاں
راجہ یہ سولہا سنگھار
سوت ادیہ ہم لٹ بچھریے
تنک ہم سے ۔ ۔ ۔
آج کی رین تو رہ جاہو دلیا
رکھیوں میں چھتیاں لگائے
سبیرے چلے جائیو ۔ بجر کیے سوئے
بول بتیا لیو تنک ہم سے

ملک کے تہذیبی مسائل اور اس کے گوناگوں پہلوؤں پر فیض صاحب نے بہت

ہی فکر انگیز رپورٹ تیار کی، تاکہ اس کی روشنی میں تہذیبی بساط پر کام کیا جا سکے لیکن وہ سرد خانے کی نذر ہوئی۔

فکر و عمل کی دنیا اگر شاداب ہو اور زندگی سے اس کا رشتہ گندھا ہوا ہو تو قلم بھی گل کترتا ہے۔ زمانے سے کٹ کر قلم زنگ خوردہ اور مجہول ہو جاتا ہے، اپنی توانائی کھو دیتا ہے۔۔۔ میری طبیعت کچھ ایسی خراب ہو گئی تھی۔۔۔ قلم اٹھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اسی زمانے میں تیرگی کی قوتوں کے خلاف محنت کشوں کی تحریک میں درخشاں باب کھل رہے تھے۔ ادب کا رشتہ سماجی قوتوں سے ہے اس لئے دانشوروں کے بھی بہت بڑے اجتماعات ہو رہے تھے۔ پہلا جلسہ دانشوروں کا حیدرآباد میں ہوا۔ جس کے منتظمین مایۂ ناز ادیب مرزا عابد عباس اور جمال نقوی تھے پاکستان کے تمام دانشوروں نے اس میں شرکت کی، مقالے پڑھے گئے۔۔۔ اقتصادی سیاسی اور تہذیبی محرکات کا جائزہ لیا گیا، ادب میں نئے رجحانات پر بحث کی گئی۔ آزادی کے بعد ادب میں کئی رجحانات نمایاں ہوئے۔ ایک گروہ ان ادیبوں کا ہے جو زندگی کی اعلیٰ اقدار، حسن اور انسانیت کو سرمایہ داری کے شکنجے سے نکالنے میں قلم سے جہاد کرتے ہیں اور سچی آزادی، امن اور جمہوریت کی جانب اس کا رخ متعین کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں زندگی کو سنوارنے کی سچی لگن ہے۔ یہ پرانے ادب کی جمہوری روایات کو آگے بڑھاتے ہیں، اور ان عوامل کو روکنے میں کوشاں ہیں جو زندگی کے ارتقائی عمل کے راستے میں دیوار بنے کھڑے ہیں۔

دوسرے گروہ میں وہ ادیب شامل ہیں جو اپنی تحریروں میں ظلم پر پردہ ڈالتے ہیں۔ حکمرانوں کے حق میں رطب اللسان ہیں اور جمہوری عوامی تحریکوں کو ابھرنے سے روکتے ہیں۔

تیسرا گروہ "ادب برائے ادب" کا ہے۔ پرانی لکیر کا فقیر۔ وہ خیال

کے مقابلے میں حسنِ اسلوب کے شیدائی ہیں ۔ یہ معنیٰ اور اسلوب کو خانوں میں بانٹتے ہیں ۔ اور تمام عوامل کو مربوط انداز سے دیکھنے کے بجائے خالص ادب کا پرچار کرتے ہیں ۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ طبقاتی سماج میں کوئی بھی آرٹ خواہ خطاطی ہو نقاشی ، مصوری ہو یا شاعری طبقاتی جدوجہد کے اثر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ۔ یہ سب زہریلی قسم کی وطن دوستی کا اعلان کرتے ہیں ۔ یہ تمام محکوم قوموں کی آزادی دلانے کی راہ میں روڑا بنتے ہیں اور حکمراں طبقہ کو اس طرح تقویت بخشتے ہیں ۔

ادیبوں کا چوتھا گروہ "خالص اسلامی ادب" کا پرچاری ہے ۔ یہ انتہائی گھٹیا قسم کی رجعت پرستی کا شکار ہے ۔ کیونکہ مذہب رواداری ، انصاف ، محبت اور پیار سے گندھا ہوا ہے ۔ لیکن ان کی تحریریں حکمراں اور عوام میں منافرت اور طبقاتی جدوجہد پر پردہ ڈال کر عوامی طاقتوں کو ایک دوسرے سے لڑواتی ہیں یہ سرمایہ داری نظام کی تمام لعنتوں پر پردہ ڈال کر اپنے مفادات پر نگاہ رکھتے ہیں ۔ لوگوں کو صبر کی تلقین کرنا ، فقر و فاقے کی طرف ان کا رخِ حیات متعین کرنا ، قسمت پرستی کی لعنت کا وعظ دینا اور خود مسند نشینوں سے جڑ کر دادِ عیش دینا اسلام پرستی نہیں حکمراں پرستی ہے

غرضیکہ یہ وہ موضوعات تھے جن پر دانشوروں کے اجتماعات میں سیر حاصل بحث ہوئی ۔

جلسے کی صدارت مایۂ ناز ادیب و شاعر احمد ندیم قاسمی نے کی ۔ احمد ندیم قاسمی اردو ادب میں اونچائی اور مضبوطی کا نشان ہیں ۔ ان کی ذات ندی کی طرح گنگناتی دھیرے دھیرے بہتی ہے ۔ ہر لفظ روشن ہر سطر دھلی ہوئی ہر خیال پاکیزہ اور اچھوتا ہے ۔ انہوں نے ادب کی خدمت میں دلسوز جگر ، صرف کیا ہے ۔ اس لئے اس میں سوز بھی ہے اور تاثیر بھی ۔ قاسمی صاحب کے نزدیک ادب ایک ایسا ہتھیار ہے جو لطیف اثرات سے جذبات کو بیدار بھی کرتا ہے اور اس کی تطہیر بھی کرتا ہے ۔ ان کے نزدیک بہترین ادب وہی ہے جو جذبات و ادراک سے گذر کر اندر کی پیچیدہ ہمتوں کو بھی پالے اور کائنات سے رشتہ جوڑ لے ۔

دانشوروں کے اس جلسے کا دعوت نامہ ہمیں بھی دیا گیا تھا۔۔ لیکن مجھ میں لکھنے کی ذرا بھی سکت نہیں تھی۔ فیض صاحب کا لگاتار اصرار تھا کہ مجھے کنارہ کشی کی دنیا سے نکل کر تازہ ہوا میں آنا چاہیئے۔۔۔ بہر حال انہی کے اصرار پر میں نے صرف حیدرآباد ہی کے لئے نہیں بلکہ دانشوروں کے دوسرے جلسے جو کسٹرک ہال میں ہوا تھا اس کے لئے بھی مقالات لکھے۔ اس کے علاوہ "نیشنل کاؤنسل آف آرٹس" اور اکیڈمی آف لیٹرز کے تحت حضرت امیر خسرو پر بین الاقوامی مذاکرہ ہوا۔۔۔ دنیا کے ہر گوشے سے دانشور حضرات جمع ہوئے۔ مقالات پڑھے گئے۔ فکر انگیز تقاریر ہوئیں۔۔ فیض صاحب نے اس کانفرنس کے لئے مجھے موضوع دیا تھا Contribution of Hazrat Ameer Khusro to the music of the Sub continent

موضوع دیکھتے ہی میرے چھکے چھوٹ گئے۔ عقل چکرا گئی۔ لیکن فیض صاحب کا اصرار بڑھتا گیا۔۔ "بھئی قلم تو انسان کی آبرو ہے" یہ تو تم جانتی ہو۔۔۔ ہنستے ہوئے بولے، "قلم تو رسول کی آخری آرزو تھا، علی کا تمغۂ امتیاز تھا۔۔۔ تم تو ان باتوں کو مانتی ہو۔ قلم سے پرورشِ حق ضرور ہونا چاہیئے۔۔ تم لکھ سکتی ہو۔ بہر حال میں نے فیض صاحب کے حکم کی تعمیل میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا۔۔۔ مقالات معیاری تھے یا نہیں اس کا فیصلہ میرے بس میں نہیں۔۔۔ اتنا ضرور تھا کہ پڑھنے سے قبل فیض صاحب میرے مقالہ پر ایک نگاہ ضرور ڈالتے اور حسبِ ضرورت اس میں کمی بیشی بھی کرتے۔۔۔

فیض صاحب کو بچوں سے والہانہ پیار و محبت تھی

بیروت کے ہر خط میں کسی نہ کسی عنوان بچے کی کہانی ضرور ہوتی۔ بیروت سے تشریف لائے ہوئے تھے، باجی کے گھر قیام تھا، ایلیس ساتھ تھیں۔ اس زمانے میں کاظم کی ملازمت اسپین میں ہو گئی تھی۔ میں حال ہی میں وہاں سے واپس آئی تھی۔ تھوڑی دیر اسپین کی بات ہوتی رہی۔ پھر میں نے اپنے بھتیس کے بارے میں دریافت کیا جو غالباً کہیں ادھر

ادھر گم ہو گیا۔ بچوں کی بات چل نکلی۔ میں نے کہا فیض صاحب منے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ منے سے فیض صاحب کو غیر معمولی لگاؤ ہے۔ فوراً کہا ابھی ہم دیکھنے آئیں گے . . . دوسرے دن میں اور ابرار زیدی انہیں لینے گئے۔ اس وقت انہیں ہلکی سی حرارت تھی میں نے کہا فیض صاحب میں اسے کو خود آپ کے پاس لے آؤں گی آپ اس وقت نہ چلئے لیکن کسی طرح نہ مانے۔ گھر پہنچے، حقی صاحب، خواجہ ارشد، الیاس چوہدری، سلطانہ مہر اکرام مہدی، غرضیکہ کافی لوگ جمع تھے۔ فیض صاحب کا ہر لفظ حکمت کا باب کھول رہا تھا۔ انقلاب ایران پر بات چل نکلی فرمایا انقلاب ایران تاریخ کا عظیم ترین انقلاب ہے۔ یہ وہ انقلاب ہے جہاں نہتے انسانوں نے مسلم فوجی حکومت اور اس کے سرپرست سامراج کو چکنا چور کر دیا پھر خلیج کے اس قلعے میں جہاں امریکیوں نے سب کچھ داؤں پر لگا دیا تھا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ واقعی سامراج کے پاؤں مٹی کے ہوتے ہیں۔ اس کے اثرات کو روکنے کے لئے سعودی عرب، تمام امارات اور خود ہماری حکومت بھی سر توڑ کوشش کر رہی ہے۔ لیکن یہ تو جنگل کی آگ ہے۔ تخت کو تو بھی گرنا ہی ہے . . تاج کو تو اچھلنا ہے . . . انکل ہر انقلاب کے بارے میں آپ نے بہت کچھ لکھا لیکن اس وقت جس طرح عوام کو خون میں نہلایا جا رہا ہے اس پر تو آپ نے کچھ کہا ہی . . اسے کہہ رہا تھا اچھا تم یہ سمجھتے ہو . . . تو لو۔ پھر سنو . . .

ستم سکھلائے گا رسم وفا ایسے نہیں ہوتا — صنم دکھلائیں گے راہ خدا ایسے نہیں ہوتا
گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں — مرے قاتل حساب خوں بہا ایسے نہیں ہوتا
جہان دل میں کام آتی ہیں تدبیریں نہ تقریریں — یہاں پیمان تسلیم و رضا ایسے نہیں ہوتا
ہر اک شب ہر گھڑی گذرے قیامت یوں تو ہوتا ہے — مگر ہر صبح ہو روز جزا ایسے نہیں ہوتا

رواں ہے نبض دوراں گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

امن کا میرا دعوت نامہ جس طرح بھٹو صاحب کے غصے کی نذر ہوا۔ فیض صاحب کو نہ صرف اس کا علم تھا بلکہ افسوس بھی تھا۔۔۔ اکثر کہا کرتے "تم ہمارے ساتھ امن کانفرنس میں چلنا۔ اس میں کڑھنے کی کیا بات ہے" ایک دن بہت ہی خوشی کے عالم میں آئے۔ "لو بھئی تمہارا کام ہو گیا" ہنستے ہوئے بولے اپنے میاں کے گھر "مالمو"، جاؤ۔۔۔ وہیں تو تمہارے میاں ۷، ۸ سال کام کرتے رہے۔۔۔ اب اسٹاک ہوم میں کانفرنس ہے۔۔ تم اس میں شریک ہو سکو گی۔۔۔ میرے ہاتھ میں ٹکٹ دیا۔۔ میں بہت دیر خاموش کھڑی رہی۔۔۔ فیض صاحب کتنے بڑے انسان ہیں۔۔۔ یہ سوچنا مشکل ہو گیا۔

اسٹاک ہوم پھولوں سے بھرا آنگن ہے۔ کلیاں دفتر دفتر مہکتی، پھول گلشن گلشن کھلتے۔ پتی ہلکے ہلکے راز کھولتی ہے۔ سورج کی کرنوں کا چاروں طرف جال بنا ہوا ہے۔ گھاس ایسی جیسے پاؤں کے نیچے کسی نے غالیچے بچھا دئیے ہوں۔۔۔ یہاں انسانوں کے قدم زمین پر ہیں اور نگاہیں آسمان پر۔۔ سحر انگیز فضا، شفق نے ساری شراب غالباً اسی زمین پر انڈیل دی ہے۔ گل و گلزار وادیاں تتلی کی طرح چکنا مستقبل۔۔۔ نہ کانٹے، نہ خاردار جھاڑیاں۔۔ پہلے تو یہاں بھی نفرت، زرگری، سیاہی اور جہل کے بلوگے اٹھتے تھے لیکن اگر انسان سر جوڑ کر نہیں دل جوڑ کر زمین کو سنوارنے اور زندگی کو نکھارنے میں لگ جائے اور اسے یہ احساس دلا دیا جائے کہ یہ زمین، یہ کھیت، یہ فیکٹری یہ اسکول یہ سب تمہارے ہیں ان کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے تو پھر وہ انہیں اس طرح سینے سے لگا کر رکھتا ہے جیسے عورت اپنے پہلے پہلے کو۔۔۔۔۔

امن کانفرنس کا آغاز ہوا۔ پنڈال میں بڑے بڑے پوسٹر لگے تھے جن پر "امن" کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف بہت بڑا پوسٹر آویزاں تھا جس پر عظیم المرتبت "امن کے دوست سوویت یونین زندہ باد" لکھا ہوا تھا اور اسی جگہ

"لینن" ، "گورکی" اور "مایا کوفسکی" کی بہت بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔۔
یہ سب اس بات کا ثبوت تھیں کہ عالمگیر امن دوست ، جمہوری ، انقلابی تحریکیں کتنی عظیم ہیں۔

کانفرنس میں امریکہ ، برطانیہ ، جرمنی ، بلغاریہ ، رومانیہ پاکستان ہندوستان غرضیکہ تمام امن پسند ممالک کے نمائندے شریک ہوئے تھے سب سے پہلے مختلف مقامات کے امن کے رہنماؤں کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔۔

افریقہ کا عظیم رہبر پال رابسن کہہ رہا تھا "میں امن چاہتا ہوں ماں کے لئے ، اپنی بہن کے کنوارے خیالوں کے لئے ، اپنی بھائی کی محبوبہ کے لئے"۔۔
جنگ کے خوف سے انسانیت کے بال پکنے لگے ہیں۔۔۔ میں امن چاہتا ہوں اس نئے انسان کے لئے جس کی تخلیق اشتراکیت کے بغیر ممکن نہیں۔

تقریروں کا جھرنا بہہ رہا تھا۔ امن کے متوالے امن پر خوبصورت نظمیں ، خوبصورت تحریریں ، خوبصورت گیت ، خوبصورت تقریریں کر رہے تھے لاتعداد غم اور حسرتیں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر زندگی کے عظیم راگ کو ابھار رہی تھیں۔
جنگ کے لوہے میں جکڑی گلوگیر انسانیت آزاد ہوگی۔
آزادی نئے انسان کا مقدر ہے۔ بربریت ، فسطائیت کے تخت بیٹھ رہے ہیں۔۔۔
زمین میں گڑ چکے ہیں۔ راکھ کے بستر پہ ابدی نیند سو چکے ہیں۔۔۔ امن اپنی توانائی بکھیرے گی۔۔ عظیم امن کے راگ کو ابھارے گی۔

اب مائیک فیض صاحب کے سامنے تھا۔ ان پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔۔۔ ہر نگاہ مجسمہ محبت تھی "آج کل جنگ اور امن کے معنی بدل چکے ہیں۔ آج امن کے معنی ابن آدم کی بقا کے ہیں اور جنگ کے معنی فنا کے ہیں۔۔۔
انہی دو الفاظوں میں بقائے انسانیت کا دارومدار ہے۔۔ اگر عقل و سائنس

نے لاتعداد ذخیرے زمانے کے سامنے کھول کر رکھ دیئے ہیں ۔ ۔ تو کس لیئے ؟ کس کے واسطے ؟ صرف تخریب شکست و ریخت کے لیے یا اس لیئے کہ استحصال کی جگہ انصاف ، اجارہ داری کی جگہ برابری ، اور انفرادی خوشحالی کی جگہ اجتماعی خوشیوں کا باب کھلے ۔ ۔ ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر ملک بندوقیں ، گولہ بارود ، دوسرے ممالک پر قبضہ جمانے کی لعنت سے آزاد ہو کر زمین پر انسان کے لئے ایسا معاشرہ تخلیق کرے جہاں ہر انسان کو خوشی ملے پھر سب مل کر تسخیر کائنات کریں ۔ ۔ ۔ ہر طرف امن کا بول بالا ہو ۔ ۔ صرف پاکستان ہی نہیں ہر ملک کی بقا کے لئے امن لازمی ہے کیونکہ امن اگر شاعر کا قلم ہے تو مصور کا لوح قلم ہے ۔ دلہن کا آنچل ہے تو محبوبہ کا رخسار ہے ۔ ۔ ۔ ہم سب کو مل کر اس کی حفاظت کرنا ہے ۔ اگر امن نہ ہوگا تو دنیا بے برگ و بار بے ثمر ہوگی ۔ ۔ اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد بھی کرنا ضروری ہے غلامی کے خلاف اور دوسرے امن کی حفاظت بھی کرنا ہے کیونکہ دونوں جڑے ہوئے ہیں علیحدہ نہیں ۔

فیض صاحب کے ہر جملے پر بین الاقوامی شہرت یافتہ نگاہیں پھول برسا رہی تھیں کروڑوں انسانی معجزوں کے علمبردار بیسویں صدی کے انسان کو زمانہ دیکھ بھی رہا تھا اور حکمت کے موتی چن بھی رہا تھا ۔ ۔ ۔ ہماری زمین کتنی زرخیز ہے اور ہمارا شاعر کتنا عظیم ہے یہ سوچنا مشکل تھا ۔

اپنا کھانا ، اپنا گانا اور اپنی زبان غالباً یہ ہر انسان کی کمزوری ہے شاید اس لئے کہ یہ ان کے جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہیں ۔ برطانوی سامراج نے ہمیں دو تحفے دیئے ۔ " زبان و مذہب کی بنیاد پر لڑاؤ اور حکومت کرو " " عوام پر علم و حکمت کے باب بند رکھو " ۔ ہمارے حکمران ابھی تک ان اصولوں پر صدقِ دل سے کاربند ہیں ۔

قیام پاکستان کے بعد سندھ میں تمام تعلیمی اداروں میں ابتدا سے اردو اور سندھی دونوں زبانیں رائج تھیں ۔ اسی وجہ سے دونوں زبانوں کے بولنے والے آپس

میں شیر و شکر تھے ۔ یہی وہ بات ہے جو حکمراں طبقے میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی ۔ چنانچہ ایوب خاں نے اتحاد کے عمل کو پارہ پارہ کرنے کے لئے چال چلی ۵۸ء کے مارشل لا کے زمانے میں مقامی مارشل لا ، ایڈمنسٹریٹر نے سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پر زور ڈال کر نئے سندھیوں کے لئے سندھی لازمی زبان کے طور پر ختم کرادی ۔ ۵۸ء کے تعلیمی کمیشن نے اردو کو لازمی مضمون کے طور پر نصاب میں شامل کیا تھا ۔ اس طرح سندھ میں نئے سندھیوں کو تعلیمی اعتبار سے یہ رعایت ملی کہ وہ اپنی زبان پڑھتے رہے ۔ پرانے سندھیوں کو دوسری زبان پڑھنے میں تعلیمی اعتبار سے تکلیف پہنچائی گئی ۔

لسانی منافرت پھیلانے کا یہ عمل بھٹو صاحب کے زمانے میں بھی دہرایا گیا ۔ جس کے نتیجے میں آنگن کے چاند بجھے ۔ خون کی ہولی کھیلی گئی " اردو کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے اٹھے " قوالی گائی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ اردو زبان میری کمزوری ہے واقعات کی تہہ میں ڈوب کر حقائق کا پتہ معلوم کرنے کے بجائے میں جذباتی نعروں کی نذر ہو گئی ۔ حالانکہ یہ مسئلہ خالص تعلیمی اور معاشی تھا ۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ سندھی اور اردو دونوں کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم ملے اور ملازمتیں ملیں ۔ میں جذبات کی رو میں بہتی سندھیوں کے خلاف اردو زبان کی حمایت میں ڈیلیگیشن میں شریک ہوئی اور اسلام آباد میں بھٹو صاحب کی عدالت میں اپنا قضیہ پیش کیا ۔

فیض صاحب میرے اس انداز فکر سے ناراض نہیں بلکہ متفکر تھے ۔ اس موضوع پر میری ان سے گرما گرم بحث ہوتی جس کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا ۔ لیکن جب جذبات کا طوفان تھما ۔ سطح کو قرار آیا ۔ ۔ فیض صاحب کی فکر کی بلاغت کی چاندنی ذہن میں کھلی ، ہر کوچہ روشن ہوا ۔ ہر گلی آباد ہوئی ۔ اس زمانے میں میرپور خاص میں اردو زبان پر مذاکرہ ہوا ۔ فیض صاحب اصرار کے ساتھ مجھے اپنے ساتھ میرپور خاص کی اس کانفرنس میں لے گئے ، جس میں میں نے اردو زبان نہیں بلکہ زبان کے مسئلہ پر مقالہ لکھا اس

وقت میں اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ

پاکستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں وہ سب قومی زبانیں ہیں۔ زبان کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک افادی پہلو جو سماجی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ دوسرا اس کا ثقافتی پہلو، جو ان کی تہذیبی تاریخ کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔

جہاں تک سماجی ضرورت کے پہلو کا تعلق ہے اس میں جذبات کا عمل دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ یہاں گاڑی سندھی یا اردو طریقے سے نہیں چلتی۔ ۔ ۔ ۔ ثقافتی پہلو میں جذباتی پہلو ہے کیونکہ اس کا اپنی تاریخ بودوباش اور رہن سہن سے تعلق ہے۔

اب اگر کسی معاشرے میں ایک سے زائد زبانیں رائج ہوں جیسی کے دنیا کے اور حصوں میں رائج ہیں تو وہاں جہاں تک ریاستی کاروبار یا سماجی کاروبار کا تعلق ہے۔ اس کا فیصلہ افادی نقطۂ نظر سے ہوگا۔ سماج کا کاروبار زیادہ سے زیادہ مقبول عام و خاص زبان میں سہولت سے چلایا جا سکتا ہے۔ اس میں جذبات کو دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس میں تو دخل ہونا چاہیئے آبادی کی سہولت اور کاروبار کی سہولت کو اولیت حاصل ہونی چاہیئے۔

جہاں تک ثقافتی پہلو کا تعلق ہے وہاں ہر گروہ کو آزادی ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے کلچر کی حفاظت کرے۔ یہاں ہر کسی ایک گروہ کو یہ اجازت نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ دوسرے کا استحصال کرے۔ ایک چیز، اگر ایک گروہ کو عزیز ہے تو دوسرے کو یہ حق نہیں کہ وہ اسے اس سے محروم کردے چنانچہ ان دو تقاضوں کی مفاہمت یوں پیدا ہوتی ہے کہ جو بھی اقلیتی گروپ ہے جو بھی اس علاقہ کی قومی زبان ہے اس کی افادیت کو تسلیم کرے اور اپنے مفاد میں اس سے اتنی واقفیت پیدا کرے جیسی کہ زندگی کے کاروبار میں یا دوسری باتوں سے مفاہمت کرتے ہیں اور اکثریت کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی اقلیتوں کی

اور تہذیب کے مختلف اجزا جس میں زبان سب سے بڑا جزو ہے ۔ اس کی ترقی اور تحفظ اسکی ذمہ داری ہے ۔

چنانچہ جو منصفانہ معاشرے ہیں جہاں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ سرکاری زبان اور تعلیمی زبان اکثریت کی زبان ہوتی ہے لیکن اقلیتی زبان بولنے والوں کو یہ حق ہوتا ہے ریاست کی طرف سے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی زبان میں تعلیم دلوائیں ۔ اور ان کی زبان کو بھی قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے ۔

پاکستان میں صورت حال یہ ہے کہ اگر ہم انگریزی کو ترک کردیں تو صرف ایک زبان ہے جو کہ مختلف علاقائی رابطہ کا کام دے سکتی ہے وہ زبان اردو ہے اگر ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے تو وہ زبان صرف اردو ہے ۔ یہ اردو زبان کا ایک پہلو ہے ۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ مختلف علاقوں میں ایسے لوگ بستے ہیں جن کی زبان اردو ہے جو ان کی ثقافت اور معاشرے کے طرز فکر اور طرزِ احساس کی آئینہ دار ہے ۔ ان دو حیثیتوں کی وجہ سے اردو زبان کا مقام اس طرح متعین ہوتا ہے کہ جو کام ہم اس وقت انگریزی سے لے رہے ہیں وہ کام اردو سے لینا چاہئیے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اول تعلیمی نظام میں جو حیثیت انگریزی کو ہے وہ اردو کو دی جائے ۔ یعنی یہ کہ تمام صوبوں میں یہ لازمی زبان ہو جیسے آج کل انگریزی ہے دوسری بات یہ کہ بین الصوبائی کاروبار انگریزی کے بجائے اردو زبان میں کیا جائے تیسرا پہلو یہ ہے کہ جہاں جو لوگ بستے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے انہیں اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں فراہم کی جائیں لیکن جو بھی اس علاقہ کی زبان ہے وہ لازمی قرار دی جائے سندھی اسکولوں میں اردو زبان لازمی زبان ہوگی اور اردو اسکولوں میں سندھی زبان لازمی زبان قرار پائے گی ۔ ریاستی زبان سندھی ہوگی بین الریاستی زبان اردو ہوگی ۔ یہی صورتحال مختلف علاقوں میں ہونا چاہئیے ۔ منصفانہ طریقے پر یہی مسئلہ کا حل ہوسکتا ہے ۔ جبر سے مسئلہ بگڑتا ہے ۔ بنتا نہیں

محترم فیض احمد فیض، محترمہ نجمہ رضا، ممتاز ادیبہ مسز قیوم (آپا) محمد ذوالفقار
لندن میں اردو کانفرنس کے شرکاء کے ساتھ

میرے اس مقالے کو فیض صاحب نے پسند فرمایا۔ اردو زبان کے موضوع پہ دوسری کانفرنس لندن میں ہوئی جہاں مختلف علاقوں کے اساتذہ اور طلباء نے کثیر تعداد میں شرکت کی، بہترین تقاریر ہوئیں اور مقالے پڑھے گئے۔ برطانیہ میں اردو زبان کے متعلق مختلف پہلو سامنے آئے۔

اس کانفرنس میں مانچسٹر سے نجمہ رضا نے اپنے ڈیلیگیشن کے ہمراہ شرکت کی اور خوبصورت مقالہ پڑھا۔ نجمہ رضا مانچسٹر کی مایۂ ناز شخصیتوں میں سے ہیں۔ وہاں کے تعلیمی حلقوں میں ان کی بہت قدر و منزلت ہے۔ ریسرچ اسکالر ہیں، رقص میں مہارت رکھتی ہیں اور اسکول میں بچوں کو رقص کی تعلیم دیتی ہیں۔ کانفرنس کے زمانے میں فیض صاحب اپنے قریبی دوست افضل صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ مانچسٹر بھی تشریف لائے۔ یہیں نجمہ کے گھر قیام پذیر تھی۔ ان کے اعزاز میں حسب دستور مختلف عنوانات کی تقریبات ہوئیں۔ 'آپا' یہاں کی مقبول ترین ہستیوں میں سے ہیں۔ ادیبہ، شاعرہ، سراپا خلوص و محبت، انہوں نے اور انیس، ذوالفقار، اور محسن نے جو وہاں کے تعلیمی اور ثقافتی اداروں سے وابستہ ہیں انھوں نے فیض صاحب کے اعزاز میں بہت بڑی تقریبات منعقد کیں۔ انہوں نے برطانیہ میں اردو زبان اور اردو ادب کے مختلف گوشوں سے انہیں روشناس کرایا۔ فیض صاحب نے کلام سنانے کے علاوہ اور بہت سے موضوعات پر فکر انگیز گفتگو کی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس وقت ان پہ کہکشاں کی باراتیں اتر رہی تھیں۔ حسن کی باتیں بھی جادہ کی خوشبو بھی اور پھول کھلنے کے دن کی یاد بھی۔ سوالات کا جواب بہت جی لگا کر دیتے چلے جا رہے تھے۔

اچھا یہ بتائیے انسان میں گہرائی و گیرائی، بزرگی و برتری، دلربائی و دلداری کا سوتا پھوٹتا کہاں سے ہے؟ وہ کون سے اسباب و علل، واقعات و محرکات ہوتے ہیں جو انسان کو چاند بنا کر دل میں اتارتے ہیں، مہر جہانتاب بنا کر نگاہوں

کو خیرہ کر دیتے ہیں اور نورتن بنا کر وجود میں جڑ دیتے ہیں ؟

میرے اس سوال پر بھیرویں میں لگے کومل سروں میں ارتعاش پیدا ہوا ۔ ۔ ۔ بھئی بنیادی بات تو یہ ہے کہ انسان پہلے اپنی ذات میں اعلیٰ صفات یعنی حق گوئی، شجاعت، ایثار، تزکیہ نفس اور استقامت کی معجزہ سامانی کو پیدا کرے ۔ پھر ان صفات کو کسی اعلیٰ مقصد اور اعلیٰ نظریہ حیات کے تابع کرے اور اس طرح تربیت دے کہ وہ ذات کا حصہ بن جائیں ۔ انسان اپنی ان صفات اور نظریہ حیات کو اپنی ذات تک محدود نہ رکھے بلکہ ذات کو پس پشت ڈالے اور اسے انسانیت کی ملکیت بنا دے ۔ اس جہاد میں اگر اسے سیل آہن و آتش سے گذرنا پڑے تو گذر جائے لیکن یوں کہ پگھلے نہیں فولاد بن جائے ۔ فولاد نہیں سونا بن جائے، سونا نہیں کندن بن جائے اور پھر اس کندن کو ریزہ ریزہ کر کے یوں زمانے میں چھٹکا دے کہ اس کا ہر نقش قدم گلزار ارم اور اس کا نظریہ زمانے کی امانت بن جائے ۔

لیکن یہ نظریہ حیات ہے کیا ؟ سہرا آلبشار گرنے لگا ۔ ۔ ۔

بھئی بات تو یہ ہے کہ اظہار صداقت کلی طور پر ہو اس میں اعتدال نہ برتا جائے کیونکہ پھر وہ نصف صداقت ہوگی اور نصف حصہ بالائی قوتوں کے خوف کی وجہ سے پنہاں ہوگا ۔ ۔ ۔

دوسری بات یہ کہ حق زیب مسند ہو اور باطل بالائے دار ۔ ۔ ۔ اعلیٰ اخلاق قوانین اوپر سے تھوپے نہ جائیں بلکہ زندگی کی بنیادی سمتوں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اعلیٰ اقدار کے تحت رہنا ناگزیر ہو جائے ۔ ۔ ۔ ہمارے نظریے کی شریعت میں قوت احساس سلب کرنا اور جرأت اظہار پر قدغن لگانا حرام ہے اور انکار کی منزل پر آکر حق چھین لینا حلال ہے ۔ ۔ ۔

یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ اس نظریہ کا بنیادی پتھر امن ہے ۔ ۔ ۔ اور امن کا براہ راست تعلق حق و انصاف پر مبنی معاشرے سے ہے ۔ امن ماہیا کے گیتوں کا زیر و بم، کھیتوں سے اگلتا ہوا سونا ۔ اوزاروں کا چوٹ کھایا ہوا کندن بھی ہے اور غنچوں کی

قلقل مینیا، بہنوں کا غرور، کنوارے ہونٹوں کی لالی، اور ماں کے آنگن کی چاندنی بھی ہے گلستاں کی مانگ امن کی چاندی سے بھری رہے، اس کے لئے شور سلاسل کو کاٹنا تو ضروری ہے نا۔؟ ۔ ۔

یہاں تک تو بات واضح ہے یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا نظریہ امن و محبت و آزادی کی ڈھالی ہے۔ لیکن آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ سنگتراشی، نقاشی، مصوری و شاعری یا زندگی کے کسی بھی اور رخ میں ہم اسے اپنائیں کیسے ۔ ۔ ۔؟ بہت سے لوگ نظریے کی بات کرتے ہیں تو ہم اپنے اور غیر میں تمیز کیسے کریں؟

سونے کی پائل جھنک جھنک بجنے لگی ۔ ۔ ۔ بس یوں سمجھو کہ جیسے تم نے کوئی حسین خواب دیکھا۔ پھر اسے تصویر میں اتارا۔ پھر زمین میں اس کا بیج ڈالا۔ اب اسے زمین کی حرارت، ماں کی آسودہ آغوش ملی۔ کونپلیں پھوٹیں، شاخیں نکلیں وہ تناور درخت بن گیا تم نے اسے سینچا۔ ۔ لہو دیا، اب یہ درخت تمہارا ہے۔ جو بھی اس کی چھاؤں میں بیٹھا وہ اپنا ہو گیا۔ رنگ جلد بدن، رنگ سوز گلو، رنگ لخت جگر شیریں ہو یا تیز بس وہ تو اپنا ہے۔ شجر اور درد کا رشتہ تو جڑا ہوا ہے۔ یہ تو جانتی ہو شجر اور درد پھیلتا ہے۔ ۔ ۔ پھر جس نے اس درخت پر کلہاڑا چلانا چاہا، تو اس نے درد کے رشتوں کو کاٹنا چاہا سو وہ اپنا دشمن ہو گیا۔ کیونکہ اس درخت کی جڑیں تو ماں کی چھاتی سے دودھ پیتی ہیں اس لئے اس کی حفاظت میں جاں سپاری لازمی ہے تاکہ پیلے پھولوں کا بن گلرنگ ہو جائے ۔ ۔ خالی ہاتھ گل بداماں ہو جائیں، "پربت پربت" "ساگر ساگر" ہیرے جڑ جائیں اور یہ سب اس انسان ہی کے لئے ہے جو خبیر بھی ہے اور عظیم بھی ہے۔

انسان کی عظمت میں کھو جانا تو سب ہی نے متاع قرب الٰہی کرانا ہے

یہ بتائیے آپ کے انسان میں ایسے کون سے لعل ٹنکے ہیں جو دوسروں میں نہیں؟ مدہم سُروں نے پھر سے ساز چھیڑا ۔ ۔ ۔ بات یوں ہے کہ انسان تو ناپیدا کنار ہے۔ ایک انسان میر کا ہے جو

ہر آن زہرِ عشق پیتا ہے لیکن امید و رجا کا دامن نہیں چھوڑتا۔ دوسرا غالب کا ہے آفاق گیر، جلوہ سامانیوں کو لئے ہوئے ہے۔ انانیت اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ تیسرا نظیر اکبر آبادی کا ہے جو بھرپور سے زندگی کا رس نچوڑتا ہے، چوتھا اقبال کا مردِ کامل ہے یقین محکم، اور عزم پیہم لئے۔ "ستاروں سے آگے کے جہانوں" کا نگراں لیکن زمین پہ تاریکی نے جو ڈیرا ڈالا ہے۔ اسے کس طرح کاٹا جائے۔ سحر کی نمود کیسے ہو۔ ان محرکات اسباب و علل کا سراغ اسے کہیں نہیں ملتا۔ . . . لیکن ہمارا انسان تو شہت ہیل ہے حسن و رعنائی کا پرستار، امن کا جویا، کھیتوں میں گل کترتا، غزالان دشت کو وفا کے تحفے بھیجتا، ستاروں سے آنکھیں ملاتا ہے۔ وہ پدما ہے جو سورج کی وسعتوں کو پالیتا ہے وہ فوارہ ہے جو بلند ہو کر زمین سے اپنا رشتہ جوڑ لیتا ہے وہ نقاد آشنا ہے جو برف کے آنچل میں شفاف پانی دیکھتا ہے۔ یہی انسان عصری حقیقت ہے اور سچائی ہے۔ جس نے اس سچائی کو پالیا خسروی نے اس سے پناہ مانگی۔ سیاہ چٹانیں اس کوہ گراں، کے آگے ریخ گئیں۔ میدانِ کارزار میں بس وہی سرخرو ہوا۔

اچھا یہ بتائیے ایسی تناور شخصیت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اگر شعر روپ میں ڈھل جائے تو کیا ہو؟ . . . پنگھٹ پہ گھٹا جھوم کے برسی . . . بھئی ہوگا کیا بس یہی کہ ندی کا جل ترنگ لئے ایسا لہجہ تخلیق ہوگا جس پہ ایک طرف سودا غالب و اقبال کی روایات کی چھوٹ پڑ رہی ہوگی دوسری جانب مغرب کی غنائیت جلوہ گر ہوگی فلسفہ تفسیر کا عرفان لہجے کو جدید معنویت عطا کرے گا۔ ایسا لہجہ جس میں استقامت کی معجزہ سامانی جلوہ گر ہو۔ تہذیبی و کائناتی شعور پیوست ہوگا۔ تصورات و جذبات سے تپاتا ہو جام ارغواں کی طرح لیکن images میں ہم آہنگی ہو تاریخ کا جبر، جسم کا حسن، تیرگی کی سفاکی بیچ در بیچ زندگی کی خاموش ہتیں۔ کروڑوں تغیرات کو آغوش میں لئے ضبط و وقار کے ساتھ گندی ہوئی نظر آئیں۔ ایسا لہجہ ناہمواریوں

کے محرکات کا پتہ لگاتا ہے ۔ احساس وخیال کے نئے سانچوں میں عصری بصیرت کو سمیٹ لیتا ہے ۔ سنہری دھاگوں اور سیاہ دھاگوں کو غلط ملط ہونے سے بچا لیتا ہے ۔ یہ وہ لہجہ ہوتا ہے جو زندگی کو خانوں میں تقسیم نہیں کرتا ۔ کائنات کی ہر شے کو مربوط دیکھتا ہے ۔ درد کا ہر رشتہ مربوط ہے ہر زاویہ نگاہ لہجے میں یوں گھل جاتا ہے جیسے محبوب کا مدہم راز سینے میں جگہ پائے اور پھیل کر کروڑوں چہروں میں ڈھل جائے ۔ ۔ ۔ ایسے لہجے میں نہ مقصدِ فن کو مجروح کرتا ہے نا ضاعی مقصد کو ۔ دونوں کا حسین امتزاج اعلیٰ لہجے کی ضمانت ہے ایک بات اور بھی ہے ، لہجہ تیز رو نہ ہو نہ سہی ۔ منزل آشنا ضرور ہو ۔ راستے کے پیچ وخم سے آگاہ ہو یہی لہجہ پھر ایسی فضا تخلیق کرتا ہے جو ساکن کو متحرک ، متحرک کو متلاطم بنا دیتا ہے ۔ ترغیب و عمل کی لطیف راہ Luxury of images سے بناتا ہے لیکن ہاں یہ بھی سنو جب " آسمان کا لہو پی کے سیاہ رات چلتی ہے اور زہر کا رنگ ، لہو رنگ شب تار کا رنگ ، پھولوں کو لہولہان کر دیتا ہے ۔ تو پھر یہ لہجہ اپنے لہو میں سلگنے اور جلنے لگتا ہے ۔ " خونِ دل وحشی کا صلہ مانگنے کے لئے تڑپنے لگتا ہے ۔ دل کی پنہائیوں سے درد نکلنے کی راہ ڈھونڈنے لگتا ہے

چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
ایک کڑوا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگوفوں سے نکلتا ہی نہیں

لیکن ایک بات اور بتائیے ۔ اگر کڑی دھوپ پڑ رہی ہو ۔ دور دور تک سایہ نہ ہو ، تو پھر یہ لہجہ بدلنا چاہیئے یا نہیں ؟ ۔ ہاں بالکل بدلنا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کڑی دھوپ میں اسے تیغ آبدار بننا چاہیئے ۔ اس طرح کہ وہ دھوپ کو چاندنی میں اور جھکڑوں کو بادِ صبا میں بدل دے ۔

انکار میں یہ سب پہلو مضمر ہیں ۔

اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے

لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے ۔

پھر ٹھہر کر . . . . لیکن ہاں ۔ یہاں شرط اول یہ ہے کہ یہ لہجہ شوق شہادت میں ڈوبا ہوا اور موج خوں میں نہایا ہوا ہو ۔ اور ان گنت قطروں سے جڑا ہوا ہو ۔ جو قتل گاہوں سے اپنے علم چن کر عشاق کے قافلوں سے جا ملے ۔ یعنی اس طرح

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم

اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم

مختصر کر چلے درد کے فاصلے

اور پھر یہ لہجہ امن و آزادی کی عالمی تحریکوں سے رشتہ جوڑ لے ۔ جس کی راہ میں ریگ و بیاباں حائل نہیں ، جو ایشیا ، لاطینی امریکہ اور افریقہ کی تابندگی پر نثار ہو جائے " آجاؤ افریقہ "، کا لازم نامہ لکھ دے " جس نے دہول سے ماتھا اٹھالیا ہے اور غم کی چھال آنکھوں سے چھیل دی ہے " یہ لہجہ آزادی و حریت کے لہو سے ڈوبے ہوئے ہر علم کو اپنے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ہو کیونکہ بھئی بات یہ ہے کہ

ے میدان وفا دربار نہیں یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں

عاشق تو کسی کا نام نہیں کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

مگر ہاں . . . یہ سمجھ لو . . . درد کا یہ رشتہ صرف افریقہ یا امریکہ نہیں افق تا بافق پھیلا ہوا ہے ۔ ایران کے روشن ذہن ستاروں اور آفتابوں نے لہو کا جو یہ چمن بنایا ہے " جن کے میٹھے نور اور کڑوی آگ سے ظلم کی آندھی رات میں پھوٹا ۔ صبح بغاوت کا گلشن " تو اسے بھی متاع حیات سمجھنا چاہیئے ۔ اتھیل اور جولیس روزن برگ کی بے گناہی میں پھر یہ لہجہ خون دل

کو انگلیوں میں ڈبو کر یوں نکلے ۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے،
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے،

سنیئے ۔ ۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ یہ لہجہ ، یہ نظریہ حیات یہ فکر کا تانا بانا ، مایا کاؤسکی ، الیا ایرن برگ ، ناظم حکمت اور پیلو مزدا سے مل جاتا ہے ۔ صرف چلی ہی کو لے لیجیئے، تو ہاں ۔ ۔ ۔ بات بالکل صحیح ہے ۔ ۔ ۔ یعنی اس لہجہ کی گرمی اور فکر کی روشنی چلی کے سلے ہوئے ہونٹوں سے یقیناً رشتہ استوار کرتی ہے ۔ لیکن ایک بات ہے ۔ ۔ ۔ پیلو مزدا کے یہاں سادگی بہت ہے ۔ اور سادگی دراصل تلاش ، جستجو اور قربانی سے حاصل ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ دیکھو پھر زندگی سے چشمے پھوٹتے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے ۔

" اس شہر کے پاس ۔ جس میں وہ سب کچھ پوشیدہ ہے جس سے میں پیار کرتا ہوں روٹی نہیں رہی ، روشنی نہیں رہی ، منجمد سردی سر جھکائے جبر نیم کے پھولوں پہ بکھر رہی ہے ۔

رنج و غم میں ڈوبا ہوا زخمی شہر گولیوں سے چھلنی ہے جس پہ کانچ کے ریزے بکھرے ہوئے ہیں جو خون میں لتھڑا ہوا ہے ۔

آدھی رات کا شہر توپوں کا شہر ہے ۔ بہادروں کا شہر ہے ۔
میں تنہا نہیں تم میرے ساتھ ہو
میری محبت کی کرنیں جو چاہت سے مسرور ہیں ۔
اب میرے ہاتھ ایک نئی زندگی کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔

جو پھوٹ رہی ہے۔

میں تنہا نہیں تم میرے ساتھ ہو۔"

یہ باتیں جو آپ نے کہیں ہیں تو بہت خوبصورت۔ مگر صرف غم جہاں کی بات ہوئی، غم ذات، یعنی عشق و حسن نام کی کوئی بھی شے اس لہجے اور شخصیت میں نظر ہی نہیں آتی۔ عشق و حسن تو بنیادی حقیقتیں ہیں.. اس سے فنکار کا سروکار ہی نہیں کیا....؟

موتی پھر ٹوٹ کر برسنے لگے.. بھئی بات یہ ہے کہ ایک زمانے میں ہم عشق ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ رشید جہاں سے ہمارا جھگڑا ہی یہ تھا... ہم پہلے عشق اور انقلاب یعنی غم ذات اور غم دنیا کو علیحدہ سمجھتے تھے۔ اس لئے تو ہم نے یہ کہا تھا....

؎ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا !

یعنی ہم نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ انقلاب کے دوران محبت کرنا جرم ہے اور ہم محبت پہ نادم ہیں۔ حالانکہ محبت اور انقلاب دو متضاد باتیں نہیں۔ یہ محبت کا بھی غلط تصور ہے اور غم جہاں اور انقلاب کا بھی.... ترجیح کا سوال یہاں پیدا ہی نہیں ہوتا.... بات یہ ہے کہ سرمایہ داری و جاگیر دارانہ نظام عشق و محبت کے فطری بہاؤ کو روکتا ہے۔ اسے محبت ہے تو بس نفرت سے... نفرت انسان کی آزادی سے... نفرت تہذیبوں کے پھیلنے سے۔ نفرت انسان کی انسان سے محبت سے... بات دراصل یہ ہے کہ انقلاب کی جدوجہد محبت کے فطری رشتوں کے قیام کی جدوجہد ہے۔ جو سماجی کشاکش کا صحت بخش تصور ہے.. مخدوم کے یہاں یہ تصور بہت واضح ہے

؎ ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی
جیسے وہ خود ساتھ ہیں ان کی جوانی ساتھ ہے۔

اس طرح ہم نے بھی کہا..

ے اس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل

ہر داغ ہے اس دل پہ بجز داغِ ملامت

اور یوں دردِ حسن و عشق، حب الوطنی، انقلاب پسندی، محبوب سے لگاوٹ فکر و احساس کی روح بن جاتے ہیں جو نہاں خانۂ دل کو پری خانہ بنا دیتے ہیں۔ جس سے "دل کا ہر نگینہ درخشاں" ہو جاتا ہے۔

لیکن محبت و عشق و حسن یہ نئی چیزیں تو نہیں؟ صوفیوں کے یہاں کائنات کے ذرے ذرے سے محبت و عشق کی داستانیں ملتی ہیں۔ تو پھر اس میں جدت کہاں سے آئی؟ . . . بھول بہ سنے لگے . . . ہاں بھئی . . . لیکن بات یہ ہے کہ صوفی حضرات ہوں یا ان کے زیر اثر ادیب، یہ سب حسن و محبت کو ماورائی اور مجرد قدر تسلیم کرتے ہیں۔ جمالیاتی قدر کو مجرد ماننا، حسن کو مجرد تسلیم کرنا ہماری شریعت میں درست نہیں ہے . . بات یہ ہے کہ محبت، حسن اور عشق تمام اقدار سماجی اہمیت کے حامل ہیں۔ حسن کی میزان اس کی خلاقیت ہے۔ اس لئے کہ حسن و عشق سماجی اقدار ہیں اور ان سماجی اقدار پہ یقین فن کی معراج ہے۔

شمعِ نظر خیال کے انجم جگر کے داغ

جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں۔

لیکن یہ بتائیے۔ یہ تو ہوا حسن و عشق کا روشن پہلو . . . لیکن اگر کوئی۔ زندگی کے اس حسن کو زردیوں کا بن بنا دے تو پھر کیا کرنا چاہیئے۔ . . . ؟

نرم ندی کی رو تیز ہوئی۔ یہاں دو باتیں ہیں، ایک تو حسن و محبت کا ایک مثبت پہلو ہے جو ہم نے بتایا . . دوسرا ہے منفی پہلو . . یعنی جو حسن کو خراب کرے، محبت کی تقدیس کو پامال کرے۔ تو یہاں یہ ہونا چاہیئے کہ اول تو فنکار مضراب کی اس جھنکار کو سنے جو ابھی چھیڑی نہیں گئی ہے۔ ان دھڑکنوں کو سنے جنہوں نے ابھی دھڑکنا نہیں شروع کیا ہے۔ آنسوؤں کے

دائروں میں اس موتی کو دیکھئے جو "قطرہ سے گہر" بننے کی منزل پر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جبل سوز اور نفرت افروز قوتوں کو جو "متاع لوح و قلم" چھین لیتی ہیں . . . . . . جسم کو ریزہ ریزہ کرتی ہیں اور آزادی فکر و نظر کو پا بجولاں کرتی ہیں۔ ان کے خلاف عملی جدوجہد میں شامل ہونا چاہئے، کیونکہ فنکار کا مقدر صرف "مشاہدہ" نہیں "مجاہدہ" بھی ہے۔ عوامی جدوجہد سے رشتہ جوڑ کر انسان حقیقی معنی میں علم و آگہی اور ادراک سے مزین اور پیمبر۔ نگہی سے یوں سرفراز ہوتا ہے۔

سنو کہ ہم بے زبان و بے کس
بشیر بھی ہیں نذیر بھی ہیں
سنو کہ اس حرف لم یزل کے
ہمیں ہیں ہمیں بندگان بےبس
علیم بھی ہیں خبیر بھی ہیں
سر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فرد عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جم سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے — کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی — یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شور محشر — یہیں پہ روز حساب ہوگا

اور ہاں . . . یہ یاد رکھو حق و باطل کی جنگ میں تاریخی فریضہ "کارخانوں کے بھوکے جیالے" "نائب اللہ فی الارض دہقاں" "افسردہ کلرک" "کتاب و قلم کے" پاسبانوں کو ادا کرنا ہے۔ کیونکہ یہی لوگ تو زندگی کی سچائی ہیں۔ حقیقت کی کان ہیں۔ ان کی زندگی چینی کے برتنوں کی طرح خوبصورت نہیں بلکہ مٹی کے برتنوں کی طرح

میلی نا صاف ہے، لیکن زندگی کی تخلیق تو یہی کرتے ہیں ۔ یہ حیات کی للکار ہیں جو ان شعور کے مالک تو ہیں نا . . . .

انہیں یہ علم ہے کہ

الم نصیبوں ، جگر فگاروں
کی صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں یہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں یہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں یہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

اچھا یہ بتائیے کیا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اسی لہجے کا چاند ہے جو آج اردو غزل میں جھلک رہا ہے ... اور کیا اعلیٰ شاعری کی یہ پہچان نہیں ہے کہ اس کی عطر بیز فکر اپنے عہد کی دانش میں چاندی کے طرح حل ہوگئی ہو ...؟ شبنمی ہونٹوں سے موتی برسنے لگے ... بات یہ ہے بھئی کہ جو فنکار بھی نصف نہیں بلکہ کلی صداقت پر ایمان رکھتا ہے وہ اسی فکر کا شیدائی ہے جس کے ہم سب ہیں اسلئے "از دل خیزد" کی منزل آنا ضروری ہے دوسری بات یہ کہ

گلشن سجانے اور اس میں صوت ہزار کا موسم دیکھنے کی آرزو ہماری طرح انہیں بھی ہے سب اسی گلشن کے پرستار ہیں جو ہمارا محبوب ہے ہماری روح کی شفق، سینے کا سحر اور پیشانی کا مہتاب ہے۔ اس میں ہم سب کو " باد نو بہاری کو چلتے دیکھنے کی تمنا ہے . . .

یہی تو وہ قرض ہے جسے خونِ جگر دیکر ہم نے اتارنے کی کوشش کی ۔ اور بھی یہی وہ جرم تھا جس کی پاداش میں ہم کٹہرے میں کھڑے ہوئے۔ طوق و سلاسل میں مسلسل ہوئے " دلیس بہ دلیس پھرے ماراکی منزل سہ رہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر مطعون ہوئے۔ اپنے ہی گھر کے اخبارات کا ہدف ملامت بنے۔ گل و گلزار دیکھنے کی تمنا میں جھاڑ جھنکاڑ سے الجھائے گئے۔ لیکن ہم نے کیا دیا اور کیا نہیں۔ ۔ یہ فیصلہ اور محاکمہ کرنا تو تاریخ کا کام ہے مگر یہ ضرور ہے کہ ہم نے ایک ایک قطرۂ خوں چمن بندی گلشن میں صرف کیا . . . لیکن فیض صاحب آج آپ کا محبوب گلشن مقتل ہے۔ بے مہار ناقے نے اپنی مجموعی طاقت کے نشے میں کلیوں کو روند دیا ہے۔ طور در آغوش غنچوں کی ہنسی چھین لی ہے "مہتاب کی چاندنی لہو ہے" خورشید کا کندن لہو ہے "صبح کا ہنستا لہو ہے" ہر بن مو میں درد ہے . . . درد کی پشت بلی ہے ہر سانس گراں بار پکار رہی ہے۔ وہ تو ہمارا ہمدم و دمساز تھا۔ کشتۂ ناحق کا وکیل تھا تپتے ہونٹوں کے لیے آبِ حیات تھا۔ چلچلاتی دھوپ کے لئے چاندنی تھا۔ اس کی دہلیز پر انسان سر جھکا کر جاتا تھا لیکن واپس سر اٹھا کر ہوتا تھا۔ وہ تو آنسوؤں کے دائروں میں موتی کی دکان تھا۔ پیلے پھولوں کے بن میں ہری شاخ تھا . . . آج تو چاروں طرف آنسو ہی آنسو ہیں۔ پانی ہی پانی ہے۔ قطرے ہی قطرے ہیں . . بکھرے ہوئے . . ٹوٹے ہوئے قطرے۔ ان گنت قطرے جو بحرِ ذخار میں ضم ہونے کے لئے بے تاب ہیں . . .

آج تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اندھیرا چراغ ڈھونڈ رہا ہے۔ چراغ تو بہت دور ہے۔ لیکن چراغ سے روشنی تو پھیل رہی ہے۔ قرمزی، سنہری، گلناری روشنی، روشنی کا سیلاب عہد کی دانش میں لہو کی حرارت بن کر کروٹیں لے رہا ہے۔ یاقوتی الفاظ مرمٹے

کر ابھر رہے ہیں اور اپنے حسن کا خراج زمانے کو جھکا کر وصول کر رہے ہیں۔

کب تمہارے لہو کے دریدہ علم
فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
از کراں تا کراں کب تمہارے قدم
لے کے اٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم
جس میں دھل جائے گا آج کے دن کا غم
سارے درد و الم سارے جور و ستم
دور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی لو
آج کے دن نہ پوچھو میرے دوستو

اور زمانے کو یوں نوید سحر دے رہے ہیں۔

غرورِ سروِ سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیِ چمن تھے عروجِ سرو سمن سے پہلے

خطیب عالم اسلام حضرت علامہ رشید ترابی

حضرت علامہ رشید ترابی

تہذیب و تمدن کی طرح مذہب کی کہانی بھی ارتقا پذیر ہے۔ ہر عہد میں انسان نے اپنے محدود عقل و شعور کے مطابق مذہب وضع کیا اور خدا کی پرستش کی۔ حالات کے اعتبار سے ہیت میں فرق آتا رہا۔ مواد بھی تبدیل ہوا۔ لیکن ایک بات جو ہر جگہ نظر آئی وہ یہ کہ مذہب نوع انسانی سے نفرت نہیں بلکہ محبت کا پیغام دیتا رہا۔

اسلام پیار کی غذا، رواداری کا پیکر، اخلاق کا علم اور اپنے عہد کے تمدن کا مرقع بن کر آیا، اس نے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر زندگی کو نئے معنی عطا کیے اور ذہن انسانی کو کروڑوں پہلوؤں سے مزین کیا۔ حال میں سیراب کیا مستقبل کی راہوں میں چراغاں کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

محرم کا زمانہ تھا۔ نشتر پارک میں انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ شیعہ سنی ہندو مسلمان ہر قسم کی موج شیر و شکر تھی۔ سامنے خطیب عالم اسلام علامہ رشید ترابی زیب منبر تھے۔ عالیہ پیکر، بلوط درخت کی طرح مضبوط، آسمان کی مانند بلند فکر، روشنی سے بھری کٹیلی آنکھیں۔ آنکھیں جو سمگوں ابر پارے کو دیکھ سکتی تھیں، خزاں شناسا تھیں، آنسوؤں اور دکھوں کے ذخیرہ کو تھاہ چکی تھیں۔ قاتل و مسیح کو پہچانتی تھیں، لہو کی حرارت کو سمجھتی تھیں، بے نور کہرے میں درد کی جلوہ نشانیوں کو دیکھ چکی تھیں، جو کرب و بلا رحیات میں "کرب و بلا" کی قیمت سمجھتی تھیں۔ کرب و بلا جو ان کے نزدیک چھپتی ہوئی جرارت اظہار دینے، زر و جواہر کے نیچے دبی ہوئی اور غصب شدہ قوتِ احساس کو واپس دلانے کا نام تھا۔ "کربلا" کی انہیں جبل سوز اور فکر انگیز اداؤں کی تشریح علامہ رشید ترابی کر رہے تھے۔۔۔ بلوریں ذوقِ سماعت رکھنے والوں کی گودیاں بھری جا رہی تھیں۔ دماغ کی وادیاں پُر ہو رہی تھیں۔

مجلس ختم ہوئی، مجمع علامہ صاحب کے ساتھ ساتھ

تھوڑی دور تک چلتا رہا۔ سرمئی رنگ کی چھوٹی سی گاڑی میں علامہ صاحب بیٹھ گئے۔ ہم لوگ چونکہ علامہ صاحب کے مہمان تھے۔ آگے ابا بیٹھ گئے اور پیچھے کی نشست پہ امی ، بی بی اور میں بیٹھ گئی۔ راستے میں علامہ صاحب میرے والد عسکری صاحب سے مخاطب ہو کر انکی میرانیس پر تقریر کی داد دیتے رہے ، میں نے درمیان میں بات کاٹتے ہوئے کہا " علامہ صاحب آپ کے اس جملے پر تقریر ختم ہے " " آج دسویں محرم ہے حسین تنہا ہیں ،، آپ کے اس جملے پر مجھے میرانیس کا یہ مصرعہ یاد آگیا

" آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے "

علامہ صاحب نے خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اور ابا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے یقیناً یہ آپکی بیٹی ہے۔ یہ پہلی ملاقات تھی جو علامہ صاحب سے ہوئی۔

ایک دن میں بس کے انتظار میں بس اسٹینڈ پر رومال بچھائے بیٹھی مونگ پھلیاں کھا رہی تھی۔ بی بی بھی ساتھ تھیں۔ سرمئی رنگ کی گاڑی رکی دیکھا سامنے علامہ صاحب کھڑے ہیں۔ " یہ آپ لوگ یہاں کیا کر رہی ہیں . . . . . . "

یہاں تو سب سے زیادہ قیمتی وقت بس اسٹینڈ کی نذر ہوتا ہے۔ وزیروں کے پاس تو گاڑیاں ہیں . . . انہیں ہماری تکلیف اور وقت کے زیاں سے کیا بحث . . . سایہ تک تو ہے نہیں . اچھا بھئی آپ کی تقریر ختم ہو گئی ؟ آپ تو موڑ نشین ہیں اور یہ دیکھئے ہم بس کے انتظار میں . . . . . بس آئیے بیٹھ جائیے گھر چلتے ہیں . . . .

ہم گھر پہنچے ، انہوں نے ابا سے ساری روئداد بیان کی . . . . . .

پھر ٹھہر کر مخصوص مدہم لہجے میں فرمایا . . . عسکری صاحب اگر آپ رضامند ہوں تو عالیہ کو میلان یونیورسٹی بھجوا دوں ۔ یہ اسکالر شپ میرے ہاتھ میں ہے . . . . .

ہاں خیال تو بہت اچھا ہے . . . لیکن یہ تو انڈین نیشنل ہے . . . .

اس سے فرق نہیں پڑے گا . . . میں سب انتظام کرا دوں گا . . .

ابا نیم راضی ہو گئے۔ ٹھہر کر بولے ۔ لیکن اگر یوں ہو کہ میں بھی کچھ دنوں کے لیے اسکے ساتھ جاؤں تو غالباً بہتر ہو گا۔ کیونکہ پھر ٹھہر کر بولے، ابھی تو اس نے ہائی اسکول ہی کیا ہے۔ ۔ ۔ ابھی کچی ہے۔ علامہ صاحب ابا کی نظر فوراً بھانپ گئے۔ تمسخر آمیز لہجے میں امی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے "آپ ہی کیا عسکری صاحب والدہ کو بھی ساتھ جانا چاہیئے کیا خیال ہے۔؟ ۔ لیکن والدین کی شمولیت کے ساتھ "ایسا وظیفہ" غالباً ابھی "ایجاد" نہیں ہوا ہے۔

علامہ صاحب کا گھر دانش محل تھا۔ ہر کمرے میں مختلف النوع شاعر و ادیب نظر آرہے تھے، غم کے جزیرے میں محصور لیکن اجالا بکھیرتے ہوئے ــــ قمر جلالوی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر یوں تو جیبلوں میں کیلیں ٹھونکتے لیکن علامہ کی مسند پر جگہ پاتے ۔ معذور سیدہ بیباں گھر کی رونق بنتی، مائیہ ناز سوز خوان آبا ذلفقی، مرثیہ خوان معشوق علی خاں دل میں جگہ پاتے سحر آفریں ماحول سے ان فنکاروں کی زندگی میں سیک گھنٹیاں بجتیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"دست کرم" علامہ کو نوازتا اور وہ بخشندہ مہربان بن کر ہر دامنِ دل پسارنے والے کو بھر دیتے۔ ہر انسان ان کے پاس بیٹھ کر برسوں کے دکھ کی تپش بھول جاتا۔

معشوق علی خاں صاحب سوز خوانی کے تاجدار تھے۔ تری آواز مکہ و مدینہ کی منزل پر تھی۔ علامہ صاحب کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ ابا کے اعزاز میں ان کی سوز خوانی کی محفل منعقد ہوئی۔ ممتاز و مائیہ ناز مصور صادقین کے والد سبطین صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ سبطین صاحب حسن و مروت کا نادر خزینہ تھے۔ آواز کھرا کا یا دل کٹی کر جتی مرتی۔ ان کے اس سوز پر محفل تڑپ گئی۔

زہرا کی طرح صاحبِ توقیر ہیں زینب
بنت شہہ کونین کی تصویر ہیں زینب
پروردۂ گہوارۂ تطہیر ہیں زینب
ہمشیر حسن خواہر شبیر ہیں زینب

تمثیل نہیں ہے کوئی عالی نسبی کی
بیٹی ہے علی کی تو نواسی ہے نبی کی

اسی محفل میں مایۂ ناز ریڈیو پروڈیوسر زاہد نقوی نے نغمگی میں ڈوب کر یہ سوز سنایا، جسے علامہ صاحب نے بے پناہ سراہا۔

کیسی بانوس سیس نواؤں کہاں موراسیاں تو میکا لبار گئے
موری ناؤ بھنور بیچ ڈار دیہو اور آپن نیا اتار گئیو . . .
میں تو دودھن دھار نہائے لیئی میں تو پوتن بھاگ سہائے لیئی
میں تو لاکھ سنگار بنائے لیئی مورا سایئں سنگار اجار گیو

آبادنقوی، صاحب کی سوز خوانی نے ہر دل میں عقیدت کی آگ روشن کی چشموں کی صورت مصرعوں کو بہایا۔ آواز کے جنار کھڑے کئے . . . . .

سنگیں دلاں کہ سبطِ نبی را بہ کیں کشند
دعوئے دیں کنند خدا وندِ دیں کشند
قراں کنند حفظ و طٰہٰ کشند بہ تیغ
یاسیں کنند حرز و امام مبیں کشند

اس کے بعد اقبال کا کلام والہانہ انداز میں سنایا

آں امام عاشقاں پورِ بتول
سروِ آزادِ دلبستانِ رسول
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیِ ذبحِ عظیم آمد پسر
چوں خلافت رشتہ از قراں گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت
بر زمینِ کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

سوز کے پیرائے میں آباد نقوی صاحب کلام اقبال پڑھ رہے تھے۔ مجمع پر وجد طاری تھا۔ سوچیئے ذرا... "جس سرزمین پر علامہ اقبال جیسا مفکر یوں نذرانہ اہل بیت اطہار کے حضور پیش کرے۔ وہاں کی زمین کو سنی و شیعہ کی محبت کا گلستاں بننا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ سوز خوانی بھی عجیب وغریب فن ہے... محرم کے زمانے میں بڑے فنکار عقیدتاً گانے سے پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ وہ دس یا چالیس دن سوز کے ذریعے عقیدت کے گہر پیش کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام سوز راگ راگنیوں میں بندھے ہوئے ہیں۔" علامہ صاحب سوز خوانی کی تشریح موسیقی کے حوالے سے کر رہے تھے۔ عسکری صاحب... میں نے بہت کوشش کے بعد سوز خوانی کی مجالس بھی قائم کی ہیں۔ تاکہ نئی نسل اس فن سے بہرہ ور ہو اور اس صنف کو صحیح خطوط پر آگے بڑھائے۔ میں علامہ کی گفتگو سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی علم خطابت جمالیات کا یقیناً حصہ ہے۔ جمالیاتی حس سے مبرا شاید کوئی انسان بڑا خطیب نہیں ہو سکتا۔

علامہ صاحب کے یہاں دعوتیں بڑی پرتکلف ہوتیں۔

دعوت میں ذوالفقار علی بخاری، فیض صاحب، جوش صاحب، مدعو تھے۔ ہم لوگوں کو بھی یاد فرمایا گیا جس وقت میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے ان کی نگاہ میری گھسی ہوئی چپل پر پڑی۔ پھر سر سے پیر تک دیکھا۔ اتفاق ایسا کہ قمیض میں پیوند لگا ہوا تھا...

فرمایا... شوہر نامدار کہاں ہیں... علامہ صاحب وہ گاڑی پارک کرنے گئے ہیں... ہوں، ویسے کام کیا کر رہے ہیں...

وہی اچھی بڑی سی مل لگانے کا ارادہ ہے... اچھا مسکراتے ہوئے. فرمایا ہاں... خیر۔ امارت تو سر سے پیر تک برس رہی ہے...

. . . . . **تھوڑی دیر بعد** . . . فیض صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا . . . . . . ارے صاحب ان کا عجیب حال ہے ، ایک دن میرے پاس ٹیلی فون آیا . . سنیئے " علامہ صاحب آپ تو دعوتِ فکر دیتے ہیں ہم دعوتِ طعام دینا چاہتے ہیں ۔ آپ تشریف لائیے . . . . . میں شامت اعمال گھر پہنچا ۔ " اس زمانے میں شوہر بیوی کی ناز برادری میں گھر تعمیر کر رہے تھے . . . بہر حال پتھروں پر چٹائی بچھا کر ہماری پذیرائی ہوئی . . . . خیر یہاں تک تو ٹھیک تھا آگے سنیئے دیکھتا ہوں کہ ایک ڈبے میں بندو خاں کے یہاں کا " تکہ " لئے چلی آرہی ہیں . . . . . یہ آپ کی دعوت ہے ۔ کھائیے . . . اللہ اللہ مذاق سب سے بڑا یہ کہ ندامت یا شرمندگی کچھ بھی نہیں . . . فرماتی ہیں ۔ پسند آیا ۔ علامہ صاحب بہت مشکل سے تیار کرایا ہے ۔

پھر بغیر کسی تکلف کے بولیں سنیئے علامہ صاحب آپ منبر پر بیٹھ کر جناب زینب کا حال بیان کرتے ہیں ان کے قصیدے پڑھتے ہیں ۔ ان کی شجاعت اور بہادری کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ دربار شام میں انہوں نے خطبے دیئے اسے سناتے ہیں اور ہم لوگوں کو پردے میں بند کر دیتے ہیں ۔ یہ کیوں ؟ . . . . .

مدینے مکے میں عورت و مرد ساتھ طواف کرتے ہیں ۔ ایران ، عراق میں عورت و مرد ساتھ مجالس میں بیٹھتے ہیں . . . . . یہ پردہ تو ہندوؤں سے مسلمانوں نے لیا ہے . . . . محترمہ تقریر تو آپ کی میں نے سن لی . . . مگر یہ بتائیے ہونا کیا چاہیئے . . . کہنے لگی یہی کہ عورت مرد ایک ساتھ مجالس میں بیٹھیں . . . اور کیا بس . . . . سبحان اللہ ۔ ٹھیک ہے ۔ تو کل آپ نشتر پارک آئیے سب سے آگے میرے منبر کے قریب تشریف فرما ہوں ۔ میں پڑھوں گا اور آپ سنیئے گا ۔ کیونکہ مجمع تو " رخصت شوم از کوئے تو با حالِ پریشاں " کہہ کر

جا چکا ہو گا۔ ۔ ۔ ۔

تیسرا واقعہ سنیئے آپ کو تو معلوم ہو گا، طلبا کے کنونشن میں آئیں تھیں۔ ۔

۲۴ گھنٹے کے نوٹس پر ملک بدر ہوئیں ۔ ۔ ۔ ۔ جرأت گفتار دیکھئے ۔ ۔ ۔

کہ وزیر اعظم پاکستان پہ پتھراؤ کر دیا نتیجہ وہی ہوا، یہ تو ہونا ہی تھا ۔ ۔ ۔

محترمہ فاطمہ جناح کا الیکشن کا زمانہ تھا ۔ میں متحدہ محاذ کی سیکرٹری تھی ۔ اس زمانے میں مولویوں کی چاندی تھی ۔ وہی مولوی جس کے لئے علامہ اقبال نے یہ فرمایا تھا ۔

ع خود بدلتے نہیں قراں کو بدل دیتے ہیں

ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

بہر حال فتوؤں کی بکری کی دکان لگی ہوئی تھی ، ٹکے سیر بک رہے تھے ۔ قرآن مجید کو حسبِ دستور "نیزوں پر" بلند کیا جا رہا تھا ۔

میرے ذہن میں یہاں کی سیاست کے خدوخال زیادہ واضح نہیں تھے ۔ اس لئے علامہ صاحب سے مدد لیتی ۔ وہ گھر پہ تشریف لاتے ، اس زمانے میں میری خالہ جان اور خالہ اماں دونوں میرے پاس ٹھہری ہوئی تھیں ۔ انہیں علامہ صاحب سے غیر معمولی وابستگی تھی ۔ فارسی کی ماہر ، یہ لوگ کھانے میں ہماری مدد کرتیں ۔ میں علامہ صاحب سے سیاست میں درس لیتی وہ سیاست کی چیرہ دستیوں پر اس طرح نگاہ ڈالتے ۔ دیکھو "بالائی طبقات کی سیاست میں خونِ ناحق بہانا جائز ہوتا ہے ۔ تقسیم در تقسیم کا عمل جائز ہوتا ہے ۔ حقوق انسانی کو پامال کرنا لازم قرار پاتا ہے ۔ اس لئے ایسے مقامات پہ ہمیں ہی قران مجید سے مدد لینا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جو حکمراں خونِ ناحق بہاتے ہیں قرآن مجید ان کا تذکرہ یوں کرتا ہے ۔

"آیا کئے والا مادا او سفلھا بغیر علما نمانہ لیس سنے ء" ۔ ۔ ۔

خبر دار خونِ ناحق نہ بہانا ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ خونریزی سے بڑھ کر

نعمت کو ڈھانے والا . . . . . . کوئی نہیں ہوتا . . . . . .

قیامت کے دن جب خدا کا دربار لگے گا تو سب سے پہلے خون ناحق ہی کے مقدمے پیش ہوں گے اور خدا فیصلہ کرے گا . . . . . یاد رکھو خوں ریزی سے حکومت کمزور ہوتی ہے ۔ قرآن ۔ ۲۵ ۔ ۳۰ ۔ ۲۷ سورہ ۔ یہ بات قیامت تک کے لئے صحیح ہے ۔ حکمرانوں کو اس سے سبق لینا ہے ۔

نفاق اور ظلم سے متعلق بات یوں ہوگی ۔ ظلم جہل ہے ۔ منافقت بد عہدی ہے عقل عدل ہے ، نجاست دور کرتی ہے ۔ ظالم جہل کی بنا پر ظلم کو استمرار بخشتا ہے ۔ قرآن مجید ظالم پر یوں نفرین کرتا ہے ۔

(سورہ نوح قرآن مجید کا ۷۱ واں سورہ ہے)

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا . . . . .

وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا . . . .

حضرت نوح نے عرض کی پروردگار ان ظالموں اور کافروں میں سے روئے زمین پر کسی کو بسا نہ رہنے دے . . . کیونکہ اگر تو ان کو چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کرینگے . . . . ان ظالموں کی تباہی اور زیادہ کر . . . .

منافقین کے متعلق جو عہد کرتے ہیں ۔ خدا اور رسول کا نام لے کر عہد کرتے ہیں اور اسے توڑ دیتے ہیں ۔ ارشاد ہوا

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ . . . .

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ . . . . عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا

(سورۂ محمد ۔ پارہ ۲۶ ص ۸۱۲

"جن لوگوں کے دل میں نفاق کا مرض ہے تم ان کو دیکھو گے کہ تمہاری طرف اس

طرح دیکھتے ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو کہ اس کی آنکھیں پتھرا جائیں
. . . . . . یہ وہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے
گویا خود اس نے ان کے کانوں کو بہرا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے . . .
ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں . . . "

دوسرے مقام پر ارشادِ ربانی ہوا . .

اَلَّذِیْنَ عَاھَدْتَّ مِنْھُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَھُمْ فِیْ کُلِّ مَرَّۃٍ . . .
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَائِنِیْنَ . . . پارہ ۱۰۔ ص ۲۹۲ سورۂ ۸

جن لوگوں نے عہد و پیمان کیا تھا پھر وہ لوگ اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں اگر وہ لڑائی میں
ہتھے چڑھ جائیں تو ایسی گوشمالی کرو کہ تاکہ یہ عبرت حاصل کریں " . . . . .

" منافقوں کے مکر و فریب سے ہوشیار کرتا ہوں کہ یہ بظاہر مسلمان ہیں حقیقتاً کافر کیونکہ
یہ لوگ گمراہ اور گمراہ کن ہیں . . . . یہ تمہیں اسیر کرنے کے لئے
ہر وسیلہ اختیار کرتے ہیں . . . اور کمیں گاہ میں تمہارے منتظر ہیں۔ سریان
مرض کی طرح تمہاری رگ و پے میں داخل ہو جاتے ہیں . . . . . .
ہر حق کے مقابلے میں باطل، ہر روشنی کے مقابلے میں کجی . . . انواع و مکر
وسیلہ سے کرتے ہیں . . . یہ لوگوں کی نا امیدی کو اپنی طمع و آز کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ تاکہ
ان کی گرمی باقی رہے . . . . . . پس یہ لوگ شیطان کے پیرو . . . .
اور آگ کے شعلے ہیں . . . "

ظلم کے متعلق فرمایا۔

" ظالم ظلم سے تنگ نہ ہو کیونکہ وہ خود اپنا نقصان اور تمہارا نفع کر رہا ہے . . .

آگے چل کر ظلم کے متعلق فرمایا۔

لِنَطَاعِ الْبِلَادِ ہِیَ غَدًا بَلْغَۃٌ عَفْتَۃٌ،

"یہ کہہ دو کہ ظالم کل اپنے ہاتھ کی بوٹیاں کاٹے گا"

ظالم کی پہچان اس طرح کرائی

لِلظّالِمِ مِنَ الرِّجالِ ثلاثُ عَلاماتٍ یَظلِمُ مَن فَوقَہُ بالمَعصیۃِ وَمَن دُونَہُ بالغَلَبۃِ وَ یُظاھِرُ القَومَ الظَّلَمَۃ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹۳۴

ظالم کی تین قسمیں ہیں۔ مصیبت میں ظالم ہو جائے۔ دوسرا غلبہ پاکر ظلم کرے اور اپنے غضب کی آگ کو بھڑکائے۔ تیسرے ظلم کی نفرت کرے اور خود ظالم ہو جائے ۔ ۔ ۔ ظالم کی تین قسمیں گنوانے کے بعد یہ فرمایا کہ

یَومُ العَدلِ عَلَی الظّالِمِ اَشَدُّ مِن یَومِ الجَورِ عَلَی المَظلُومِ ۔ ۔ ۔ ۔

ان سے کہہ دو کہ ایک دن وہ ہوتا ہے جب مظلوم پر ظلم ہوتا ہے لیکن ایک دن وہ ہوتا ہے جبکہ ظالم کے لئے عدل کا حکم آتا ہے جو کہیں خوفناک ہوتا ہے۔ اس سے جبکہ مظلوم پر ظلم کیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔

نہج البلاغۃ ص ۹۳۲

امیر المومنین علی ابن ابی طالب

معنی و بیان کا مہکتا ہوا یہ انسان دکن کی ستھری سرزمین سے اٹھا۔ اور آنِ واحد میں پھول کی طرح کھل کر سارے گلستان میں خوشبو بکھیر گیا۔ رنگ و بو کی عطر بیزی نے بہادر یار جنگ، خلیفہ عبد الحکیم، نظم طباطبائی، اور مولانا سبط حسن جیسے عظیم انسانوں پر محویت کا عالم طاری کر دیا۔ حسن نے زمانے کو جھکا کر اپنا خراج وصول کرنا شروع کر دیا۔ دکن کی فضا کانگریس کے نعروں میں گھول رہی تھی۔ مسلم لیگ ابھی گھٹنوں چل رہی تھی۔ قومی و ملی جذبے نے علامہ کو بے چین کر دیا۔ عملی سیاست میں دامن دل و دماغ کھول کر در آئے۔ اپنے خونِ جگر سے مسلم لیگ کے پودے کو سینچا اور پھر تناور درخت بنا کر کھڑا کر دیا۔

تاریخ بنتی بگڑتی اور سنورتی رہی ۔ پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا ۔ جغرافیائی حدود کا تعین ہو گیا ۔ پاک سرزمین پر مسلمانوں کا پرچم لہرانے لگا ۔ جغرافیائی حدود کے ساتھ ذہنی حدود کے تعین کا سوال بھی درپیش تھا ۔ پوری قوم ہوا کے دوش پر چکراتی ہوئی یہاں تک آن پہنچی تھی ۔ لیکن پروازِ تخیل کی تطہیر ابھی باقی تھی ۔ جذبات کے جھنجنے ابھی بھی بجائے جا رہے تھے ۔ فکری طور پر قوم مختلف خیمے نصب کئے ہوئے تھی ۔ سطحی احساسات اس کا طواف کر رہے تھے ۔ جذبات میں اگر شعور شامل نہ ہو تو وہ ہیجان کہلاتا ہے ۔ اور یہیں سے جذبے اور شعور کی بحث کا آغاز ہوتا ہے ۔ مسیحا نفس اور واقفِ اسرارِ رموزِ نفسیاتِ انسانی کی حیثیت سے علامہ صاحب کے سامنے سب سے بڑا کام قوم کو فکری سطح پر منظم کرنا اور بکھرے ہوئے تسبیح کے دانوں کو ایک اعلیٰ مقصد کے دھاگے میں پرونا تھا ۔

عملی سیاست سے وابستگی کی بنیاد پر سب سے پہلے سیاست پر نگاہ ڈالی ، لیکن چاروں طرف ٹوٹے ہوئے دلوں اور بلکتے ہوئے بچوں نے قدم اس طرف بڑھنے سے روک لئے ۔ قائد ملک و ملت کا ابھی کفن نم بھی نہ ہونے پایا تھا ۔ ایک مخصوص طبقے نے روایتی انداز میں سازشوں کے جال بننے شروع کر دیئے ۔ تخت و تاج کے زرتار لباس نے ہر شخص کی قوتِ احساس کو سلب کر لیا تھا ۔ ایک ایسا معاشرہ تخلیق ہو رہا تھا جس میں ایک طرف روشنی اور تین طرف ایوانِ تاریخ کے بام و در میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا ۔ اس اندھیرے میں لپٹے ہوئے وہ کروڑوں انسان تھے جن کے سینوں میں درد کے شہر آباد تھے آنسوؤں کے سمندر کا مد و جزر برپا تھا ۔ ہر انسان مکمل شخصیت نہیں کھیتوں کی طرح ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا ۔ چاروں طرف درد کا الاؤ جل رہا تھا ۔

علامہ صاحب یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے ۔ ان کے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے تھے ۔ نغمۂ جانفزا کا گلا گھٹا دیکھ کر ان کے شعور میں شعلے لپک

رہے تھے ۔اس لئے کہ یہ نظامِ حیات اسلامی فکر کے منافی تھا ۔ اسلام کی سادگی اور شب زریں میں بڑا فرق ہے ۔ حالات کی سخت گیری ، دل و دماغ کی تجزیاتی کیفیت نے عملی سیاست سے دوری پر اصرار کیا ۔ اور وہ یہ کوچہ چھوڑ بیٹھے ۔

لیکن قوم کی فکری تربیت مدعا تھا ۔ دوسری قسم کی سیاست کا آغاز ہوا ۔ منبر کی پنہائیوں پر حکیمانہ نگاہ ڈالی ۔ قوم کی کھردری زندگی اور جوان شعور کا جائزہ لیا ۔ منبر کے ذریعے بکھری ہوئی ناآسودہ ، ناتراشیدہ اور نادمیدہ حسرتوں کو جذباتی اور فکری کڑیوں میں جوڑ کر مکمل شخصیت بنا دیں اب یہ فیصلہ ہو چکا تھا ، قدم آگے بڑھ چکا تھا ۔ آگے بڑھتے ہوئے قدم کا اب پیچھے کی طرف ہٹنا ممکن نہیں تھا ۔ دکن کا ماہ نو بدرِ کامل بن کر خطابت کی دنیا پر چھا گیا ۔

خطابت کی تاریخ انسان کی ترقی کی طرح عظیم اور ناپیدا کنار ہے ۔ شاعری اگر جزو الیست پیغمبری ہے تو خطابت کار پیغمبراں ہے ۔ علامہ رشید ترابی خطابت کے رسول تھے ۔ جن کا ہمہ جہت ذہن علم انسانی کے پورے ذخیرے پر حاوی تھا ان کی فکر کی اساس قرآن حکیم تھا ، لیکن ارسطو ، ہیگل ، مارکس کے افکار پر بھی انہیں عبور تھا ۔ مشرقی و مغربی افکار کے دھارے ان کے یہاں سنگم بن جاتے تھے ۔ لیکن اس عنوان سے کہ مغربی فکر اسلامی فکر پر غالب نہ آنے پائے ۔

اصول خطابت ہر دور میں بنتے بگڑتے اور سنورتے رہے ہیں ۔ تحقیق و خطابت کا رشتہ بہت گہرا ہے ۔ خطیب صرف واقعات کا ترجمان نہیں بلکہ ناقد بھی ہے ۔ وہ کسب و کم کے غیر متعین دائرے میں نہیں رہتا ۔ بلکہ ابہام میں توضیح ، اور بے یقینی میں یقین کی صفت پیدا کرتا ہے ۔ خطابت صرف مواد جمع کرنے کا نام نہیں بلکہ مواد کو نیا مفہوم بھی عطا کرتا ہے ۔ علامہ صاحب کی خطابت محققانہ بصیرت کا بوجھ اٹھا کر چلتی ہے ۔ انہوں نے حقیقت کو بکھرے ہوئے مظاہر کی بے ترتیبی میں نہیں بلکہ ان کڑیوں کی شکل میں

دیکھا جو مظاہر کو ایک دوسرے سے جوڑتی اور مکمل تصویر بناتی ہے۔ پھر ان رشتوں میں جکڑے ہوئے انسان وہ لافانی کردار کی شکل میں ابھرتے ہیں جو ساری زنجیروں کو توڑ کر حق کی دنیا تخلیق کرتے ہیں اور "کربلا کو ظلم کی تھکن" کا لافانی نام دے دیتے ہیں۔ اور ہر زندگی کے صحن میں اپنی فکر کی چاندنی بکھیر دیتے ہیں۔ علامہ صاحب ہر عنوان سے قوم کے شعور کی تربیت کر رہے تھے۔

جدت پسند طبیعت کو قرار نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ

"درئے ہیچ مقالم نہ گذارو بہ درنگے"

از بوئے بہ بوئے بہ دانہ رنگ بہ رنگے "

تقلید اس کا شعار نہیں ہوتا۔ لیکن پرانی ڈگر سے ہٹ کر الگ شاہراہ بنانا معمولی انسانوں کا کام نہیں وہ روایت و تغیر کے تاریخی احساس اور غیر معمولی ذہنی طاقت اور علم کا مطالبہ کرتی ہے۔ عزا خانوں کی حد بندیاں ان کے ذہن پر گراں گذر رہی تھیں "بیان کے لئے کچھ اور وسعت" درکار تھی۔ انہوں نے مجالس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ منبر کو عزا خانوں سے نکال کر نشتر پارک کی کھلی اور شاداب فضا میں پہنچا دیا۔ اس لئے کہ مذہب ان کی نظر میں تفریق انسانیت کے لئے نہیں بلکہ وحدت انسانیت کے لئے تھا۔ انسانی فکر کے پاٹ کو چوڑا کرنے میں رنگِ جلد بدن مانع نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم کی فکری سطح کو منظم اور ٹھوس بنیادوں پر لانے کا جو تاریخی کام انہوں نے انجام دیا ہے اور فکر و خیال کی روشنی جو انہوں نے پھیلائی ہے اس کی روشنی معاشرے پر اس طرح محیط ہو جائے کہ تاریکی کی قوت اس پر شب خوں نہ مار سکے۔ ان کی فکری سطح کا ہمیشہ یہی محور رہا۔

قوم کی ذہنی تربیت کے لیے ایک طرف انہوں نے اپنی فکر کا ایک سرا نظریہ اسلام سے جوڑا اور دوسرا ان موضوعات سے جو علم کی دنیا میں خود دولت و خزینہ تھے۔ گیتا، نہج البلاغہ، اقبال و غالب جیسے موضوعات منبر اور مجلس کی تاریخ کے منافی تھے۔ لیکن

علامہ صاحب سمجھتے تھے کہ فکر کے کنگو دروں میں تازگی کے لیئے جڑوں میں شادابی لازمی ہے وہ اپنی طرح ہر انسان کی فکر کو فوارے کی مانند ڈھالنا چاہتے تھے ۔ جو اوپر بلند ہوتا ہے اور پھر زمین سے جڑ جاتا ہے ۔ فکر کی اسی شادابی نے انہیں اقبال و غالب جیسے موضوعات پر دلبستان کھولنے پر مجبور کیا ۔ ان مضامین کے بیان میں علامہ صاحب کی خطابت کہیں اقبال کی خودی کا جائزہ لیتی جو پتھر سے آئینہ اور زہر سے نوشینہ بنا لیتی ہے ۔ کہیں غالب کی نغمہ سنجیوں ، اور گل افشانی گفتار، کے جلوے دکھاتی ، وہ کہیں انیس کی ارغوانی پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی بن کر سامنے آتی ہے اور کہیں مولانا روم اور گیتا انجلی کی حقیقت سامانیوں پر سے پردے ہٹاتی ہے ۔ سچ پوچھیئے تو ان کی خطابت اپنی تمام سحر طرازیوں اور زرفشاں کرنوں کا جال بنتی ہوئی آگے بڑھتی ہوئی چلی جاتی ہے ۔ جس کی ہر ادا زمانے کو تھکا کر اپنا خراج وصول کرتی ہے ۔ انہوں نے منبر کی تاریخ سے نئے موضوعات کو اس طرح پیش کیا کہ نہ تو اسلامی فکر پر آنچ آنے پائے اور نہ ہی فن پر کوئی ضرب پڑے ۔ ''انسانی حقوق کا چارٹر'' جیسے عنوانات کو مجلس کا موضوع بناتے ہوئے اس بلیغ حقیقت کا انکشاف اس طرح کر دیا کہ

''ظالم کے سامنے اپنے حقوق کے لیئے لڑنا کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر ہے تو انسانیت ایسے ہی گناہ کر کے آگے بڑھی ہے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا اور ٹوکا نہیں جا سکتا ہے ''

اس طرح علامہ صاحب نے منبر سے پوری قوم کے نہ صرف ذوق کی تسکین کی بلکہ اس کی ذہنی تربیت کرنے میں اور قوم کی شیرازہ بندی کرنے میں ایک تاریخی کردار ادا کیا ۔ ان کی مجالس کے متعلق یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انہوں نے مجلس کے فرش کو دانش محل اور ہر انسان کے ذہن کو دانش کدہ بنا دیا ۔

ایک اور مقام پر ''رزق'' کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرمایا '' اگر تمہاری زندگی میں رزق کی کمی ہے تو اس میں شکوہ رازق سے کیا ۔ شکوہ اپنے [illegible] نظام معیشت سے کرو ''

صبر کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ بلیغ جملہ ارشاد فرمایا " یاد رکھو صبر کے معنی سپردگی کے نہیں . . . . . . باطل سے جنگ کرنا اور ظالم سے اپنے حقوق کو چھین لینا بھی صبر ہے " " ناقص اور کامل " کے موضوع پر فرمایا " کامل سے نگاہیں جوڑ لو تو پھر کسی ناقص کی چوکھٹ پر سجدہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی ۔

اس طرح علامہ صاحب نے منبر سے ایک دبستاں کھول دیا ۔ انہوں نے صرف قوم کے ذوق کی تسکین نہیں بلکہ اس کی فکری تربیت کرنے میں ایک اہم اور تاریخی کردار ادا کیا ۔ ان کی خطابت جادہ پرستی ، زر پرستی ، نفس پرستی ، باطل پرستی کے خلاف مستقل احتجاج اور کوہ گراں کی حیثیت رکھتی ہے ۔ جو ظلم سے ٹکراتی اور حق و انصاف کے علم کو بلند کرتی . . حق کی ہر تحریک سے رشتہ جوڑ لیتی ہے ۔

کہر کی تہوں میں ڈوبی ہوئی دسمبر کی انتیسویں تاریخ تھی ۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا ۔ اچانک تاریکی کے سینے کو چیرتی ہوئی فضا میں بر کھا کی بے چین کوئل کی کوک کی طرح آواز بلند ہوئی " آج خطیب عالم اسلام ہم سے جدا ہو گئے " . . . انسانوں پر قدِ آدم بجلی گر پڑی ۔ غم کے الاؤ جل اٹھے ۔ ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے کربلائے حیات میں اب ہر انسان تنہا ہے ۔ ایک بلبل کی خاموشی نے کروڑوں گلوں کی پنکھڑیاں بکھیر دیں ۔ ایک چاند کے گہنا جانے سے لاکھوں چکوروں کے قدم تھم گئے جنازے کو کاندھا دینے کے لئے انسانوں کے سمندر میں مدوجزر آ گیا ۔ موجوں پر موجیں ٹوٹ پڑیں ۔ کتنی ہی لہریں سر ٹکرا کر واپس آ گئیں ۔ ہنسی کے موتیوں کو آنسوؤں نے نگل لیا ۔ ہجر کی زردی نے ساری فضا کو یرقان میں تبدیل کر دیا . . . یہ سب نہ ہوتا تو تعجب تھا ۔

کیونکہ آج تو خطابت کا سلیمان تخت پر ساکت تھا . . .

منارۂ صداقت خاموش تھا۔ افکار عالیہ کے جام و سبو چکنا چور ہو گئے تھے۔ محاکات کی افشاں جھڑ گئی تھی۔ الفاظ کے ساز کا ترنم بے آواز تھا۔

مشیت الیزدی کے حضور ہر انسان بے بس ہے۔ حیات و موت کا رشتہ ابدی ہے۔ موت ہر شخص کا مقدر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک سانسوں کا جنازہ بن کر جیتا ہے اور بھاری پتھر بن کر زمین پر جم جاتا ہے۔ جم جانے سے حرکت باقی نہیں رہتی حرکت نہ ہو تو جمود ہوتا ہے۔ اور جمود سے بدبو پیدا ہوتی ہے۔ جو تمام فضا کو متعفن کرتی ہے۔

دوسرا اپنی حیات کے جلال و جمال سے خوابیدہ انسانوں کو حرکت میں لاتا ہے۔ حرکت سے زندگی شگفتہ تر اور حسین تر روپ دھارتی ہے۔ اس میں زندگی نمو پاتی ہے اور نمو سے سینے کے صحن میں چاند اگتے ہیں اور چاند زندگی کی رگ رگ میں تازہ خون دوڑا دیتا ہے۔

"مشہور فلسفی یونا مونا کا قول ہے" زندگی اس طرح بسر کرو کہ تمہاری موت ناانصافی بن جائے" . . . .

علامہ رشید ترابی کی موت ناانصافی سہی لیکن صرف زندگی ہی نہیں ان کی موت سے بھی اجالا پھیل رہا ہے۔ اجالا تو بڑھتا ہی جاتا ہے۔ چاندنی تو چھٹکتی ہی رہتی ہے۔

حضرت قائداعظمؒ کے سیاسی رفیق ، شاعر و ادیب
محترم راجہ صاحب محمود آباد

حضرت راجہ صاحب محمود آباد

شخصیت کی تشکیل و تعمیر گوناں گوں رنگوں سے ہوتی ہے۔ ہر رنگ مورپنکھ جس میں ہزاروں چاند جھلکتے اور کروڑوں ستارے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سب سے گہرا رنگ خاندانی ماحول کا ہوتا ہے۔ گھرانے کی علمی ادبی فضا۔ طبقاتی روابط فکری زاویہ نگاہ، رہن سہن کا انداز، اخلاقی نظامِ اقدار دوسرا رنگ خارجی دنیا کا ہوتا ہے گرد و پیش کے بدلتے ہوئے حالات، معاشرت میں تغیر و تبدل کے مختلف النوع تیور، ذہنی افق پر تبدیلیاں، شکست و ریخت ہوتی اقدار شخصیت کے دل و دماغ کے گرد ہالہ بناتی ہیں

شخصیت میں رنگوں کی جلوہ سامانیاں اور اثر پذیری کے طور مختلف جہات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ کبھی کلی یگانگت، کبھی جزوی، کبھی مماثلاتی انداز میں

ہرلڈ بوم نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "Anexiety of infuneue" میں شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے بہت فکر انگیز انداز میں بحث کی ہے۔۔۔اس کا خیال ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اثر پذیری کا رنگ کلی اتفاق یا نااتفاقی کی صورت ہی میں نمایاں ہو۔ وہ ردعمل کی صورت میں بھی اپنا اظہار کرتا ہے

محمد امیر احمد خاں (راجہ صاحب) ریاست محمود آباد کے چشم و چراغ تھے۔ بایزید خاں جو والیان ریاست ہائے بلہیرہ، محمود آباد اور بھٹواموٗ کے مورث اعلیٰ تھے۔ انہوں نے اپنی علمی صلاحیت، تنظیمی قابلیت، حب الوطنی، جانثاری اور جنگی خدمات کے صلے میں یہ جاگیریں عہدِ مغلیہ میں حاصل کی تھیں۔ اسی بنا پر انہیں راجہ کا خطاب ملا تھا۔ یہ جاگیر ان کے بعد ان کے تینوں بیٹوں میں تقسیم ہوئی۔

ریاست کا نام کچھ بھی ہوا۔ بھٹوامئو یا محمود آباد۔ ریاستی حکمرانوں کا مزاج اور ماحول کم و بیش یکساں تھا۔ ایک طرف قہقہے اگلتے ہوئے ایوان، دوسری طرف پیلے پھول۔ سیاہ شعلہ اگلتی ہوئی جامد چٹانیں، شبستان محبت و صداقت

کو خاکستر کرنے کے درپے۔ گلنار مسکراہٹ ان کے ہاتھوں لہولہان، سیاہ کرتبیوں کی سوزن کلیجوں کو چھلنی کرتی۔ سچائی کو خاموش اور جراءت اظہار کو بے آواز بناتی۔ تاکہ ان کی اپنی زندگی کی سطح چکنی، چاندنی کی طرح دھلی ہوئی صاف شفاف نظر آتی رہے . . .
ان حضرات نے بالائی طبقوں سے گٹھ جوڑ کر کے اپنی نقرئی زندگی اور ہریالی کو تابندگی بخشنے کے لیے تین حربے استعمال کیے (اول) علم و حکمت کے باب عام انسان پر بند کیے۔ اور اسے خدا کے برگزیدہ بندوں کا حق قرار دیا۔ اس طرح زندگی کو جہل کی گھنی دھند میں لپیٹ دیا۔ اس خوف سے کہ روشنی کہیں سیاہی کو جلا نہ دے۔ ۲۔ مذہب کو انسانوں کو جگانے اور انہیں اجالا ذہن بنانے کے بجائے اپنے طبقات کی "حفاظت" کے لیے بطور خاص استعمال کیا۔ ۳۔ سیاست سے عام انسانوں کو دور رکھا۔ کیونکہ خوف یہ تھا کہ جدوجہد کے میدان میں اترنے سے کہیں جلتے ہوئے ہونٹ مہریں نہ توڑ دیں۔ کہیں آنسو حرارت و گرمی میں بدل نہ جائیں۔

دوسری اور ریاستوں کی طرح ریاست محمود آباد کے وارثوں نے "خدا کے برگزیدہ بندے" ہونے کے سبب علم سے جھولیاں بھریں۔ تعلیم کی بدولت زیب تن کی۔ سائنسی فکر نے ماورائی عقائد کو کچل دیا۔ نئی فکر نے نئی تحقیق و تخلیق کے باب کھولے نظام اخلاق میں یہاں بھی مذہب کو اولیت حاصل ہوئی۔ علم کی روشنی نے اندھیرے اور اجالے کے فرق کو سمجھایا۔ چنانچہ یہاں مذہب دکان چمکانے سے زیادہ ذات کے کندن کو نکھارنے اور سجانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ مذہب اسلام سے محبت، رسول کریمؐ کی اچھوتی فکر، انوکھا پیغام اس گھرانے کی امانت بنا۔ جس پر ہر چھوٹا بڑا ہو جان سے نثار ہوا۔ "کٹھ ملائیت" سے بیزار عقلی دلائل سے ہم آہنگی خاندان کا مزاج پیدا ہوا . . . رسول کریم کی شان میں مرثیے اور قصائد کے پھولوں سے والئی ریاست نے آنگن بھر دیا . . . . اسلام کا یہ پیغام۔ روح افزا کہ جابر حکمراں کے خلاف کلمۂ حق کہنا سب سے بڑی عبادت اور جہاد ہے . .

خاندان کا شعار بنا۔ اس فکر نے سیاست سے جھجک دور کی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ جس وقت سلطنتِ مغلیہ کے آفتاب کو گہن لگا۔ شکست و ریخت شروع ہوئی۔ برطانوی سامراج کا نا غروب ہونے والا سورج طلوع ہوا۔۔ تو چاروں طرف بارشِ سنگ کا موسم آیا لب و رخسار کی لالی چھنی، جسم و جاں مقتل بنے۔ کلی کلی ویران ہوئی بوٹا بوٹا پابہ جولاں ہوا۔ خورشید چمن بند دمہ بچوں میں لہولہان ہوئے۔ ہزاروں مکین بے صوت و بے رنگ فضا میں، بکھیر گئے۔ لہو کا دریا چڑھا " ذوقِ جنوں اور بڑھا " غنچوں نے خونی جبڑوں کو توڑ کر نکلنے کی راہ دیکھ لی۔ آزادی و حریت کے شعلے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں ڈھل گئے۔ قافلہ سرفروشاں آگے بڑھا۔۔ راجہ صاحب کھٹوا مئو اور راجہ صاحب محمود آباد بھی اس قافلے میں شامل ہوئے۔ مجاہدانِ آزادی نے سروں کا نذرانہ دیا۔ راہ میں چراغ قطار اندر قطار جلنے بجھنے اور جلنے لگے۔ بغاوت کی سزا قید، زنجیر، دار، تختہ، ہے۔ " سروں کے چراغوں " نے سیاہی کے ایوان میں دراڑیں ڈالیں۔ ظلم کے قدم متزلزل ہوئے۔ تیرگی ہٹی مراعات کا باب کھلا، مجرم سرفراز ہوئے۔ خاندان محمود آباد کی ریاست جو پاداش جرم میں ضبط ہو چکی تھی واگذاشت ہوئی۔

ہر ریاست کا مقدر تین طرف اندھیرا اور ایک طرف اجالا تھا۔ سو یہاں بھی تھا۔ ادیبی زندگی سونے سے لدی تھی تین طرف کلائیاں سونی، گلوں پر سایہ نہیں فضا فریاد کناں۔۔ حسرت و ناامیدی مقدر۔۔ چند لوگ ادیب سے دینے والے کر ڑوں ہاتھ، مٹی کے کھلونے، لے کر بیلنے والے۔۔ بتوں کی مردہ کھال پر غازہ لگا ہوا۔۔۔ گلبدن کی رعنائی مضمحل، راتوں میں اجالا کرنے کی تمنائیں لہولہان۔

جذبات و احساسات کے سانچے سماجی حوالوں ہی سے بنتے بگڑتے اور سنورتے ہیں۔۔۔ زندگی کے ہمہ جہت پہلو حیات و کائنات کے بکھرے ہوئے مسائل ہی کا ایک حصہ ہیں۔۔ تابناک خواب ہو یا عزمِ سفر کا حوصلہ، نااندیشی کی

بلندیاں ہوں یا فلسفیانہ احساس کی امیجری،، "کلاہ کج" رہنے کا سلیقہ ہو یا شگفتگی میں شفق کی لالی بکھیرنے کا جذبہ، ذہن کا ہر شیوہ کردار کا ہر انداز ماحول ہی کا مرہون منت ہے۔

راجہ صاحب کی فکر کا خمیر چار جہتوں سے اٹھا۔ علم کو مشام جاں سمجھنا۔ مذہب کے سُر نہاں، یہ فدا ہونا، ۔ ۔ ۔ ۔ ، آزادئ فکر و نظر پہ قربان ہو جانا۔ فکر کے یہ نقوش کبھی کلی مطابقت، کبھی جزوی مخالفت، کبھی ردِ عمل، کبھی ضبط و ٹھہراؤ، کبھی سبک رو چلنے اور پھر پھیل جانے، کبھی اضطراب و باغیانہ تیوریں۔ کبھی ہر موج کو مذہب کے آہنگ میں سمو دینے۔ احساس کا ہر پیکر، روح کی بالیدگی کا ہر جلوہ، رنگ و بو سے پیمان وفا باندھے رکھنے کی ہر ادا، کبھی چٹکتے ہوئے شوخ رنگ میں اور کبھی بے نام دبے رنگ انداز میں ترجمانِ فکر و نظر بنکر ان کے یہاں جلوہ دکھاتی ہے۔

راجہ صاحب "برگزیدہ،، گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ علم پہ ان کا حق تھا۔ انہوں نے اس کا حق ادا کیا ۔ ۔ وجود میں چاند اتارا۔ آنکھوں کے کٹورے بھرے۔ نرم آنچ سے وجود کو تپایا، کندن بنایا۔ صد فکر و فن کا جھاڑ روشن کر کے ذہن کے دریچوں میں اجالا کیا۔ ان کا قول تھا،، علم کا پورا ذخیرہ حاصل کرو ۔ ۔ ۔ ادھوری فکر ناقص و ادھورا انسان تخلیق کرتی ہے ۔ ۔ ۔ تعلیم قوم و ملت سے محبت سکھاتی ہے۔ لیکن سچا علم حصار توڑ دیتا ہے حد بندیوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ عالمی و آفاقی فکر و احساس سے رشتہ جوڑ دیتا ہے ۔ ۔ ۔ "علم حاصل کرنا ہے تو چین جاؤ" کے ارشادِ رسول صلعم میں یہی فکر جلوہ افروز ہے۔ " انا مدینۃ العلم"، ہی پہ رسول صلعم کو ناز ہے دولت، امارت، ثروت، شجاعت، سخاوت پہ نہیں ۔ ۔ علم ہی کی روشنی میں راست گفتاری، حق گوئی، تزکیۂ نفس۔ شجاعت، بہادری، ایثار و قربانی کے جذبے کو پرکھنا چاہیئے۔ ۔ علم کی روشنی میں حق کو باطل سے ناانصافی کو انصاف سے اور بے صبری کو صبر سے جدا کر کے دیکھا جا سکتا ہے ۔ ۔ ۔ جس انسان میں علم نہیں

وہ انکارِ رسول و حسین کے معنی سمجھنے سے قاصر ہے۔ انکار تخت و تاج سے، انکار زر و جواہر کے کرقوتِ احساس سلب کرانے میں، انکار جرأت گفتار دیگر حقوق انسانی پامال کرنے سے، انکار جبر و استبداد کی قوتوں سے مصلحتاً سر جوڑنے سے۔ انکار مسند چھوڑ کر خاک نشینی قبول کرنے میں، انکار حق سے دستبردار ہو کر باطل کے آگے سر جھکانے سے۔۔۔ ادھورا علم نفرت و تنگ نظری کا زہر بوتا ہے۔۔۔ سچا اور پورا علم نفرت و تنگ نظری کا زہر کھینچ کر اس میں امرت بہاتا ہے۔۔۔"

راجہ صاحب کا مطالعہ وسیع تھا۔ وہ واقعات کی تہہ میں ڈوب کر حقائق کا پتہ لگانے کے عادی تھے۔۔ وہ ہر اس شئے کو جو انسان کی قوت تخلیق کو نکھارتی اور اس کی جمالیاتی صلاحیتوں کو ابھارتی ہو ان کے یہاں مستحسن تھی۔۔ علم کی حقیقی بنیاد ظلم و نفرت نہیں۔۔ محبت ہے۔ وہ لسان الغیب حافظ کی اس فکر سے حد درجہ متاثر تھے

ے خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی

مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

اور اسی فلسفے کو وہ انسانی علم کی بنیاد قرار دیتے اور دشمن کو شکست دینے کا حربہ گردانتے تھے۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ علم محبت سکھاتا ہے اور محبت کا نشیلا حسن اس کی آب و تاب، اس کی شبنمی موجیں، کھوکھلے الفاظ کو کاٹتی ہیں، گناہ کے لفظ کا خول اتار کر دل کی حرارت بڑھا کر جسم کے نقصان کا مداوا تلاش کرتی ہیں۔ ترقی و ارتقا کی قوتوں کو بڑھاتی ہیں۔ روایتی اخلاق کی کرم خوردگی کو دور کرتی ہیں قوت و تاب کی اور حسن بے داغ سحر کو قریب لاتی ہیں۔

راجہ صاحب ماہر لسانیات تھے۔ زبانوں کی ساخت پر انکی گہری نگاہ تھی۔ اردو، فارسی اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبانوں کا

کا مطالعہ گہرا تھا۔ جب کسی زبان میں بات کرتے تو غیر زبان کا لفظ کھٹکنے نہ پاتا۔ مخلوط اردو اور مخلوط انگریزی کے مخالف تھے۔ یہی صفت ان کے مایۂ ناز داماد امیر امام خُرا اور بیٹے راجہ سلیمان میاں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ "علم کا پورا ذخیرہ" سمیٹنے کے سب رسیا سائنس، ادب، موسیقی، سیاست، مذہب گھرانے کی نس نس میں لوں پر دیا ہوا ہے جیسے مارواڑی کی دلہن کی انگلیوں میں سنہرے چھلے۔ ۔ ۔ زبان کی ذرا سی غلطی راجہ صاحب کے بلوریں ذوقِ سماعت پر بار ہوتی۔ ایک مرتبہ گفتگو کے دوران میں نے کہا۔۔ راج ابا۔۔ آپ ہمارے شاگرد کے لیے ایک سفارشی لیٹر دے دیجئے۔۔۔ شوخ مسکراہٹ چہرے پر بکھر گئی۔۔۔ ہوں۔۔۔ ٹھیک کہتی ہو۔۔۔ خیر سفارشی خط دے دوں گا۔ ۔ ۔ اچھا یہ بتاؤ تم رہتی کہاں ہو؟ میں نے کہا ناظم آباد پر۔۔۔ نقرئی قہقہہ لگایا۔۔۔ اگر "پر" کاٹ دو تو ہم پر احسان ہوگا۔

راجہ صاحب کی ذات گلِ تر تھی، شبنمی دلائی اوڑھے ہوئے شمع کی طرح پگھلتی، علم کی روشنی بکھیرتی، مسکراتی اور موتیوں سے دامن بھرتی۔ ہر موتی سڈول، آب دار اور شائستہ۔ ۔ ۔ آب دار اور شائستہ ہنسی کا گہرا تعلق شائستگی ذات سے ہے۔ اور ذات میں شائستگی آتی ہے عمل و علم کی یکانگت سے۔۔۔ فکر کی آرائش اور عوامی جد و جہد سے رشتہ جوڑنے سے آئینہ پر نگاہ رکھنے اور زیرِ آئینہ دیکھنے کی صلاحیت سے۔۔ تخلیق عمل کے تجربات کو سمجھنے اور نظریات کی صداقت کو پرکھنے سے تضاد کے ہر عمل کو سمجھنا شائستہ ہنسی کی ضمانت ہے۔ ایسا انسان سفیدی کو سیاہی سے اجالے کو اندھیرے سے، جہل کو علم سے "کارِ جہل انجام دینے کے لیے علمار طلبی" کے تیور پرچ کھول کے ہنس سکتا ہے۔ ۔ صداقت کی پیشانی پر جہل کی سنگساری پہ مسکرا سکتا ہے۔ سرمایہ کے باغ میں علم کے کھردرے ہاتھوں کی عظمت کو بوسہ دے سکتا ہے۔۔ وہ عراق ہو یا ایران، انگلستان ہو ہندوستان، ہر مقام ہر منزل پہ آسودہ رہ سکتا ہے

راجہ صاحب کی فکر میں مذہب کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ وہ مذہب کو علم کائنات کا جزو تسلیم کرتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی فکر پر دو عظیم ہستیوں وہائٹ ہیڈ اور علامہ اقبال کا سایہ تھا۔ وہائٹ ہیڈ کے نزدیک مذہب

ایک مقام | کا دوسرا نام ہے | Inlellectnal integrity

پر رکھتا ہے۔

"مذہب اور سائنس کو تعقلی نظام فکر میں مدغم کرنے سے فلسفہ مزید اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے . . . مذہب مجلگئی تجربہ Totality of experience proeess میں شامل ہے۔

& Reality white Head New York.

علامہ اقبال کی فکر کا بنیادی ستون مذہب ہے وہ وہائٹ ہیڈ کے نظریات سے متاثر ہیں۔ . . . کہتے ہیں " مذہب کی قدر و منزلت کا تعین کرتے وقت فلسفے کو مذہب کے لیے مرکزی جگہ دینا تسلیم ہونا ہی چاہیئے . . . اور فکری ترکیب کے سلسلہ ہائے عمل میں مذہب کو ایک نقطہ تصور کرنا چاہیے . . . "

The Reconstruction of Religions thought in Islam

راجہ صاحب کی نیو میں بھی مذہب کا پانی بھرا ہوا تھا۔ وہ مذہب کو "عقلی یک جہتی" اور جزو علم سمجھتے تھے۔ وہ اُسے شخصیت کا اٹوٹ جذبہ وانگ گردانتے تھے۔ ایک ایسا جذبہ جو انسان کو اپنے آپ کو پہچاننے کی استطاعت بخشتا ہے اور اسے اعلیٰ مقصد عطا کرتا ہے اور جب وہ مقصد شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو انسان کارزار حیات میں قندیل صفت بن کر اپنے چاروں طرف روشنی بکھیر دیتا ہے۔ ان کے یہاں مذہب فلسفے اور پھر عقیدہ کی سطح پر

آکر ذات کا جزو اعظم بن جاتا ہے جو ان کے نزدیک انسانی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ انسان عظیم قوت میں یقین رکھے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس ان دیکھی قوت کا ادراک مذہب کے بغیر ممکن نہیں۔

وہ اسلام کے اقتصادی برابری کے نظام کے رسیا، اس کی آزادیٔ فکر کے متوالے، عظمتِ انسانی کے پرستار اور علم کی بزرگی کے قائل تھے۔ وہ اس مذہبی گروہ کے سخت مخالف تھے جو دین اور فقہ کا لبادہ اوڑھ کر خود پرستی، خود نمائی، شکم پروری، ریاکاری اور خود بینی میں غرق معصومیت کو جال میں پھنسانے کے لیے دام بچھائے بیٹھے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے مفکر اسلام نے کہا تھا۔

ے خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

عظیم الشان تجربوں کے دور میں جہاں طبقاتی کشمکش پر پردہ ڈالنے ہر اغوں کو گل کر کے منت کش اسلام، ہر غیر معتبر لفظ معتبر منایا جا رہا ہو۔ اسلام کے مقدس چہرے کو مجازی معبدوں کی گھمان میں چھپا کر جھلملاتی زندگی کو اپنا نا بر حق اور حلال گردانا جا رہا ہو وہاں راجہ صاحب اسلام کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور سمجھانے پر مصر تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ان میں مذہب سے لگاؤ گھرانے کی میراث تھا لیکن ان کے یہاں مذہب انسانوں کو سلانے نہیں بلکہ جگانے کے لیے تھا۔ یہ جذبہ علم سے گہری محبت کا نتیجہ تھا کیونکہ علم اندھیرے اور اجالے کو صرف دکھاتا نہیں بلکہ اس کا تجزیہ بھی کرتا ہے اس کی درستگی اور نا درستگی کا جائزہ بھی لیتا ہے... رسولِ مقبولؐ کی انوکھی، اچھوتی اور منفرد فکر نے راجہ صاحب کی زندگی میں محبت کی جوت جگا دی تھی۔ ان کی نظر میں فطرت کا ہر رُخ بے جان اور بے معنی تھا جب تک اس میں انسان کا دل نہ دھڑک رہا ہو... انسان کی آواز دل ہی کی چلمن سے انہوں نے قندیل کی روشنی دیکھی تھی۔ اسی بنا پر نقرئی رشتے ٹوٹنے

اور احساس کے پہلو اجاگر ہونے لگے تھے۔ انہوں نے رسولِ کریمؐ کی اس حیات آفریں فکر کے سامنے چپ چاپ ہتھیار ڈال دیئے تھے کہ دلوں اور ذہنوں کی تقسیم گناہ اور ہم آہنگی پیدا کرنا تہذیب و ارتقا کی دلیل ہے۔ رات کا خون بہانا اور سحر کو قریب لانا شریعت محمدی ہے اس فکر نے راجہ صاحب کی تخلیقی قوت کو جانبداری کے منصب پر فائز کر دیا تھا جس کے نتیجے میں علم نے ان کی رہبری و رہنمائی کی . . . . . ، تھقہے اگلتے ہوئے ایوانوں سے نفرت کا دھواں سینے سے اٹھا اور اسی نفرت نے درد کے پیوند ٹنکی ہوئی اور سوئی ہوئی زندگی کو جگانے، ناتراشیدہ آرزوؤں کو سیراب کرنے اور جھلسے ہوئے ہونٹوں کو آبِ حیات دینے کی خواہش سے ہمکنار کیا۔ خلاق ذہن کے لیے چند اقدار و تصورات پر یقین اچھے انسان کی بنیاد بن سکتا ہے۔ مسند نشین خلیفہ نہیں، خاک نشین صحابۂ رسول ابوذر غفاری ان کی نگاہوں کی عبادت بن گئے۔ ان کے کوچے میں قدم رکھنا شبِ قدر کی بیداری، ان کی زندگی کا طواف زندگی کا حاصل قرار پایا۔

ابوذر غفاری اپنے زمانے کی معتبر آواز تھے۔ قندیل حرم کے سچے پاسبان، چراغ رسول کے پروانے، سوختہ جانوں کی گلیوں کا دیا، علم، فہم و ادراک کے ساز و سامان سے لیس، اپنا وجود صلیب پر بلند، جسم و جاں لہولہو، استخواں ریزہ ریزہ لیکن اس کے باوجود لاکھوں گمنام صلیبیں اٹھانا، استبداد کے ٹالیوں سے خون میں نہائی ہوئی میت پر نوحہ خواں ہونا، ریگ صحرا پر دیوانے کا رقص کرنا ابوذر کا سرمایۂ افتخار تھا۔ وہ مہذب افسردگی کا علم اٹھائے مکمل احتجاج، کلمۂ حق کے لیے مقتل کی راہ دکھانے کا عزم اور آہنی عمل اور پختگی فکر سے اعلیٰ اقدارِ حیات قائم کرنے کے نقیب ہے . . . یہی وہ عظیم انسان تھا جس کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا

من سرہ ان ینظر الی زہد عیسیٰ بن مریم فلینظر الی ابی ذر۔ جو حضرت عیسیٰ کے زہد کو دیکھ کر خوش ہونا چاہتا ہے" وہ ابوذر کو دیکھے"

طبقات ابن سعد و مسند احمد صہ ۲

وہ قول رسول کی پیروش جبر مسند کے سامنے یوں کرتے

" سونا چاندی جمع کرنیوالوں کو مژدہ سناؤ ۔ جہنم کی آگ میں تپائی ہوئی تختیاں ان کی چھاتی پر رکھی جائیں گی ...."

" بخاری شریف ۔ الزکاۃ صہ ۲

ابوذر کے ارشادات حق نے دمشق میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ " یہاں تک کہ غربا ، ان کے گرد جمع ہو گئے اور امیروں پر انفاق واجب کر دیا"

" تاریخ طبری، صہ ۶۶

اور یہی انسان راجہ صاحب کا محبوب بن گیا تھا اور جس وقت یہ عظیم المرتبت انسان عالم نو پیدا کرنے کی منزل پر تیرگی کے ہاتھوں ریزہ ریزہ ہوتا تو راجہ صاحب کے لطیف و نازک جذبات و احساسات پر ضرب پڑتی جس سے ان کا قلم یوں شعلہ بار ہو جاتا ہے ۔

جس کے ہر کام سے قائم ہوئی دیں کی بنیاد
جو یتیموں کی کیا کرتا تھا جا کر امداد
جو مٹاتا رہا نقش و اثر استبداد
زر پرستوں کے لیے جس کی زباں تھی نقاد

کہیں مسکینوں کا حق تھا کہیں اتیام کا تھا
تھے کہیں ابن سبیل اور کہیں ذوالقربیٰ
کہیں سائل کے لیے حکم تھا لا تنہر کا
باب اسلام سے بھر لیتے تھے دامن فقرا
وہ نہ ممنون تھے ان کی رہی ممنون دولت

مستحق لوگوں پہ تقسیم ہوئی دولت

رہتی تقسیم ہمیر کی جو باقی اب تک
ایک مفلس نظر آتا نہ ہمیں زیرِ فلک
سہتے ہم کاہے کو اغیار کے طعن و چشمک
جلوۂ غیر سے ایماں کی جھپکتی نہ پلک
سب خطائیں ہیں یہ اپنی کہ وہ باتیں چھوڑیں
دن اطاعت کے عبادات کی راتیں چھوڑیں

قرآن کھلے ہوئے الفاظ میں کہہ رہا ہے "سن لو . . . .
جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اسے راہ حق میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں عذاب خدا کی بشارت دیدو ۔ ان سے کہہ دو کہ روز قیامت اسی سونے اور چاندی کو پگھلا کر تمہاری پشت اور پیشانی کو داغدار بنایا جائے گا ۔ "

اسی مرصع فکر نے انہیں ریگِ صحرا کے ذروں سے ہم آہنگ "آوارہ گردوں" سے ہم نظر اور شعلۂ رخاں کا ہم مسلک بنا دیا تھا۔ ان میں دھرتی کے سینے سے لگ کر چلنے کا شعور بیدار ہوا ۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور بڑے بڑے غموں نے انہیں جینے کا سلیقہ عطا کیا . . . اپنے گھر کے صحن میں اننتیوں کا چاند مسکرایا تو دوسروں کے سونے آنگن میں روشنی پھیلا دی گئی . . . بچوں کے لیے آنکھوں کے اسپتال بنے ، اسکول قائم ہوئے ۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف مقرر ہوئے . . . اپنی بچی کی شادی ہوئی ، ناداروں کی جھولیاں بھرنے لگیں انڈسٹریل ہوم قائم ہوئے ، کارخانے بنائے گئے ۔ چھوٹے چھوٹے صحن آباد ہوئے ۔ اپنی زمینیں بے زمین کسانوں میں تقسیم کر دی گئیں . . . راج پاٹ کی چمک نظر میں ماند پڑ گئی

انسان کی عظمت کا ستارہ افقِ ذہن پر چمکنے لگا ... مذہب کے راستے سے سادگی، اشتغنا حق گوئی، راست گوئی، تزکیۂ نفس کو اپنایا گیا۔ مذہب ہی کے حوالے سے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی جانے لگی اسی فکر کے نتیجے میں "درویشی مسلک اختیار کیا۔

درویش صفت نظر آنا، مسلکِ درویشی جذب کر لینا درد کے حق میں لن ترانی کرنا، درد کے رشتوں سے سچا رشتہ جوڑ لینا، آنسوؤں پر نگاہِ ترحم ڈالنا، آنسوؤں کو گہر بنانے کی سعی میں شامل ہو جانا۔ جابر حکمراں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی تلقین کرنا، کلمۂ حق کہہ کر دار کو چوم لینا، مسند نشینی کی مخالفت میں وعظ دینا۔ کلمۂ حق کہہ کر مسند نشینی کو ٹھکرا دینا ... دونوں باتیں دو واضح رخِ حیات کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ہر دو کے خاک نشین راجہ صاحب کے سامنے سراپا خلوص و یقین اور مسند نشین ہمیشہ بدظن و بدگمان اور طعنہ زن رہے ... جبر کی لغت میں اندھیرے اور اجالے کو دکھانا کفر ہے۔ اور اگر کوئی انسان اسلامی مملکت میں مذہب کا حقیقی چہرہ دکھا کر نسخہ تجویز کر دے تو کرسی کی شریعت میں تالیوں سے گرد و غبار اڑانا فضا کو مکدر کرنا اور زندگی کو مقتل کی راہ دکھانا فلاح قرار پاتا ہے۔

اسلامی اقدار نے راجہ صاحب کو زنجیریں پگھلانے کا عزم دیا۔ گلوں کی محبت نے بادِ خزاں کو ہٹانے کا حوصلہ بخشا، پستی، بدحالی، جہالت اور قدامت پرستی کے اصل اسباب کیا ہیں؟ انہیں کس طرح دور کرنا چاہیئے؟ ان مسائل پر نگاہ مذہب ہی کے حوالے سے ڈالی گئی۔ اس لئے کہ "فلسفہ تغیر" پر ایقان نہیں تھا۔ سوشلزم کے فلسفے کو مذہب کے تانے بانے ہی پر سمجھنے کی خواہش تھی ... جذبہ یقیناً نیک تھا۔ لیکن نتیجے پر نگاہ نہیں تھی۔ راج پاٹ کے کالے دھندے نے ردِ عمل کے طور پر تخت سے نفرت دلائی، "گیان" کی تلاش میں سدھارتھ محلسرا سے باہر آگیا ... گیان کے پاٹ کا آغاز ہوا "نروان" کی تلاش شروع ہوئی۔ سر میغر کی سیاست سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر دیا۔ عالم تو پیدا کرنے کی تمنا میں

جمال الدین افغانی، اور علامہ اقبال کی فکر سے رشتہ جوڑ لیا۔

برطانوی سامراج کے ظلم و استبداد کے تلے ہندوستان کراہ رہا تھا۔ متحدہ ہندوستان کا حسین خواب برطانوی سامراج کے سازشی ذہن نے چکنا چور کر دیا تھا اور رہنما قومی مسائل حل کرنے سے قاصر تھے۔ ہندوستان کی فضا پاکستان زندہ باد کے نعروں سے بوجھل تھی۔ لوگ جوق در جوق قطار اندر قطار گروہ در گروہ تحریک میں شامل ہو رہے تھے۔ موجیں سمندر بن چکی تھیں ساحل سامنے تھا۔

راجہ صاحب ذہنی طور پر اس تحریک سے منسلک تھے وہ نوجوانوں کے پیش امام تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح جیسے جوہر شناس قائد نے موتی کی آب و تاب پرکھی تھی انہیں خلوت و جلوت میں اپنا ساتھی بنا لیا تھا۔ راجہ صاحب کی شعلہ بیانی نے قائد اعظم سے جڑ کر فضا میں شعلے بھڑکا دیئے تھے۔

"ہمیں ایک ایسا اسلامی نظام حیات تخلیق کرنا ہے . . . جہاں اسلامی قوانین کے تحت زمین کے پوشیدہ خزانے عام انسانوں کی ملکیت قرار پائیں گے۔ علم و حکمت کے دریاؤں سے سیراب ہونا صرف "برگزیدہ بندوں" نہیں کھردرے ہاتھوں اور حیوان شعور کا حق ہوگا . . . فنون لطیفہ پھانسی پر نہیں چڑھائے جائیں گے۔ اخلاقیات، شرافت و نجابت کو اوپر سے ٹھونسنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ معاشی بتوں کو بدل کر نیا انسان تخلیق کرنا ہوگا۔ اخلاق و شرافت کا وجود سماج سے باہر نہیں . . . آزادی فکر و نظر ہر انسان کا بنیادی حق ہے مختصر یہ کہ ہر فرد کی رنگین بہاروں کو ہمیں ہر صحن میں متبسم کناں کرنا ہے۔

راجہ صاحب کی تحریر و تقریر، جہاد فی سبیل اللہ، ان کی بے تحاشہ دولت تحریک پاکستان کے رخسار پر غازہ مل رہی تھی، اس کی لالی کروڑوں چہروں میں جھلک رہی تھی قائد اعظم کا سینہ چوڑا ہو رہا تھا . . تحریک اپنے شباب تھی۔ بھرا تھال تحریک پاکستان کے قدموں پر نچھاور کرنے کے بعد بھی وہ مطمئن اور شاداں تھے۔ جنون دل کی تعبیر، دشت فردوس

سامنے تھا۔ "محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوئے نظر آرہے تھے۔ مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد محمود رتھ پر سوار اور ایاز لگام ہاتھ میں لیے کھڑا تھا جوش و جذبہ اسے دیکھنے سے قائم تھا "بس ساغر ہر خاص و عام" بھر جائے۔ "اسلامی نظریہ حیات کی ڈال لچکتی، خوشبو بکھیرتی اور فضا کو مہکاتی محسوس ہو رہی تھی . . . "جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے" کی آواز دلپذیر یہ کانوں میں شہنائی کا رس گھول رہی تھی . . . . . شمشاد قداں نے علم بلند کر دیئے تھے۔ بہنوں نے غرور دار دیا تھا۔ مانگوں نے صندل نذر کی تھی۔ ماں کے آنگن کی کھلی چاندنی نے دامن پیار دیا تھا۔ آسودہ زمین پہ راحت مرگ گوارا نہیں تھی . . . . . کوہکن نئے تیشے اٹھائے نئی جوئے شیر کی تمنا لیئے . . . نئی پیکر شیریں کا خواب دیکھتے دشت و صحرا سے گذرتے۔ کوچۂ دلدار و دل آرام میں قدم رکھنے کے لیئے بے چین تھے . . . راستے ڈھلوان تھے۔ تعجیل کی پھسلن تھی، نئی زمین، نئی مسند، نیا پرچم، نیا ترانہ . . . سب کوچۂ جاناں رنگین نظر آرہا تھا۔

عظیم المرتبت مفکر کارل مارکس نے اپنی قلم بر داشتہ تحریر میں لکھا ہے کہ " فطرتِ انسانی کی تشکیل ہی کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ دوسروں کی بہتری اور دوسروں کی تکمیل ذات کے لیئے کام کرنے سے ہی اس کی اپنی ذات کی تکمیل ہوتی ہے اگر کوئی شخص محض اپنی ذات کو مرکز قرار دیتا ہے اور اپنی ہی ذات کی تسکین کے لیے کام کرتا ہے تو ممکن ہے کہ ایسا انسان ' عارف ' کہلائے لیکن وہ عظیم اور سچے انسان کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا . . . تاریخ میں صرف ان انسانوں نے حقیقی خراج وصول کیا ہے اور ان کا قدم گلزار ارم بنا ہے جنہوں نے انسانوں کے مشترکہ مفادات اور انہیں "خوب سے خوب تر" کی منزل کی جانب لے جانے کا کام انجام دیا ہے اور اس طرح اپنے کردار کی بھی آئینہ بندی کی ہے۔" اس روشن تحریر کی روشنی میں راجہ صاحب کی شخصیت کے سارے پیچ و خم کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ جنہوں نے انسانوں پہ عدل و آگہی کا

سورج طلوع کرنے کے لیے شبنم کے بدلے انگارے مول لئے۔ محمود بن کر زندگی گزارنے کے بجائے ایاز سے رشتہ جوڑا اور اپنے بدن کی دھنک کی رنگینی و رعنائی پاکستان کی تحریک پر نثار کر دی تاکہ نیا گلشن آباد ہو۔

قائد اعظم کی جاں فشانی اور کھردرے ہاتھوں کی سعی مسلسل کے نتیجے میں پاکستان کے صحراؤں میں سحر نمودار ہوئی۔ سفیدے کی شاخ پر چاند تارے کھلے۔ مضراب نے نیا ترانہ چھیڑا۔ اسلامی پرچم نے خراج وصول کیا۔ قائد اعظم کی گل پوش فکر نے پُرکیف نغمے الاپے جمہوری طرزِ فکر کا بیج ڈالا گیا۔ سیکولر مزاج روح کی غذا ٹھہری۔ زمین کی دولت پر انسان کا حق بنا۔ " ساغر بر خاص و عام، چھلکتا معلوم ہوا۔ نارسیدہ امنگیں جاگ اٹھیں۔ جھلسے ہوئے ہونٹوں کو آبِ حیات نظر آنے لگی۔ اجڑی ہوئی تہذیب کی دھڑکنوں کا درد کم ہوا۔ بیتے ہوئے تلخ یادوں کے نقوش مدہم ہوئے۔۔۔ گلستانِ ہزار رنگ دیکھنے کی آرزو بڑھی۔ رات کا آنچل ڈھلنے لگا۔ کدم کا پھول کھلنے لگا۔ تشنہ خیالوں کی پیاس بجھنے لگی۔۔۔ ہری شاخ پر جوہی مسکرا اٹھی، آنکھوں میں کنول ڈولے، دل کا رباب گنگنانے لگا۔

لیکن جلد ہی وقت نے "لے" بدلی۔۔۔ پاکستان کے بن میں شام ہوئی ایک جانب چمکیلی تصویریں دوسری جانب تپتی ریت میں برہ کے کانٹے۔۔۔ دریا کا کنارہ سنسان ہوا۔۔۔ برفیلی رات نے قدم آگے بڑھائے۔۔۔ آبگینے پتھروں سے ٹکرا گئے۔۔۔ دھاگوں نے زمین کی سلائی یوں ادھیڑ دی جس طرح درزی بخیہ ادھیڑتا ہے۔۔۔ گل بجھنے لگے۔ اقتدار کے جام ٹکرا گئے، شعلہ سوار رکتہ بالوں نے دو دھاری تلواریں چلا دیں، چٹانوں میں دراڑیں پڑیں۔ کھیتی کا دودھ دوہا جانے لگا۔۔۔ چمچاتی اشرفیوں نے قوتِ احساس سلب کر لی۔۔۔ جرأت اظہار کی پشت نیلی ہوئی۔۔۔ مخمور آنکھوں نے پیار کی آغوش میں نفاق کا زہر انڈیل دیا۔۔۔ نفرت کی زنگ آلود کیل پھلی پھولی زمین میں گاڑ دی گئی۔ پھوٹ کا بیج کیھرے لکڑی کی طرح بڑھنے لگا۔ فضا دھواں دھواں ہوئی۔ طبقاتی رشتے پارہ پارہ ہوئے۔ دودھ کو چھاچ سے جدا کرنے کے بجائے اسے

متھ دیا گیا۔ نظروں کو جھنجھنے ملے ، ہاتھوں کو مٹی کے کھلونے ملے . . . جسم و جاں نیلامی مال بن گئے۔

سات سو کرسی نشینوں کے سامنے بازار سجایا گیا۔ نیلام شروع ہوا . . جانوں کی پگھلی چاندی ، پھولوں کی پیلاہٹ ، غنچوں کی ٹوٹی دھنک ، بے رنگ چھاتیاں بریدہ کلیاں ، سوکھی ٹہنیاں ، فگار گل لائے گئے . . بولیاں لگنا شروع ہوئیں . . . ہر پھول کی قیمت چار آنے . . . ہر شاخ کی قیمت چار آنے . . گل اندامون کی چاہت میں خاک سے بھی بولیاں اٹھیں . . . کروڑوں کا مول ہے ہر موتی . . . حرفِ وفا بلند ہوا . . حرفِ وفا مقید ہوا . . . حرفِ وفا پابہ سلاسل ہوا . . . "غدارانِ چمن ہیں" "نظریہ پاکستان کے دشمن ہیں" ، "اسلام کے مجرم ہیں" آوازوں کی بجلیاں گرنے لگیں نفرت کی کڑیاں کڑکنے لگیں . . . سنگینوں کی دھار باڑھ پر آئی ، قلعے کی دیواریں بلند اور بلند ہوئیں . . . حوصلے بلند اور بلند ہوئے۔

دل فگاروں کا لہو دار پہ چڑھا ، لہو بازار میں آگیا . . . کفِ قاتل پہ لپکتا ہوا . . . مسکراتا ہوا . . . ایسی مسکراہٹ جو "تعقل و تفکر اور فلسفہ تغیر" پر ایقان سے پیدا ہوتی ہے ۔ جو کھیت میں ٹریکٹر چلاتی ہے جس سے نیچے کی مٹی اوپر آجاتی ہے اور اوپر کی مٹی ملبے میں دب جاتی ہے ۔ سوکھی شاخوں میں لہو دوڑ جاتا ہے پیلے کھیتوں میں سرخی نرت کرتی ہے۔